ف میری اور آپ کی نہیں، ہر کلمہ گو کی کہانی ہے کیا گاؤں، کیا شہر، کیا پاکستان، یہ ملت اسلامیہ کے ہر گھر کی کہانی ہے
فی سبیل اللہ
(ایک ناول)
علیم الحق حقی

# انتساب

## هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّی

- اس کشمیری بہن کے نام، جس نے 97ء میں مجھے جہاد کے موضوع پر لکھنے کی تلقین کی۔
- اس دینی بہن کے نام، جس نے 2001ء میں میری ہر طرح سے مدد کر کے یہ کہانی لکھوائی۔
- اپنے اس بھائی کے نام، جس نے خواب میں مجھے پریشان دیکھا تو دامے، درمے، قدمے، سخنے میری مدد کے لیے از خود میرے پاس چلا آیا۔

# پیش لفظ

بہت طویل عرصے کے تعطل کے بعد میرا اپنے قارئین سے پہلا قلمی رابطہ ہے۔ یہ سب اللہ کا فضل ہے۔ ورنہ مجھ سا بے وسیلہ اور بے مایہ شخص یہ اہتمام نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں اللہ کے حکم سے جن خواتین و حضرات کا تعاون شامل رہا‘ میں ان کا شکر گزار ہوں اور ان کے لیے اللہ سے جزائے عظیم کی دعا کرتا ہوں۔

مارچ ۲۰۰۰ء کے سسپنس میں میری آخری کہانی ’بہ قدر توفیق‘ شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد میرا اپنے قارئین سے ہی نہیں‘ قلم سے بھی رابطہ ٹوٹ گیا۔ لگتا تھا‘ اب کبھی لکھ نہیں سکوں گا۔ لیکن اللہ کی مرضی کچھ اور تھی۔ سچ یہ ہے کہ جو حالات تھے‘ ان میں یہ کہانی لکھنا ناممکن ہی تھا۔ مگر یہ کہانی شروع ہوئی‘ لکھی گئی اور ایسے مکمل ہوئی کہ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ بہت خراب ذہنی کیفیت میں اللہ نے مجھ سے یہ کام لیا ہے۔ بے شک یہ سب میرے اللہ کا فضل ہے۔

۹۷ء میں کشمیر سے میری ایک بہن نے خط لکھا‘ جس میں مجھے جہاد کے موضوع پر لکھنے کی تلقین کی گئی تھی۔ اس محترم بہن کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کی زبوں حالی اور ذلت کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے جہاد کو ترک کر دیا ہے۔ وہ بہت اثر انگیز خط تھا۔ میں نے جہاد پر لکھنے کا ارادہ کیا۔ ایک تھیم بھی سمجھ میں آئی۔ مگر میں لکھ نہیں سکا۔ ع

ایں سعادت بزور بازو نیست

جنوری ۲۰۰۱ء میں میری ایک دینی بہن نے مجھ ٹوٹے پھوٹے انسان سے جہاد پر لکھنے کی فرمائش کی۔ میں اس وقت اپنی زندگی کے بدترین معاشی بحران سے دوچار تھا۔ میری اس دوسری بہن نے صرف فرمائش نہیں کی۔ بلکہ میرے معاشی حالات کو سدھارنے کے لیے ذاتی طور بہت کچھ کیا۔ یوں اپنے مسبب الاسباب رب کی عنایت



سے میں لکھنے کے قابل ہوا۔ اللہ نے مجھ سے لکھوایا۔ ورنہ میں ذہنی طور پر اتنا منتشر تھا کہ کوئی مربوط کہانی لکھنا میرے امکان میں تھا ہی نہیں۔

۲۰ رمئی ۲۰۰۱ء کو یہ کہانی مکمل ہوئی۔ لیکن اشاعت ابھی اس کے مقدر میں نہیں تھی۔ میں کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا...... سوائے اللہ کے فضل و کرم کے انتظار کے۔ پھر اللہ نے اچانک دروازے کھولنے شروع کیے۔ ۲۶ راگست کو اطلاع ملی کہ ’ماہنامہ بتول‘ لاہور اپنے اکتوبر کے شمارے سے اسے سلسلہ وار شائع کرنے والا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرے دل میں اس کہانی کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اب اللہ کی عنایت سے یہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اسے پڑھیے اور مجھے بتائیے کہ یہ آپ کو کیسی لگی۔

’فی سبیل اللہ‘ کی خاص بات یہ ہے کہ یہ میری پہلی غیر مطبوعہ کہانی ہے‘ جو کتابی شکل میں شائع ہو رہی ہے۔ تقریباً بیس ماہ بعد آپ میری کوئی کہانی پڑھ رہے ہیں۔ اپنا کام تو میں کر چکا۔ اب اللہ سے دعا ہے کہ وہ اسے قبول عام بھی عطا فرمائے اور اپنی بارگاہ میں قبول بھی فرمائے۔ میری خواہش تو یہی ہے کہ یہ کہانی ہر گھر میں پڑھی جائے اور ہر مسلمان تک پہنچے۔ آگے اللہ کی مرضی۔

اب ایک ذاتی گزارش! آپ اسے قرض حسنہ سمجھیں یا ایک بک کلب کی ممبر شپ۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے قارئین میں جو خواتین و حضرات استطاعت رکھتے ہوں‘ وہ میرے نام ایک ہزار روپے یا کم از کم پانچ سو روپے کا بینک ڈرافٹ بھیج دیں۔ اجر دینے والی تو اللہ کی ذات ہے۔ میں جو کر سکتا ہوں‘ وہ یہ ہے کہ ایسے تمام قارئین کو اپنی ہر نئی کتاب اپنے آٹوگراف کے ساتھ ۲۰ فی صد رعایت پر ان کے گھر بھجواؤں گا۔ ڈاک خرچ بھی میرے ذمے ہوگا۔ کتاب ان شاء اللہ بازار میں بعد میں آئے گی‘ پہلے ان تک پہنچے گی۔ یہ سلسلہ ان کی رقم پوری ہونے تک چلتا رہے گا۔ آپ کی اس اعانت سے میں اپنے اس اشاعتی ادارے کو مستحکم کر کے بہتر طور پر لکھنے کا کام کرتا رہوں گا۔ اپنے ان

محسنوں کو ان شاء اللہ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا' کتابیں بھیجتے ہوئے بھی اور دعاؤں میں بھی۔ ان شاء اللہ آپ کا یہ اقدام نہ دنیا میں کسی خسارے کا سبب بنے گا' نہ آخرت میں۔ اور اگر اللہ نے مجھ سے کوئی بڑے اجر والا کام لیا' جس کی کہ مجھے اسکی رحمت سے قوی امید ہے' تو آپ بھی اس اجر میں ان شاء اللہ حصے دار ہوں گے۔

کہانی پر تبصرہ ہو یا میرے لیے کوئی ذاتی خط' آپ سید برادرز کی معرفت مجھے لکھ سکتے ہیں۔ میں آپ کی آراء اور اعانت دونوں کا منتظر ہوں۔

والسلام
علیم الحق حقی



، بہت ڈرتا تھا...... موت سے بھی اور شہادت سے بھی۔ موت
۔ ایک ہی بات تھی۔ اور یہ بات اسے اماں نے بتائی تھی......
''فی سبیل اللہ'' جہاد بہت اندر بیٹھ گیا تھا۔
یہ صرف میری اور آپ کی نہیں' ہکا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ وہ صحن میں بیٹھا اسکول کا کام
ملت اسلامیہ کے ہر گھر کی کہانی ہے۔ دار آواز سنائی دی۔ بڑا دبدبہ تھا اس آواز میں
ہے۔ اس کے کردار ہمارے معاشرے کے اؤں گا۔'' ے میں کم
افراد ہیں۔ اور یہ ایمان افروز کہانی ہے۔ اس اعتبار سے وہ آ ولنان اللہ کی عنایت
سے ایمان پر پیدا تو ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد پوری زندگی میں اسے سمجھنے' اس کی تجدید کرنے اور اس پر زندگی گزارنے اور اس پر مرنے کے بارے میں شاید کبھی سوچتے بھی نہیں۔ ہم جیسے کرداروں کی یہ کہانی ہمیں اس کے بارے میں سوچنے کی' اسے سمجھنے اور اسے تازہ کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ کہانی مکمل ہوتے ہوتے ایمان کی تجدید ہو جاتی ہے۔

یہ کہانی پڑھنے کے بعد مجھے خوشی ہوئی کہ علیم الحق حقی نے جہاد کو محض ایک لفظ اور اس کے محدود معنوں میں نہیں برتا ہے۔ بلکہ جہاد کو اس کے وسیع تر مفہوم کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بہت بڑا کام تھا۔ اور انہوں نے اس کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان جب بھی جہاد سے دور ہوئے ہیں' بہت برے حال کو پہنچ گئے ہیں۔ اور جہاد صرف میدان جنگ میں لڑنے کا نام نہیں۔ (اگر ایسا ہوتا تو ہر مسلمان پر جہاد فرض نہ ہوتا) وہ تو زندگی کے میدان میں' معاشرے کے ہر محاذ پر کیا جاتا ہے۔ حکم ہے کہ برائی کو بزور روکو۔ سورۃ العصر میں اللہ نے اعلان فرمایا ہے کہ بے شک

محسنوں کو ان شاء اللہ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا' کتابیں بھیجتے ہوئے بھی اور دعاؤں [illegible]ـے
بھی۔ ان شاء اللہ آپ کا یہ اقدام نہ دنیا میں کسی خسارے کا سبـ[illegible]ـم اپنے معاشرے کو
میں۔ اور اگر اللہ نے مجھ سے کوئی بڑے اجر والا کام لیا' جس کی [illegible]ہ کش ہو چکے ہیں۔ یہی
قوی امید ہے' تو آپ بھی اس اجر میں ان شاء اللہ حصے دار ہو[illegible]' چور بازاری' مفاد پرستی
کہانی پر تبصرہ ہو یا میرے لیے کوئی ذاتی خط' آپ [illegible]ی اجزائے ترکیبی ہیں۔ اور
سکتے ہیں۔ میں آپ کی آراء اور اعانت دونوں کا منتظر ہو[illegible]ں ریلے میں شامل ہوئے جا رہے
[illegible]م نے جہاد شروع نہیں کیا تو خدانخواستہ
........ یہ ا[illegible] ہے کہ نہایت مایوس کن صورت حال میں یہ ایک
مثبت پیغام دیتی ہے۔ ایک روشن راستے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

میرے خیال میں کسی بھی کہانی کے لیے سب سے ضروری چیز اثر انگیزی ہے۔ پڑھتے ہوئے قاری یوں کھو جائے کہ جیسے وہ سب کچھ خود دیکھ رہا ہو۔ اس میں شریک ہو۔ اور کچھ Educate کرنے والی کہانیوں میں اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ فی سبیل اللہ میں یہ خوبی کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ ایک تو جیتے جاگتے کردار' اس پر کمال کی منظر نگاری۔ اس کہانی کی اپنی فضا ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے گرد و پیش کا ہوش نہیں رہتا ہے۔ پڑھنے والا involve ہوتا چلا جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کہانی کو پڑھتے ہوئے ہر قاری کی یہی کیفیت ہوگی۔

اپنے اختتامی صفحات میں مجھے تو یہ کہانی علامہ اقبال کے اس شعر کی تفسیر لگی........

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے' اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے



عبداللہ موت سے بہت ڈرتا تھا...... موت سے بھی اور شہادت سے بھی۔ موت اور شہادت اس کے نزدیک ایک ہی بات تھی۔ اور یہ بات اسے اماں نے بتائی تھی...... سو یہ خوف اس کے اندر...... بہت اندر بیٹھ گیا تھا۔

اس وقت وہ سات سال کا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ وہ صحن میں بیٹھا اسکول کا کام کر رہا تھا۔ اچانک باہر سے ایک گرج دار آواز سنائی دی۔ بڑا دبدبہ تھا اس آواز میں ''کھانا کھلا دے مجھے۔ کھانا کھائے بغیر نہیں جاؤں گا۔''

عبداللہ پھر حساب کے سوال میں الجھ گیا۔ اسی لمحے وہ آواز پھر گرجی ''کھانا کھلا دے' ایسے نہیں جاؤں گا میں۔'' آواز پہلے سے بلند تھی۔

عبداللہ نے قلم بند کر دیا۔ جی چاہا کہ اٹھ کر جائے اور دروازہ کھول کر دیکھے۔ لیکن اس پر کسلمندی طاری تھی۔ اٹھا ہی نہیں گیا۔ وہ وہیں بیٹھا رہا۔ لیکن کان باہر لگے تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ آواز پھر سنائی دے گی۔ اس آواز میں اس کے لئے کوئی عجیب سی انجانی سی کشش تھی' جو اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ کاش وہ اٹھ سکتا......

وہ آواز تو نہیں ابھری۔ لیکن اسے گلی میں کوئی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر ایک جانی پہچانی نسوانی آواز...... نجمہ خالہ کی آواز۔ ''لو بابا...... یہ کھانا لے لو۔''

''مجھے جس سے کھانا ہے' اسی سے کھاؤں گا۔'' دبدبے والی آواز بجلی کی طرح کڑکی۔ ''تیرا کھانا نہیں کھانا مجھے۔''

نجمہ خالہ غصے کی بہت تیز تھیں۔ پٹاخ سے بولیں۔ ''تو شور مچا کر مانگتے کیوں ہو۔ جہاں سے کھانا ہے' وہیں دروازہ کھٹکھٹاؤ۔''

''تجھ سے مطلب' تو کیوں دروازہ کھول کر کھڑی ہے ناقدری۔ جا' اپنا کام کر۔'' اس بار آواز پہلے سے بلند تھی اور لہجے میں بلا کا تحکم تھا۔ عبداللہ نے سوچا' ایسا حکم تو کوئی

نہیں ٹال سکتا۔ لیکن نجمہ خالہ کی بات دوسری ہے۔ وہ تو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتیں۔ ابھی ایسا منہ توڑ جواب دیں گی کہ مانگنے والے کی بولتی بند ہو جائے گی۔ کہیں گی ......
بھیک مانگنے والے کا ایسا تیسا!......

لیکن ایسا ہوا نہیں۔ شاید نجمہ خالہ بھی اس تحکم سے ہار گئی تھیں۔ ہاں انہوں نے دروازہ پوری طاقت سے بند کیا تھا۔ چار گلیوں تک تو آواز گئی ہی ہو گی۔

اماں کچن میں کچھ کر رہی تھیں۔ شاید آواز ان تک بھی پہنچ گئی تھی۔ تبھی تو وہ لپکی ہوئی نکلیں۔ اسی لمحے وہ آواز پھر گونجی ’’ارے...... کھانا کھلا دے۔ کھانا کھائے بغیر نہیں جاؤں گا میں۔‘‘

اماں کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ وہ دروازے پر پہنچیں اور جلدی سے دروازہ کھولا۔

’’باباجی...... کھانا کھاؤ گے؟‘‘

’’تو اور اتنی دیر سے کیا پکار رہا ہوں۔ بہری ہے کیا‘‘۔ وہ جیسے برا مان گیا۔

’’آؤ باباجی...... اندر آجاؤ‘‘۔ اماں نے کہا اور پلٹ کر عبداللہ سے کہا ’’بیٹا...... تم اندر جا کر کام کر لو۔‘‘

عبداللہ نے جلدی سے اپنی چیزیں سمیٹیں اور انہیں لے کر کمرے میں چلا گیا۔ لیکن اسے تجسس بہت تھا۔ کتابیں کمرے میں رکھ کر وہ دروازے پر آیا تو مانگنے والا اندر آچکا تھا اور چارپائی پر بیٹھنے کے بجائے نیچے زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔

عبداللہ نے غور سے اسے دیکھا اور خوف زدہ ہو گیا۔ ایسی بات نہیں کہ وہ بابا کوئی ڈراؤنی شخصیت ہو۔ مگر اسے دیکھ کر کوئی بھی مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ لمبا قد' گھنی داڑھی' بہت لمبے لمبے بال اور سرخ انگارہ جیسی آنکھیں۔ وہ کسی چیز پر نظریں نہیں جماتا تھا۔ بلکہ نظر بھی وہ اتفاقاً ہی اٹھاتا تھا۔ مگر ان آنکھوں میں کوئی عجیب سی چیز تھی۔ لگتا تھا' وہ آر پار دیکھ رہی ہیں۔ اور اس کا حلیہ عجیب تھا۔ گلے میں کئی مالائیں پڑی تھیں۔ وہ ململ کا کرتہ پہنے تھا۔ نیچے بنیان بھی نہیں تھا' اور کرتہ بہت...... بہت عرصہ پہلے



یقیناً سفید رہا ہو گا۔ لیکن اب تو کپڑا ابھی میل کے نیچے چھپ چکا تھا۔ پاجامے کا بھی یہی حال تھا۔

جب آدمی ایسے زمین پر بیٹھے گا تو کپڑے تو گندے ہوں گے ہی' عبداللہ نے سوچا' وہ کھڑا دیکھتا رہا۔

’’بابا...... اوپر بیٹھو نا چارپائی پر۔‘‘ اماں نے بڑی لجاجت سے کہا۔ ’’ہمیں بھی عزت دو نا۔‘‘

’’حق اللہ‘‘ مجذوب نے گرج کر کہا۔ پھر انگلی آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے بولا۔ ’’عزت ساری کی ساری اس کی ہے۔ وہ جسے چاہے' دے دے اور جتنی چاہے دے دے۔‘‘

’’اوپر بیٹھ جاؤ نا بابا۔‘‘ اماں پھر گھگھیائیں۔

’’نہیں بی بی۔ مٹی سے قریب رہنا اچھا ہے۔ مٹی میں ہی تو مل جانا ہے۔‘‘ مجذوب بولا۔ اوپر ہونے سے گھمنڈ آتا ہے۔ دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ دل اپنی جگہ سے ہٹ جاتا ہے۔‘‘

’’اچھا۔ یہ بتاؤ' کیا کھاؤ گے۔‘‘

مجذوب نے اپنی سرخ آنکھیں ایک ثانیے کو اٹھائیں اور فوراً ہی جھکا لیں۔ ’’جو ہے' لے آ بی بی۔‘‘

اماں ہچکچائیں۔ ’’دوپہر کا کھانا ہے باباجی۔ مگر جو تم کہو وہ پکا دوں گی۔‘‘

’’میں تکلیف دینے نہیں آیا ہوں بی بی۔‘‘

’’تکلیف کیسی باباجی۔‘‘ اماں سراپا سپاس ہو گئیں۔ ’’ابھی آدھے گھنٹے میں پک جائے گا۔ جو کھانے کو دل چاہے' وہ بتاؤ۔‘‘

’’دل میرا کچھ نہیں مانگتا بی بی۔‘‘ مجذوب نے کہا۔ ’’یہ تو پیٹ کی ضرورت ہے۔ اور پیٹ کے لئے پتھر اور موتی دونوں ایک جیسے ہیں۔ اس کو تو بس کچھ چاہیئے خالی جگہ

بھرنے کے لئے۔ جو کچھ ہے لے آ بی بی۔''

''ابھی لائی بابا' اماں نے کہا اور کچن کی طرف لپکیں۔

عبداللہ وہیں کھڑا تھا۔ اس نے سب کچھ سنا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ پتا نہیں' یہ بابا کیسی باتیں کرتا ہے۔ اُس نے سوچا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ لیکن وہ باتیں اسے سوچنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ اُن باتوں کو سمجھے۔

اماں ٹرے پر روٹی اور ایک پلیٹ میں دوپہر کا سالن لے کر کچن سے نکلیں اور مجذوب کی طرف بڑھیں۔ ''بابا...... اوپر بیٹھ جاؤ نا۔'' انہوں نے پھر فرمائش کی۔

''میں یہیں ٹھیک ہوں۔ کھانا یہیں دے دے مجھے۔''

اماں نے ہچکچاتے ہوئے ٹرے مجذوب کے سامنے زمین پر رکھ دی۔

''پانی لا دے۔'' مجذوب نے کہا۔

اماں جا کر پانی کا جگ اور گلاس لے آئیں۔ مجذوب نے جھٹ دو گلاس پانی پی لیا۔ وہ بہت پیاسا لگتا تھا۔

عبداللہ اب بھی وہیں کھڑا تھا۔ مجذوب سے ڈر نہ لگ رہا ہوتا تو وہ پہلے ہی وہیں جا کھڑا ہوتا۔ مگر اب اچانک وہ دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ الگ بات کہ خود اسے اس بات کا احساس بھی نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ وہ کسی ٹرانس میں ہے۔ مجذوب کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا۔

مجذوب نے اسی لمحے پہلا نوالہ توڑا تھا اور اسے منہ کی طرف لے جا رہا تھا۔ اچانک وہ ٹھٹکا اور اُس نے نظریں اٹھائیں۔ اُس کا نوالے والا ہاتھ منہ سے کچھ فاصلے پر تھا اور جہاں تھا' وہیں جم کر رہ گیا تھا۔

وہ عبداللہ کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ورنہ اب تک اُس نے کہیں نظر جمائی ہی نہیں تھی۔

عبداللہ کو خوف آنے لگا۔ اُس نے نظریں جھکا لیں۔ وہ کمرے کی طرف بھاگ



جانا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کی ٹانگیں جیسے پتھر کی ہو گئی تھیں۔

مجذوب نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ ''اِدھر بیٹھ جا بچہ...... میرے پاس۔''

عبداللہ بت بنا اُسے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ بول بھی نہ سکا۔

مجذوب نے اسے پھر پکارا۔ ''بیٹھ جا بچے۔''

اماں جلدی سے آگے بڑھیں اور انہوں نے زور لگا کر عبداللہ کو مجذوب کے پاس بٹھا دیا۔ ''بیٹھ جاؤ بیٹے۔ بات مانتے ہیں۔''

مجذوب پلکیں جھپکائے بغیر عبداللہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ پھر اُس نے اپنے ہاتھ کا نوالہ اُس کی طرف بڑھایا۔ ''لے بچے...... یہ کھا لے۔''

لیکن عبداللہ نے منہ نہیں کھولا۔ نجانے کیوں اسے کراہت ہو رہی تھی۔

''منہ کھول بچے۔'' مجذوب نے اصرار کیا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔ میں کھانا کھا چکا ہوں۔'' عبداللہ نے دھیرے سے کہا۔

''کھا لو بیٹے۔ کیا پتا' یہ نوالہ قسمت سنوار دے تمہاری۔'' اماں نے تحکمانہ لہجے میں عبداللہ سے کہا۔

عبداللہ نے منہ کھول دیا۔ مجذوب نے نوالہ اس کے منہ میں دے دیا۔ عبداللہ کے لئے وہ نوالہ چبانا بھی دوبھر تھا۔ وہ دھیرے دھیرے منہ چلاتا رہا۔ مجذوب اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تم بھی تو کھاؤ بابا۔''

مجذوب نے نظریں جھکائیں اور اپنے لئے نوالہ توڑا۔ پھر وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''قسمت کا دھنی تو ہے یہ تمہارا بچہ۔''

''اللہ کی دین ہے بابا جی۔ اکلوتا بیٹا ہے۔ سات بیٹیوں کے بعد' بڑی منتوں مرادوں کے بعد دیا ہے اللہ نے۔'' اماں کے لہجے میں بے حد شکر گزاری تھی۔

مجذوب نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے پھر عبداللہ کو دیکھا اور بولا۔ ''مقدر والا

ہے۔ بڑا مرتبہ ملے گا اسے۔ شہادت پائے گا...... شہید ہوگا......''

ایک لمحے تو اماں کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔ پھر اگلے ہی لمحے ان کے تیور بدل گئے۔ ایک دم سے اٹھیں اور چلائیں۔ ''تیرے منہ میں خاک۔ یہ کیسی بات منہ سے نکالی تو نے۔'' غصے سے اُن کا جسم کانپ رہا تھا۔

مجذوب کا چلتا ہوا منہ رک گیا۔ اُس نے سر اٹھا کر اماں کو گھورا۔ ''اگر تیری اس بات سے میرا دل دکھے' میں یہ نوالہ تھوک دوں جو تیرے خیال میں تیرا دیا ہوا ہے' اور اللہ کو برا لگے تو تیرا کتنا نقصان ہو۔ تیرا تو سارا رزق خاک ہو جائے......'' اُس کا لہجہ بہت نرم تھا۔

عبداللہ حیرت سے کبھی اماں کو دیکھتا' کبھی مجذوب کو۔ اسے احساس تھا کہ کوئی بہت سنگین بات ہو رہی ہے اور سارا چکر شہادت کا ہے' جو مجذوب کے نزدیک مرتبہ ہے اور اماں کے نزدیک بہت بری بات۔

اماں مجذوب کی بات سن کر تھرا گئیں۔ ان کے ہونٹ پھڑپھڑائے۔ لیکن کوئی آواز نہیں نکلی۔

''لیکن مجھے برا نہیں لگا......'' مجذوب نے مزید کہا۔ ''صرف اس بچے کی خاطر۔ تو نے مجھے کھانا کھلایا۔ تیرا شکریہ۔ اللہ کا شکر ہے۔'' وہ اٹھنے لگا۔

''بیٹھ جاؤ بابا۔ مجھے معاف کر دو۔ کھانا تو کھا لو۔'' اماں اچانک گڑگڑانے لگیں۔

''مجھ سے نہیں' اللہ سے معافی مانگ۔ اس کے دیئے ہوئے مرتبے کی توہین کرتی ہے ناشکری۔''

''میں توبہ کرلوں گی بابا' تم تو مجھے معاف کر دو۔''

''میں ناراض ہی نہیں ہوں۔ معافی کا کیا سوال ہے۔''

''تو کھانا تو کھا لو۔''

''جو کھانا تھا' کھا لیا۔''



''نہیں۔ تم برا مان کر اٹھ گئے ہو۔''

''خدا کی قسم' بس ایک نوالہ ہی کھانے آیا تھا۔'' مجذوب نے پرجلال لہجے میں کہا۔

اماں نے دوپٹہ اُس کے پیروں میں ڈال دیا۔ ''میری ایک بات مان لو۔'' وہ گڑگڑائیں۔ ''اپنے الفاظ واپس لے لو۔''

''کون سے الفاظ؟''

''وہی شہادت والے۔''

''لاحول ولا قوۃ۔'' مجذوب نے گرج کر کہا۔ ''ایمان والوں میں پھرتا ہوں۔ مگر ہر جگہ مشرک ہی ملتے ہیں۔ او بے دین عورت۔ تو کیا سمجھتی ہے۔ مزاروں پر منتیں ماننے سے' جعلی پیروں کی دعاؤں سے تجھے یہ بچہ ملا ہے۔ ارے یہ تجھے اللہ نے دیا ہے۔ اُس کی مرضی کے بغیر کہیں کچھ نہیں ہوتا۔ اور تو کیا سمجھتی ہے۔ میرے کہنے سے اسے شہادت ملے گی۔ اور میرے الفاظ واپس لینے سے اس کی شہادت منسوخ ہو جائے گی۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ سب اُس رب کی مرضی ہے۔ جو وہ لکھ دے ہو کر رہتا ہے۔ ارے بدبخت' کفرانِ نعمت کرتی ہے تو کر۔ شرک تو نہ کر۔ بدبختی ہی مانگنی ہے تو وہ بھی اپنے رب سے ہی مانگ۔ مجھے کیوں گناہ گار کرتی ہے۔'' یہ کہہ کر مجذوب پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔

اماں دیر تک اپنی جگہ شل کھڑی رہیں۔ عبداللہ بھی ہل نہیں سکا۔ لیکن پھر اسی نے اماں کو ہلایا۔ ''کیا ہوا اماں؟''

اماں نے کچھ نہیں کہا۔ بس اسے باہوں میں بھر لیا۔ اُن کا جسم اب بھی لرز رہا تھا۔ وہ اسے لے کر چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

''یہ شہادت کیا ہوتی ہے اماں؟'' عبداللہ نے ماں سے پوچھا۔

''شہادت موت ہوتی ہے۔'' اماں نے سادگی سے کہا۔

''اور موت کیا ہوتی ہے؟''

''موت؟'' اماں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''موت آتی ہے تو آدمی اللہ

کے پاس چلا جاتا ہے۔''

''جیسے دادا اور دادی گئے تھے'' عبداللہ نے معصومیت سے کہا۔ ''اور پھر کبھی واپس نہیں آئے۔''

''ہاں۔ آدمی مرجائے تو واپس کبھی نہیں آتا۔'' اماں نے آہ بھر کے کہا۔

عبداللہ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''تو دادا اور دادی شہید ہوئے تھے؟''

اماں بری طرح چونکیں۔ ''نہیں...... ان کا انتقال ہوا تھا۔''

سات سالہ عبداللہ کا ذہن بری طرح سے الجھ گیا۔ ''آپ کہہ رہی تھیں کہ شہادت موت ہوتی ہے۔''

اب اماں الجھیں کہ اسے کیسے سمجھائیں۔ چند لمحے سوچنے کے بعد بولیں۔ ''شہادت ہوتی تو موت ہی ہے۔ لیکن مختلف ہوتی ہے۔ اس میں آدمی لڑتے ہوئے مرتا ہے۔ زخموں سے چور ہو کر۔''

عبداللہ ڈر گیا۔ پھر اس نے اماں کو دلاسہ دیا۔ ''تم فکر مت کرو اماں میں کبھی کسی سے لڑوں گا ہی نہیں۔ تو شہید بھی نہیں ہوں گا۔''

اماں نے اسے زور سے لپٹا لیا۔ ''بس تم باتیں مت کرو۔'' انہیں اُس کی بات سے بھی کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ پچھتاوا ہوا تھا۔ انہیں احساس ہو رہا تھا کہ اب شاید وہ کبھی کسی بات پر بھی خوش نہیں ہو سکیں گی۔ کیوں؟ یہ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔

❁......❁......❁

''بیٹا...... جلدی جلدی چیزیں سمیٹ کر اندر رکھ دے۔ نو بجنے والے ہیں۔'' نوشاد علی نے دکان پر کام کرنے والے لڑکے سے کہا۔ پھر وہ گلّے میں موجود رقم گننے میں مصروف ہو گیا۔

نوشاد علی بہت اچھا انسان تھا۔ اللہ نے بہت خوبیاں عطا کی تھیں اسے۔ اس کے مزاج میں عاجزی اور انکساری بلا کی تھی۔ وہ محنتی تھا۔ شکر گزار بھی بہت تھا۔ پابندیٔ



وقت کا خیال رکھتا تھا۔ علاقے میں اُس کی دکان سب سے زیادہ اس لئے چلتی تھی کہ لوگ اسے پسند کرتے تھے۔

تیس سال پہلے اُس نے یہ دکان شروع کی تھی۔ اُس وقت یہ چھوٹا سا کیبن تھا۔ اور یہ علاقہ اتنا بارونق بازار بھی نہیں تھا۔ آبادی بھی زیادہ نہیں تھی۔ وہ اس علاقے کی پہلی دکان تھی۔

دکانداری اس وقت کم ہی تھی۔ لیکن نوشاد باقاعدگی کا قائل تھا۔ وہ صبح سات بجے دکان کھولتا اور ایک بجے بند کرتا۔ پھر تین بجے دکان کھولتا اور رات نو بجے بند کرتا۔ یہ معمولات اب بھی نہیں بدلے تھے۔ ہاں، دکان بھی بڑھ گئی تھی اور دکانداری بھی۔ اب دکان سے اسے کثیر آمدنی ہوتی تھی۔ لیکن اس کے مزاج کا انکسار اب بھی وہی تھا۔

ستائیس سال پہلے زلیخا سے اُس کی شادی ہوئی۔ زلیخا اُس کی ماں کی پسند تھی۔ اُس نے بڑی شکر گزاری سے اسے قبول کر لیا۔ شادی کو ایک سال ہوا تھا کہ اُس کے ہاں پہلی بیٹی پیدا ہوئی۔ اماں اور ابا کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ نوشاد بھی خوش تھا۔ لیکن ذمے داری کا احساس بڑھ گیا تھا۔

اگلے سال اُس کے ہاں دوسری بیٹی ہوئی تو اماں کچھ بجھ سی گئیں۔ ابا کو اور اسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ کچھ اُس کی مصروفیت بھی بڑھ گئی تھی۔ علاقے کی آبادی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسی حساب سے دکانداری بھی بڑھ گئی تھی۔ ابا بھی اُس کا ہاتھ بٹانے کے لئے دکان پر آنے لگے تھے۔ وہ منع بھی کرتا۔ پر وہ کہتے...... گھر پر بے کار ہی پڑا رہتا ہوں۔ یہاں دل بہل جاتا ہے۔

پانچویں سال پانچویں بیٹی ہوئی تو اماں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ گھر میں تلخی تو پہلے ہی سے رہنے لگی تھی۔ اپنی پسندیدہ بہو سے اماں کا دل برا ہو گیا تھا۔ پانچویں بیٹی کی پیدائش پر وہ کھل کر سامنے آ گئیں۔ ''بس نوشاد اب تو اسے فارغ کر دے۔'' انہوں نے حکم سنایا۔

نوشاد علی ہکا بکا رہ گیا۔ ''کیا کہہ رہی ہو اماں؟''

''ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ بس تو چھوڑ دے اسے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے اماں؟''

''کیوں نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے اجازت نہیں دی ہے کیا؟''

''پر اماں' کوئی وجہ تو ہو۔ وہ اچھی بیوی ہے۔ اچھی بہو ہے۔ حیا اور آبرو والی ہے۔ بغیر وجہ کے تو چھوڑنے کا حکم نہیں۔''

''وجہ تو ہے۔ یہ رہے گی تو گھر بیٹیوں سے بھر جائے گا۔'' اماں نے جواز سمجھایا۔

''دیکھو اماں' یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔ اس بے چاری کا اس میں کیا قصور۔ اور بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں۔''

''اتنی زیادہ رحمت نہیں چاہیئے مجھے۔'' اماں نے تنک کر کہا۔

''پر مجھے تو چاہیئے اماں۔ اللہ کی رحمت تو ہوئی ہے۔ میرا کھوکھا تھا پہلے' اب دکان ہے۔ پہلے سے اچھا کھاتے پہنتے ہیں۔ یہ سب میری بیٹیوں کے دم سے ہے۔''

''تو تو میرا حکم نہیں مانے گا؟'' اماں نے آنکھیں نکالیں۔

''جان دے سکتا ہوں تمہارے حکم پر اماں۔ لیکن اللہ کے حکم کے خلاف نہیں جا سکتا۔'' نوشاد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

مگر اماں بھی تہیہ کئے بیٹھی تھیں۔ ''ٹھیک ہے' مت چھوڑ اسے۔ پڑا رہنے دے۔ میں تیری دوسری شادی کرا دیتی ہوں۔''

''پر کیوں اماں؟''

''تو کیا بیٹے کی آرزو لئے بیٹھا رہے گا یونہی۔''

''مجھے کوئی آرزو نہیں اماں۔ میں اللہ کی رضا میں خوش ہوں۔'' نوشاد نے سادگی سے کہا۔

''تجھے نہ سہی' مجھے تو پوتے کی آرزو ہے۔ دوسری شادی تو تجھے کرنی ہی ہوگی۔''



اب تک نوشاد اکیلا لڑ رہا تھا۔ مگر اب اماں کی نافرمانی کا' اللہ کی ناراضی کا ڈر تھا۔

اُس نے امید بھری' مدد طلب نظروں سے ابا کو دیکھا۔ ''تم ہی اماں کو سمجھاؤ نا ابا۔''

''اسے کون سمجھا سکتا ہے۔'' ابا نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''تجھے اس کی بات ماننی ہوگی۔ لیکن پہلے میں اس سے کچھ بات کرلوں۔'' پھر وہ اماں کی طرف مڑے۔

''دیکھ نادرہ' ہماری شادی کے ایک سال بعد یہ نوشاد پیدا ہوا تھا۔ پھر کوئی اولاد نہیں ہوئی ہمارے ہاں۔ اور مجھے بہت سارے بچوں کی آرزو تھی۔ وجہ موجود تھی۔ میں دوسری شادی کر سکتا تھا۔ لیکن تیری خوشی کی خاطر میں نے نہیں کی۔ تو پھر تو بیٹے پر کیوں ظلم کرتی ہے۔''

''تو اب شادی کر لو۔'' اماں نے تڑ سے کہا۔ ''میں نے اُس وقت بھی منع نہیں کیا تھا۔''

''میں چاہتا تھا اور میں نے نہیں کی۔ یہ تو چاہتا بھی نہیں ہے۔ تو اسے کیوں مجبور کرتی ہے۔ یہ تو زیادتی ہے۔''

''یہ میرا حق ہے۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ میرا حکم نہیں ٹال سکتا۔''

''تیرا توڑ ہے میرے پاس نادرہ۔'' ابا نے مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''یہ میرا بیٹا ہے۔ میرا حکم نہیں ٹال سکتا۔ اور میرا حکم ہے کہ یہ دوسری شادی نہیں کرے گا۔'' پھر وہ نوشاد کی طرف مڑے۔ ''اب تو بے فکر ہو جا بیٹے۔ تجھے دوسری شادی کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور تو والدین کی نافرمانی کا مرتکب بھی نہیں ہوگا۔''

اور نوشاد واقعی مطمئن ہو گیا۔ یہ خوفِ خدا اُس کی شخصیت کا سب سے اہم عنصر تھا۔ وہ ہر کام کرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں اللہ کے حکم کے خلاف تو نہیں۔ اور اس کا سبب برہان الدین تھے۔ برہان صاحب ان معنوں میں پیر نہیں تھے کہ وہ مرید نہیں بناتے تھے۔ لیکن ان کے معتقدین کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ ان کی دعاؤں میں بڑی تاثیر ہے۔ کسی کو کوئی بھی مسئلہ درپیش ہوتا' وہ برہان صاحب کے پاس چلا

آ تا۔ برہان صاحب اسے کچھ پڑھنے کو بتاتے اور اللہ کی مہربانی سے مسئلہ حل ہو جاتا۔
برہان صاحب ہمیشہ کہتے تھے۔ ''بھئی آدمی کو خود دعا کرنی چاہیئے۔ جسے تکلیف ہوگی' اسی کی دعا میں اثر ہوگا۔ کسی دوسرے کی دعا میں وہ سچائی' وہ اثر کیسے آسکتا ہے۔ اور بھئی اللہ کو تو بندے کا مانگنا بہت اچھا لگتا ہے۔''

مغرب کے بعد رات تک برہان صاحب کی بیٹھک میں لوگوں کا ہجوم رہتا۔ وہ کسی سے کچھ لیتے نہیں تھے۔ کوئی ان کے لئے کچھ لاتا تو وہ برا مان جاتے۔ بہت سختی سے منع کرتے۔ وہ کہتے۔ ''بھئی نہ میں کوئی پیر ہوں اور نہ یہ آستانہ ہے۔ یہ تو غریب خانہ ہے جس کا دروازہ دوستوں کے لئے کھلا رہتا ہے۔''

نوشاد دکان بند کرنے کے بعد تقریباً ہر روز ایک گھنٹا برہان صاحب کی بیٹھک میں گزارتا تھا۔ وہ وہاں بس بیٹھ کر سنتا رہتا اور برہان صاحب کی باتیں اپنے اندر اتارتا رہتا۔ یہ اس کی ایک اور خوبی تھی۔ وہ بولتا بہت کم تھا۔ اور وہ بھی ضرورت کے وقت۔ بلا ضرورت بولنے کا تو وہ قائل ہی نہیں تھا۔ اور وہ کبھی اپنا کوئی مسئلہ لے کر بھی وہاں نہیں گیا۔ اللہ کے فضل و کرم سے کبھی کوئی مسئلہ سامنے آیا ہی نہیں۔ یہ بات بھی اُس نے برہان صاحب سے ہی سیکھی تھی۔ برہان صاحب ہمیشہ کہتے تھے۔ ''میاں' بس آدمی کو ایک طرف سے چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ اپنے نفس کی طرف سے۔ پھیپھڑے جس رفتار سے سانس لیتے ہیں' دل جس رفتار سے دھڑکتا ہے' اس سے ہزار گنا تیز رفتاری سے نفس خواہشیں پیدا کرتا ہے۔ اور ہر خواہش کے ساتھ کئی مسئلے ہوتے ہیں۔ نفس کو نہیں روکو گے تو زندگی مسائلستان بن جائے گی۔ خواہش اور سکون میں ازلی بیر ہے۔ خواہشیں پوری نہیں ہوں گی تو بے سکون اور ناخوش رہو گے۔ اور ناخوش رہو گے تو ناشکری کرو گے۔ اور ناشکری کفر ہے۔ اور کفر اللہ کی رحمت سے دور کرتا ہے آدمی کو۔ بس نفس کو باندھ کر رکھو۔ یہ ایمان رکھو کہ جو اللہ نے عطا کیا' تمہارے لئے اس سے بہتر کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور جو نہیں ملا' اسی میں تمہاری بہتری ہے۔ بس اللہ کی رضا میں دل و جان



سے خوش رہو۔ یہی بندگی ہے۔''

نوشاد نے ان سب باتوں کو اپنی زندگی میں عملاً جاری کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اماں سے سچ کہا تھا کہ اسے بیٹے کی کوئی خواہش' کوئی آرزو نہیں' بیٹیاں اللہ کی رحمت تھیں۔ ہر بیٹی کی پیدائش پر اللہ نے اس کے کاروبار کو ترقی دی تھی۔ اور اسے اپنی ہر بیٹی سے محبت تھی۔

شادی کے نو سال بعد وہ سات بیٹیوں کا باپ بن چکا تھا۔ اماں دوسری شادی کا معاملہ ہر بار اٹھاتیں۔ مگر اب نوشاد مطمئن تھا۔ وہ ماں کا حکم مانتا تو باپ کی نافرمانی کا مرتکب ہوتا۔ اس لئے وہ خاموش ہی رہتا۔ ہاں اس کے دل کی گہرائیوں سے اپنے سمجھ دار باپ کے لئے دعا نکلتی تھی۔

اُسے احساس تھا کہ اِس بیٹے کے چکر میں گھر کا ماحول خراب ہو گیا ہے۔ اماں ہر وقت زلیخا کو طعنے دیتی تھیں۔ اِدھر بچیاں بڑی ہو رہی تھیں۔ ان میں بدتمیزی کا رجحان پیدا ہو رہا تھا۔ وہ ماں کی حمایت میں دادی کو جواب دیتیں۔ مگر زلیخا انہیں ڈانٹ دیتی۔ شاید اس لئے کہ اس کے شوہر نے اسے اعتماد دیا تھا اور اسے عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا نہیں ہونے دیا تھا۔ بہرکیف نوشاد کو ان باتوں کا احساس تھا۔ لیکن وہ دکان کی مصروفیات میں گھرا ہونے کی وجہ سے ان جھگڑوں سے محفوظ تھا۔

پھر یہ ہوا کہ زلیخا بیٹے کے حصول کے لئے پیروں فقیروں کے چکر میں پڑ گئی۔ جہاں کسی بزرگ کا سنتی' وہاں دوڑ جاتی۔ کچھ تو فطری طور پر بیٹے کی آرزو تھی اور کچھ یہ کہ وہ ساس کے سامنے سرخ رو ہونا چاہتی تھی۔

ایک دن نوشاد نے اسے سمجھایا۔ ''زلیخا...... یہ سب کیوں کر رہی ہو تم۔ جانتی ہو' یہ شرک ہے۔''

''شرک کیسے ہے؟''

''تمہیں جو مانگنا ہے' اللہ سے مانگو...... رو رو کر...... گڑگڑا کر۔ وہ تو تمہارے پاس

ہی ہے......شہ رگ سے بھی قریب......اور وہ سب کی سنتا ہے۔"

"میری تو نہیں سنتا۔" زلیخا نے شکایتاً کہا۔

"سنتا ہے۔" نوشاد نے زور دے کر کہا۔ "قبول نہیں کرتا تو یقین کرو اس میں بھی تمہاری بہتری ہے۔"

"مجھے تو نہیں نظر آتی کوئی بہتری۔ اماں نے میری جان عذاب میں کر رکھی ہے۔"

"میں تو کچھ نہیں کہتا۔ بیوی تم میری ہو، اماں کی تو نہیں۔"

"پر اماں کو تو تم بھی نہیں روک سکے۔"

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم شرک کرنے لگو۔" نوشاد نے غصے سے کہا۔ "مزاروں پر جا کر مرادیں مانگتی ہو۔ اپنی عاقبت خراب کرتی ہو۔ اللہ کے سوا کوئی کسی کو کچھ نہیں دیتا۔"

"میں مزار پر جا کر اولاد نہیں مانگتی۔ کسی پیر، کسی بزرگ سے بھی نہیں مانگتی۔ میں تو اس لئے ان کے پاس جاتی ہوں کہ وہ دعا کریں۔ اللہ اپنے بندوں کی زیادہ سنتا ہے۔ کچھ تو ایسے ہوتے ہیں، جن کی وہ بات ٹالتا ہی نہیں۔"

"مجھے صرف تمہاری جہالت ہی بری لگی ہے پہلے دن سے۔" نوشاد نے دانت پیس کر کہا۔ "ارے جاہل عورت، اللہ کی مرضی اصل چیز ہے۔ اور یہ تو دیکھ، وہ تو کافروں کو بھی نوازتا ہے۔ انکار کرنے والوں کو بھی دیتا ہے۔ سب کچھ بس اسی سے مانگنا چاہیئے......مانگتے رہنا چاہیئے۔"

"اچھا......تمہیں کیا۔ عاقبت میری خراب ہوگی نا۔"

"لیکن تم اور بچے میری ذمہ داری ہو۔ اللہ مجھ سے بھی جواب طلب کرے گا۔" نوشاد نے بے بسی سے کہا۔ لیکن اُس نے سمجھ لیا کہ وہ بیوی کو نہیں سمجھا سکتا۔ اُس نے زلیخا سے وہ سب کچھ کہا تھا، جو برہان صاحب سے سن کر عملاً اپنے اندر اتار لیا تھا۔ مگر وہ کیا کرتا۔ ہدایت دینے والا تو اللہ ہے۔



زلیخا پانچ چھ سال ان چکروں میں لگی رہی۔ اسے بیٹا تو نہیں ملا۔ لیکن اُس کے نزدیک یہ بھی کچھ کم بڑی بات نہیں تھی کہ بیٹیوں کی پیدائش کا سلسلہ رک گیا۔ ادھر اماں بھی لڑلڑ کر ہار گئی تھیں۔ بڑھاپا بھی تھا۔ لڑنے کی جان بھی نہیں رہی تھی۔ اور کچھ پوتیوں سے بھی محبت ہوگئی تھی۔ جواب جوان ہورہی تھیں۔ چنانچہ گھر کا ماحول بہتر ہوگیا۔ زلیخا نے بھی بیٹے کا خیال دل سے نکال دیا۔

اُدھر ترقی کا عمل جاری تھا۔ نوشاد کی دکان اب علاقے کی سب سے بڑی دکان تھی۔ ارد گرد کے علاقوں میں تو اسے ہول سیلر کا مقام حاصل ہو چکا تھا۔ ابا کی مدد اُس کے لئے ناکافی تھی۔ پہلے اُس نے ایک لڑکا ملازم رکھا۔ پھر اُس کے تین ملازم ہوگئے۔ اب وہ خوش حال تھا۔ دولت عملاً اُس پر برس رہی تھی۔ مگر وہ آپے سے باہر نہیں ہوا۔ گھر کے رہن سہن میں تھوڑی سی تبدیلی ضرور آئی۔ لیکن اُس نے گھر میں الللّے تللّے کا ماحول نہیں بننے دیا۔ وہ عقل منداور دور اندیش تھا۔ وہ یہ خیال رکھتا تھا کہ اللہ نے اسے بیٹیوں کے طفیل یہ سب کچھ دیا ہے، جو بیٹیوں ہی کے لئے ہے۔ اسے بیٹیوں کی شادی بھی کرنی ہے۔ زلیخا بھی سمجھ دار اور کفایت شعار تھی۔ اُس نے بھی ابھی سے بیٹیوں کی فکر شروع کردی تھی۔

صبر انسان کے بس کی بات نہیں۔ صبر تو اللہ ہی دیتا ہے۔ جب صبر آجائے تو پھل بھی ضرور ملتا ہے۔ زلیخا کو یہ خیال ہی نہیں آتا تھا کہ اس کے گھر میں ایک بیٹے کی کمی ہے اور یہ کہ کبھی اسے یہ آرزو تھی اور اس کے لئے وہ کہاں کہاں نہیں گئی تھی۔ وہ تو اب بچیوں کے لئے فکر مند تھی، جو ایک قطار میں شادی کے لئے تیار ہورہی تھیں۔ بچیوں کی عمروں میں فرق نہ ہو تو یہی ہوتا ہے۔ سب تقریباً ایک ساتھ بڑے ہوتے ہیں۔

ایسے میں جب اسے احساس ہوا کہ اُس کی شاخِ وجود پھر ایک بار ہری ہورہی ہے تو وہ گھبرا گئی۔ اس بار اسے یہ پروا نہیں تھی کہ بیٹا ہوگا یا بیٹی۔ وہ تو شرمندہ تھی۔ اتنی جوان بچیوں کے سامنے وہ ماں بنے گی، یہ خیال اسے دبائے دے رہا تھا۔ اس بار معاملہ الٹا

ہوا۔ وہ جان چھڑانے کی فکر میں لگ گئی۔ اُس نے اس سلسلے میں نوشاد سے بات کی۔ مگر وہ تو بپھر گیا۔ ''آج تک میں نے تمہاری ہر جہالت برداشت کی۔ مگر یہ برداشت نہیں کروں گا۔'' اُس نے دبی ہوئی غصے بھری آواز میں کہا۔ ''اللہ نے صاف حکم دیا ہے کہ اپنی اولاد کو قتل مت کرو۔ اور حضورﷺ نے اللہ کے حکم پر مکہ میں اسلام قبول کرنے والی عورتوں سے بھی یہ عہد لیا تھا۔ تم اس کے خلاف کرو گی تو میرا تم سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔''

زلیخا ڈر گئی۔ نوشاد نے اُس سے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ اُس نے یہ ارادہ دل سے نکال دیا۔

نادرہ ویسے ہی گوشہ نشیں ہو گئی تھی۔ گھر میں اُس کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا۔ وہ بس اللہ کی ہو گئی تھی۔ ابتداء میں تو اسے پتا ہی نہیں چلا۔ آٹھویں مہینے میں بات اُس کے علم میں آئی تو اس نے بس اتنا کہا۔ ''جہاں سات ہیں' وہاں آٹھویں بھی سہی۔ کیا فرق پڑتا ہے۔''

جب زلیخا ننھے عبداللہ کو لئے اسپتال سے گھر آئی تو بہت شرمندہ تھی۔ اسے یہ خیال ستائے جا رہا تھا کہ بچیاں کیا سوچیں گی۔ لیکن وہاں تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ بچیوں نے کبھی منہ سے بھائی کی آرزو ظاہر نہیں کی تھی۔ لیکن ان کا ردِعمل بتاتا تھا کہ وہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھا۔ ان کی تو خوشی کی کوئی حد ہی نہیں تھی۔ اور ماں کو وہ بڑے فخر سے دیکھتی تھیں۔ اور تو اور' نادرہ بھی اپنی گوشہ نشینی سے نکل آئی۔ اُس نے پوتے کو پہلی بار گود میں لیا تو اُس کی آنکھوں سے دھاریں بہہ رہی تھیں۔ پھر اُس نے زچہ اور بچے کے لئے احکامات صادر کرنے شروع کر دیئے۔ بچیوں کو لتاڑنا شروع کر دیا ارے کم بختو' ماں کو ہلنے نہ دو۔ اُس کا خیال رکھو۔ ایسے میں کھلائی پلائی بڑی اہم ہوتی ہے۔ بچے کی فکر نہ کرو۔ اسے مجھ پر چھوڑ دو۔''

ساس جس طرح سے اُس کی دیکھ بھال پر توجہ دے رہی تھیں' اُس سے زلیخا کو



لگتا تھا کہ وہ کوئی الھڑ لڑکی ہے اور پہلی بار ماں بنی ہے۔ ادھر ننھا عبداللہ سو بیاروں کے درمیان ایک انار بن گیا تھا۔ دادی تو اسے ایک لمحے کے لئے بھی نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔ وہ بس نماز کا ہی وقفہ کرتی تھیں۔ تسبیح پڑھتے وقت بھی وہ اسے گود میں لئے رہتیں۔ اور بچیوں کے لئے یہ بڑی حق تلفی تھی۔ پھر وہ سات تھیں۔ اُن میں آپس میں بھی رقابت چلتی تھی۔

اُس عرصے میں نوشاد کو اس طرح کے مکالمے بکثرت سننے کو ملے۔ تبسم دادی کے پاس آتی اور کہتی۔ ''دادی...... آپ تھک گئی ہوں گی۔ اسے مجھے دے دیں۔''

''اے ابھی تو گود میں لیا ہے بیچارے کو۔'' اماں کہتیں۔

دور سے زبیدہ کہتی۔ ''دو گھنٹے سے لئے بیٹھی ہیں دادی۔ ہمیں تو دیکھنے کو بھی نہیں ملتا بھائی۔''

اماں اُس کی سنی اَن سنی کر دیتیں۔ ڈپٹ کر تبسم سے کہتیں۔ ''جا...... جا کر ماں کا خیال رکھ۔ اُس کی فکر کر۔''

''اماں کے پاس باجی اور اپیا ہیں۔'' تبسم کہتی۔

''تو جا کر اسکول کا کام کر۔''

''وہ تو میں کر چکی ہوں۔''

اتنی دیر میں ننھا عبداللہ رونے لگتا اور تبسم کو موقع مل جاتا۔ ''دادی...... یہ بھوکا ہو رہا ہے۔ مجھے دیں۔ میں امی کے پاس لے جاؤں۔''

یہ وہ مقام تھا' جہاں اماں مجبور ہو جاتی تھیں۔ وہ بچے کو تبسم کی طرف بڑھاتیں تو شاہدہ لپک کر آتی اور عبداللہ کو گود میں لے لیتی۔ ''تبسم...... تم ابھی چھوٹی ہو۔ تمہیں اسے اٹھانا نہیں آتا۔'' یہ کہہ کر وہ بچے کو ماں کے پاس لے جاتی۔ تبسم منہ دیکھتی رہ جاتی۔

زلیخا سوچتی کہ دودھ اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ نہ ہوتا تو میرا بچہ مجھے ملتا ہی نہیں۔ اسے تو ساس کا خیال بھی رکھنا تھا اور بچیوں کا بھی۔ پہلی بار وہ ایثار کا مفہوم سمجھ

رہی تھی۔ پتا چل رہا تھا کہ اپنا بچہ صرف اپنا نہیں ہوتا' بہت لوگوں کا ہوتا ہے...... اور ان کی دل جوئی ضروری ہوتی ہے۔ اس کے لئے وہ وقت بہت خوب صورت ہوتا تھا' جب عبداللہ دودھ پینے کے لئے اُس کی گود میں آتا تھا۔

عبداللہ کی پیدائش کو چھ سات دن ہوئے تھے کہ ابا بہت تھکے تھکے نظر آنے لگے۔

''کیا بات ہے ابا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اُس نے تشویش بھرے لہجے میں ان سے پوچھا۔

''کچھ نہیں بیٹے۔ بڑھاپا ہے۔'' ابا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ ''سوچتا ہوں' اب تین ملازم ہیں تمہارے پاس۔ دکان تو تم سنبھال سکتے ہو۔''

''میں تو پہلے بھی کہتا تھا ابا کہ آرام کرو۔ پر تم ہی نہیں مانتے تھے۔ کام کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ضرورت پڑی تو ایک اور لڑکا رکھ لوں گا۔'' نوشاد نے بے حد خلوص سے کہا۔

''پہلے اور بات تھی۔ گھر میں چخ چخ ہوتی تھی۔ دل نہیں لگتا تھا۔ پر اب تو وہ کھلونا ہے نا عبداللہ۔ اور گھر میں بھی امن ہے۔''

تو یہ بات ہے۔ نوشاد نے دل میں سوچا۔ اب ابا کا دکان پر دل نہیں لگتا۔

یوں ابا نے دکان پر آنا چھوڑ دیا اور عبداللہ کے امیدواروں میں شامل ہو گئے۔

گھر میں ایک نوشاد ہی تھا' جو عبداللہ کی پیدائش کے بعد نارمل رہا تھا۔ خوشی تو اسے بہت تھی۔ لیکن اُس نے کھل کر کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ وہ یہ تاثر ہرگز نہیں دینا چاہتا تھا کہ بیٹے کی پیدائش کے بعد بیٹیوں کی وقعت کم ہوئی ہے۔ اور پھر یہ اللہ کا کرم ہی تو تھا' جس نے اتنے برسوں کے بعد سب کی آرزو پوری کر دی ورنہ بچیوں نے تو کبھی یہ آرزو ظاہر ہی نہیں کی تھی۔ شاید اللہ کو ان کا صبر ہی بھایا تھا۔

تو ایک نوشاد ہی تھا' جس کے معمولات میں فرق نہیں پڑا تھا۔ ظاہری طور پر بھی اُس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اب اندر کی تبدیلی اللہ جانتا تھا یا وہ خود۔ حقیقت یہ تھی کہ عبداللہ کی پیدائش کے بعد اسے طاقت کا احساس ہونے لگا تھا۔ سینہ جیسے چوڑا ہو گیا



تھا' گردن کچھ تن گئی تھی۔ مگر یہ محسوس کرتے ہی وہ پہلے سے زیادہ جھک کر چلنے لگا تھا...... سینہ سمیٹ کر' گردن جھکا کر۔ غرور تو اچھی چیز ہے ہی نہیں۔ اللہ کے بندوں پر تو عاجزی ہی سجتی ہے۔ اور وہ دل ہی دل میں ہر وقت اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا تھا کہ اللہ نے اُس کی نسل آگے بڑھانے کا سامان کر دیا۔

کبھی دکان میں مصروفیت کے دوران بھی اسے عبداللہ یاد آ جاتا۔ اُس کا دل اُسے دیکھنے کو تڑپنے لگتا۔ وہ لڑکوں پر دکان چھوڑ کر جا سکتا تھا تھوڑی دیر کو۔ وہ اعتبار کے تھے اور ایمان دار۔ لیکن وہ یہ سوچ کر خود کو روک لیتا کہ یہ رزق کمانے کی جدوجہد بھی تو وہ اسی کے لئے کر رہا ہے۔ محبت کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ اپنی ذمے داریوں ہی سے منہ موڑ لے۔

اور رات کو دکان بند کرنے کے بعد' اب وہ ہر روز برہان صاحب کی بیٹھک کا رخ کرتا تھا۔ پہلے وہ کبھی کبھار ناغہ بھی کر لیتا تھا۔ لیکن اب اُس کے اس معمول میں باقاعدگی آ گئی تھی۔ صرف اس لئے کہ دکان بند کرنے کے بعد وہ پہلا قدم بڑھاتا تو دل چاہتا کہ اڑ کر گھر پہنچے اور عبداللہ کو گود میں بھر لے۔ ایسے میں وہ برہان صاحب کی بات یاد کرتا۔ وہ کہتے تھے...... نفس کو باندھ کر' بے عزت کر کے رکھنا چاہیئے۔ ورنہ یہ بہت ذلیل کراتا ہے۔ اس کی ایک معمولی سی بات مان لو تو یہ اس بات سے سینکڑوں نقصان دہ مطالبات پیدا کرتا ہے۔ آدمی کو پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ سیدھے راستے سے ہٹ رہا ہے۔

گھر میں سب یہی سمجھتے تھے کہ نوشاد کو بیٹے سے محبت تو ہے۔ مگر اُس میں کوئی غیر معمولی پن نہیں۔ اُسے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ اس کا ایک فائدہ بھی تھا۔ وہ گھر میں ہوتا تو سب اپنی اپنی مسابقت بھول کر اُس پر عبداللہ کی وہ محبت تھوپنے کی کوشش کرتے' جو اس کے سینے میں سمندر کی طرح پہلے ہی موجود تھی۔ وہ گھر پہنچ کر کھانا کھاتا تو اماں پوتے کو لئے آ کھڑی ہوتیں۔ ''گھڑی دو گھڑی بیٹے کو بھی وقت دے دیا کر۔''

''کیا کروں اماں۔ تھک جاتا ہوں۔'' نوشاد بے نیازی ظاہر کرتا۔

''اب کھانے کے بعد ٹہلنے گا نا۔ تو اسے گود میں لے کر ٹہل لے۔ کھانا زیادہ جلدی ہضم ہو جائے گا۔'' اماں زبردستی عبداللہ کو اُس کی طرف بڑھاتیں۔

وہ بظاہر با دلِ نخواستہ عبداللہ کو گود میں لے کر ٹہلنے لگتا۔ اُس کا دل مچلتا اچھلتا۔ مگر وہ ضبط کئے رہتا۔ اور جب وہ دیکھتا کہ کوئی اسے نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ ننھے عبداللہ کو سینے سے بھینچ لیتا۔ ''اللہ کا شکر ہے۔ تم اس کی دی ہوئی بہت بڑی نعمت ہو میرے لئے۔'' وہ سرگوشی میں کہتا۔ ''شاید تمہیں کبھی پتا نہیں چلے گا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔''

اور ہر صبح دکان پر جانے سے پہلے زلیخا عبداللہ کو اُس پر لاد دیتی۔ ''اکلوتا بیٹا ہے۔ اتنے برسوں کے بعد اللہ نے کرم کیا ہے۔ اور تم اسے پوچھتے بھی نہیں۔ کبھی باہر بھی لے جایا کرو سیر کے لئے اسے۔''

اور وہ بظاہر منہ بنا کر بیٹے کو باہر لے جاتا۔ کسی کو پتا نہ چلتا کہ اُس کا دل سینے کے اندر ناچ رہا ہے۔ اس خوشی کی تو کوئی حد ہی نہیں ہوتی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ کاروبار بڑے ہوتے ہوئے عبداللہ کے ساتھ ساتھ پھیلتا رہا۔ چار سال کے اندر یکے بعد دیگرے نوشاد نے تین بیٹیوں کی شادی کر دی۔ اللہ مہربان تھا۔ رشتے بہت اچھے ملے تھے۔ تینوں اپنے گھر خوش تھیں۔ یہ اللہ کا فضل ہی تو تھا کہ نوشاد نے کبھی بیٹیوں کو بوجھ نہیں سمجھا تھا۔ اسے کبھی ایسا محسوس بھی نہیں ہوا تھا۔

عبداللہ صرف گھر میں دادا، دادی، ماں، باپ اور بہنوں ہی کی آنکھ کا تارا نہیں تھا۔ محلے کے تمام لوگ اُس پر جان چھڑکتے تھے۔ وہ تھا بھی بہت پیارا۔ شکل وصورت سے بھی اور طبیعت سے بھی۔ بہت محبت کرنے والا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت ہر دل عزیز بچہ تھا۔

پچھلے سال اماں اور ابا آگے پیچھے ہی رخصت ہو گئے۔ عبداللہ اس وقت چھ سال سے اوپر تھا۔ اُس کے لئے وہ بڑا سانحہ بھی تھا اور انوکھی بات بھی۔ اس سے پہلے وہ موت کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اور جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا، وہ ذہن کو الجھا دینے والا



تھا۔

اُس روز اسکول سے آتے ہوئے اسے احساس ہو گیا کہ یہ کوئی غیر معمولی دن ہے۔ وہ ہر روز اپنی دکان کے سامنے سے گزرتا تھا۔ ابا اسے بلاتے اور زبردستی اسے کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔ کبھی سیو، کبھی کھٹ مٹھی گولی۔ مگر اُس روز دکان بند تھی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اُس کا دل گھبرانے لگا۔

اور وہ گلی میں داخل ہوا تو وہاں غیر معمولی چہل پہل دکھائی دی۔ شامیانہ لگا تھا۔ دری بچھی تھی۔ اس پر لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ پڑھ رہے تھے اور کچھ باتیں کر رہے تھے۔ پھر اسے زور زور سے رونے کی آوازیں آئیں۔ قریب جا کر اسے احساس ہوا کہ وہ آوازیں تو اُس کے اپنے گھر سے آ رہی ہیں۔

وہ گھبرا گیا اور تیزی سے گھر کی طرف لپکا۔ نوشاد اسی وقت گھر سے نکل رہا تھا۔ اُس نے جھپٹ کر اسے گود میں اٹھایا اور سینے سے بھینچ لیا۔

''کیا ہوا ابا؟''

''کچھ نہیں بیٹا۔ یہ تو زندگی میں ہوتا ہے۔''

عبداللہ نے غور سے باپ کو دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں نمی تھی اور چہرے پر لکیریں کھنچی تھیں۔ ''ابا...... آپ رو رہے ہیں؟''

''بس رونا آ جاتا ہے بیٹا۔''

نوشاد کو وہ دن خوب یاد تھا۔ ابا کی موت کا غم اُس کے دل میں نیزے کی طرح چبھا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے عبداللہ کا خیال آیا تھا۔ اُس نے سوچا تھا، موت بہت بڑا راز...... بہت بڑی آگہی ہے۔ اور ابھی عبداللہ اُس کے لئے بہت چھوٹا ہے۔ اسے اس سے بچانا ہوگا۔ اور وہ اس کے لئے ترکیبیں سوچتا رہا۔ بیٹے کو کہیں بھیجا بھی نہیں جا سکتا۔ بالکل سے نہیں بچایا جا سکتا۔ لیکن یہ کوشش تو کی جا سکتی ہے کہ اس کے اثرات اس پر کم سے کم پڑیں۔ اور گمراہ کن نہ ہوں۔

لیکن اُس کا سوچا دھرے کا دھرا رہ گیا۔ موت پر عورتوں کا ردِ عمل اتنا شدید ہو ہے کہ وہ پورے منظر پر چھا جاتی ہیں۔

اُس نے صحن میں عبداللہ کو گود سے اتارا اور نسیمہ سے کہا۔ ''بیٹی'' اس کا ہاتھ منہ دھلا دے اور اسے کچھ کھانے کو دے دے۔''

نسیمہ کو دیکھ کر عبداللہ کو حیرت ہوئی۔ شادی کے بعد سے باجی کم ہی آتی تھیں۔ اُس نے غور سے اُسے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ''کیا ہوا باجی؟''

''کچھ نہیں بھیا۔ کچھ بھی نہیں۔'' نسیمہ نے دانت پر دانت جما کر کہا۔

اچانک عبداللہ کو دادا کا خیال آ گیا۔ وہ ہر روز دروازے پر اس کی واپسی کا انتظار کرتے تھے۔ اسے لپٹا کر پیار کرتے تھے اور گود میں اٹھا کر گھر میں لے جاتے تھے۔

''باجی...... دادا جی کہاں ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

یہ پوچھنا غضب ہو گیا۔ نسیمہ ایسے روئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ سب لوگ اکٹھے ہو گئے۔ معاملہ نوشاد کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے بعد اسے معلوم نہیں کہ عبداللہ پر کیا گزری اور اُس نے کیا سمجھا۔

جب ابا کو لے جا رہے تھے، تب وہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ عبداللہ کو دکھائے یا نہیں۔ ہاں یہ فیصلہ وہ کر چکا تھا کہ عبداللہ قبرستان ہرگز نہیں جائے گا۔

ایسے میں اماں نے فیصلہ کر دیا۔ انہوں نے کہا۔ ''عبداللہ کو دادا کا چہرہ تو دکھا دو۔''

عبداللہ نے دیکھا اور بولا۔ ''دادا جی تو سو رہے ہیں۔ ابھی اٹھ جائیں گے۔''

نوشاد نے دانتوں سے ہونٹ کاٹ ڈالے۔ ''بیٹا...... اب یہ کبھی نہیں اٹھیں گے۔''

''تو آپ انہیں کہاں لے جا رہے ہیں۔''

''اللہ میاں کے پاس۔'' نوشاد نے جلدی سے کہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ قبرستان کا نام لیا جائے۔



''تو یہیں رہنے دیں۔ میرے استاد کہتے ہیں کہ اللہ میاں ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ گھر میں بھی...... میرے اندر بھی...... اور سب کے اندر۔''

''نہیں بیٹے۔ اب وہ اپنے الگ گھر میں رہیں گے۔''

''تو مجھے بھی ان کا گھر دکھائیں۔''

''ابھی نہیں۔ تم بڑے ہو گے تو دکھا دوں گا۔''

اُس رات عبداللہ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ نوشاد کے پاس لیٹا تھا۔ اُس کے ذہن میں بہت سی باتیں تھیں، جو سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ بہت سے سوال تھے، جن کا شافی جواب اسے کسی سے نہیں ملا تھا۔

''ابا...... کیا دادا جی واقعی اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''ہاں بیٹے۔ یہ سچ ہے۔''

''تو اللہ میاں کے پاس جانا بری بات تو نہیں ہے۔''

''بالکل نہیں ہے بیٹے۔''

''میں بھی اللہ میاں کے پاس جانا چاہتا ہوں ابا۔''

نوشاد کا جسم لرز کر رہ گیا۔ ''بیٹا...... اللہ میاں کی مرضی کے بغیر کوئی نہیں جا سکتا۔ اور اللہ نے ہر ایک کا وقت مقرر کر رکھا ہے۔''

''میرا وقت کب آئے گا ابا؟''

''یہ بس اللہ کو معلوم ہے۔ اور اللہ نے کسی کو بھی نہیں بتایا۔ یہ اللہ کا راز ہے۔''

عبداللہ چند لمحے خاموش رہا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ نوشاد اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اندھیرے میں یہ ممکن نہیں تھا۔ بالآخر عبداللہ نے پوچھا۔

''دادا جی واپس کب آئیں گے؟''

''ایک بار اللہ میاں کے پاس جانے کے بعد کوئی واپس نہیں آتا بیٹے۔''

یہ تو برا ہوا۔ عبداللہ نے کہا اور پھر کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا۔ ''ابا...... آپ نہیں

جائیے گا۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

نوشاد نے بیٹے کو سینے سے بھینچ لیا۔ پہلی بار اسے اندازہ ہوا تھا کہ بیٹا اُس سے بہت محبت کرتا ہے...... شاید دادا سے بھی زیادہ۔ کون جانے' میرا وقت کب آئے گا بیٹے۔ اُس نے دل میں کہا۔ اسے تو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ اور اُس نے بیٹے سے کہا۔ ''بس اللہ سے دعا کیا کرو بیٹے۔''

''اب یہی دعا کیا کروں گا ابا۔ اور میں آپ سے پہلے ہی جاؤں گا۔'' ننھے سے بچے نے بہت بڑی بات کہہ دی۔

نوشاد تڑپ گیا۔ اُس نے بیٹے کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ایسی باتیں نہیں کرتے بیٹے۔ اللہ کی باتیں اللہ ہی جانے۔ ان پر سوچتے بھی نہیں۔''

دیر تک خاموشی رہی۔ نوشاد سمجھا کہ وہ سو گیا ہے۔ اچانک عبداللہ نے کہا۔ ''ابا...... اللہ میاں کے پاس جانا اچھی بات ہے۔ تو پھر یہ سب لوگ اتنا رو کیوں رہے تھے؟''

نوشاد کو اس بار جواب کے لئے کچھ دیر سوچنا پڑا۔ پھر اُس نے کہا۔ ''تمہارے دادا کا تو فائدہ ہو گیا۔ مگر بیٹے' ان سب کا تو نقصان ہوا نا۔ وہ ان کے پاس نہیں رہے۔ اس لئے رو رہے تھے سب۔ وہ سب سے محبت کرتے تھے نا۔''

''سب سے زیادہ مجھ سے محبت کرتے تھے۔'' عبداللہ نے کہا اور پہلی بار رونے لگا۔ وہ خوب رویا...... بہت دیر تک رویا۔ روتے روتے ہی اسے اونگھ آ گئی۔ مگر وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ نوشاد نے کان لگا کر سنا۔ وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا۔ ''اللہ میاں...... پیارے اللہ میاں...... ایک بار دادا کو میرے پاس بھیج دیجئے۔ وہ آخری بار مجھے پیار کر لیں...... بہت سارا پیار...... بس ایک بار اللہ میاں......''

یہی کچھ دہراتے دہراتے وہ سو گیا۔ لیکن نوشاد پوری رات جاگتا رہا۔

اور جب اماں کا انتقال ہوا تو نوشاد عبداللہ کو واپس لانے کے لئے خود اسکول



چلا گیا۔ دکان کے پاس سے گزرتے ہوئے عبداللہ نے کہا۔ ''ابا...... دکان بند ہے آج۔''

''ہاں بیٹے۔''

اور گلی کا منظر دیکھتے ہی عبداللہ نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا ابا۔ کوئی اللہ میاں کے پاس چلا گیا ہے۔''

''ہاں بیٹے۔'' عبداللہ نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

عبداللہ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''ابا...... کیا دادی......؟'' اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ہاں بیٹے''

نوشاد کو بیٹے کے اس ہاتھ میں لرزش محسوس ہوئی' جسے وہ تھامے ہوئے تھا۔ اُس نے سر جھکا کر دیکھا۔ اُس کا بیٹا چپکے چپکے' بے آواز رو رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ نوشاد کا دل کٹنے لگا۔ اُس کا انداز بڑوں کا سا تھا۔ وہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نوشاد نے سوچا' اللہ پاک بچوں پر آگہی کا ایک لمحہ اتار دیں تو بچے کس طرح بڑے ہو جاتے ہیں۔

''ماموں...... سب کچھ اندر رکھ دیا ہے۔'' سلیم کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ وہ سوچوں کے بھنور سے نکل آیا۔

اُس نے تینوں لڑکوں کو پیسے دیئے۔ دکان کا شٹر گرا کر تالا لگایا۔ گلی کے کونے پر پہنچ کر وہ ٹھٹکا...... صرف ایک لمحے کے لئے۔ پھر وہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ اس روز اُس کا برہان صاحب کے ہاں جانے کا موڈ نہیں تھا۔

اماں اور ابا کی یاد نے اُسے اُداس کر دیا تھا!

❁...........❁...........❁

زلیخا اُس روز پریشان تھی۔ دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ خالی بیٹھتی تو وحشت

ہونے لگتی۔ ہول اٹھنے لگتے۔ گھبرا کر اُس نے آمنہ کو کچن سے نکال دیا۔ ''تو جا۔ آج کھانا میں پکاؤں گی۔''

آمنہ نے حیرت سے ماں کو دیکھا اور پھر خوش ہوگئی۔ چاروں بہنوں کے درمیان کام کی باقاعدہ تقسیم تھی۔ اُس کے تحت آج رات کا کھانا پکانا اُس کی ذمے داری تھی۔ اماں اس معاملے میں بہت سخت تھیں۔ آج کچھ قسمت ہی زور پر تھی۔

زلیخا اس روز خود کو مصروف رکھنا چاہتی تھی۔ اس لئے اُس نے کوفتے پکانے کا ارادہ کرلیا۔ حالانکہ اب اتنی مشقت سے اُس کا دل گھبراتا تھا۔ اب اس طرح کے کام وہ بچیوں سے لیتی تھی۔

لیکن مصروفیت نے بھی اسے ہلکا نہیں کیا۔ اُس کا دماغ مصروف ہی رہا۔ وہ رہ رہ کر مجذوب کے بارے میں سوچتی، مجذوب کی اور اپنی گفتگو اسے یاد آتی۔ مجذوب کا سراپا اُس کی نگاہوں میں پھر جاتا۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک انجانا خوف اُس کے دل کو جکڑ لیتا۔ اسے رہ رہ کر احساس ہو رہا تھا کہ اس نے کوئی بہت غلط، بہت بری بات کہہ دی ہے، کوئی ایسی بات جس سے اس کا اور خدانخواستہ عبداللہ کا کوئی بڑا نقصان ہوسکتا ہے۔ مشکل یہ تھی کہ مسئلہ جس بات کا تھا، اُس پر وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کوفتے بھی اچھے نہیں بنے۔ دماغ الجھا ہوا ہو تو کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں کیا جاتا۔ بہرحال فائدہ یہ ہوا کہ ساڑھے آٹھ بجے تک وہ مصروف رہی۔ پھر اس نے بچوں کو کھانا کھلایا اور عبداللہ کو لے کر لیٹ گئی۔ وہ جلدی سونے کا عادی تھا۔ لیکن نوشاد کی آمد سے پہلے سوتا بھی نہیں تھا۔

اُس رات نوشاد جلدی گھر آ گیا۔ اسے دیکھ کر پہلے تو وہ حیران ہوئی...... اور پھر خوش ہوگئی۔ اس نے سوچا، شوہر کے سامنے وہ دل کا بوجھ ہلکا کر سکے گی۔

نوشاد نے منہ ہاتھ دھویا۔ تازہ دم ہو کر صحن میں چارپائی پر بیٹھا۔ ہر روز وہ کچھ دیر بچوں کے ساتھ گزارتا تھا۔ پھر اس نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد وہ چہل قدمی کے لئے



باہر نکل گیا۔ عبداللہ اس کے ساتھ تھا۔ یہی وقت باپ بیٹے کے لیے سچی قربت کا ہوتا تھا۔ بیٹیاں تو اس کے ساتھ نکل نہیں سکتی تھیں۔ چنانچہ وہ کھل کر بیٹے سے محبت کرسکتا تھا۔ یوں کہ بچیوں کو احساس بھی نہ ہوتا کہ وہ عبداللہ کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

اس چہل قدمی کے دوران نوشاد کو بیٹے کو سمجھنے کا موقع ملتا تھا۔ وہ اس سے باتیں کرتا رہتا۔ اسکول میں کیا کچھ ہوا۔ وہ کتنی دیر کھیلا۔ مسجد گیا تھا۔ وہاں کیا پڑھا۔ اسے کیا اچھا لگتا ہے، کیا برا لگتا ہے۔ ہر روز وہ یہی سب کچھ پوچھتا تھا۔ انہی باتوں میں کبھی کبھی اسے بیٹے میں کسی تبدیلی کا علم بھی ہو جاتا تھا۔

اسی رات عبداللہ نے انکشاف کرنے والے انداز میں کہا۔ ''ابا...... پتا ہے، مجھے اب سب سے زیادہ برا کیا لگتا ہے''

نوشاد چونکا۔ اسے احساس ہو گیا کہ کوئی بڑی تبدیلی سامنے آنے والی ہے۔ ''بتاؤ تو'' اس نے کہا۔

''مجھے مرنا سب سے برا لگنے لگا ہے ابا۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔''

نوشاد کو کسی انکشاف کی توقع ضرور تھی۔ لیکن جو بات سامنے آئی، اس نے اسے ہکا بکا کر دیا۔ ''کیوں بیٹا؟''

''میں مر جاؤں گا تو اماں کو بہت دکھ ہوگا۔ اور ابا...... مرنے میں تکلیف بھی تو بہت ہوتی ہے۔ ہے نا؟''

نوشاد اس دوران تیزی سے سوچتا رہا تھا۔ اور اس نے حکمت عملی تیار بھی کر لی تھی۔ ''دیکھو بیٹے عبداللہ، موت کا کسی انسان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔'' اس نے بے حد محبت اور نرمی سے کہا۔ ''نہ اس پر کسی کا کوئی اختیار ہے...... تمہارا، نہ میرا، نہ تمہاری اماں کا کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ اس لئے آدمی کو اس کے بارے میں اس طرح نہیں سوچنا چاہیئے۔ ہمیں تو بس زندگی کے بارے میں سوچنا چاہیئے ہم کیا کر رہے ہیں...... درست یا غلط۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اور رہی تکلیف کی بات، تو وہ تو زندہ رہنے میں بھی ہوتی

ہے۔ تم اپنی ماں کو خفا کرو گے، وہ تمہیں تھپڑ ماریں گی تو تکلیف ہوگی۔ تم درخت پر چڑھو گے۔ گر گئے تو تکلیف ہوگی۔ یہ سب زندگی ہے۔ تکلیف سے نہیں ڈرنا کبھی۔ کسی چیز سے بھی نہیں ڈرنا۔ صرف اللہ سے ڈرنا چاہیے آدمی کو اور موت تو اللہ کا حکم ہے اٹل ہوتا ہے۔ جب اللہ چاہے تو آدمی کو مرنا ہوتا ہے۔''

نوشاد بات کو گھما کر اتنی دور لے گیا تھا کہ عبداللہ موت کو بھول گیا۔ یہ الگ بات کہ موت کا خیال اس کے اندر کہیں گہرائی میں اتر گیا۔ ابا...... اللہ سے تو میں ڈرتا ہوں۔ آپ سے ......اماں سے......اور استادوں سے بھی زیادہ۔ میں بہت ڈرتا ہوں اللہ سے۔''

''بس بیٹے، یہ ایک ڈر سچا ہو تو کوئی اور ڈر نہیں رہتا آدمی کو۔''

عبداللہ گھر واپس آتے ہی سونے کے لیے جا لیٹا۔ تب نوشاد کو زلیخا کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ویسے اس نے آتے ہی محسوس کر لیا تھا کہ زلیخا آج بجھی بجھی سی ہے۔ اب غور سے دیکھا تو اس کی تصدیق ہوگئی۔ وہ کچھ پریشان اور خوف زدہ لگ رہی تھی۔

نوشاد نے مناسب یہی سمجھا کہ صحن میں اس سے بات کر لے۔ زلیخا کا مزاج وہ جانتا تھا۔ جب تک وہ اس پریشانی پر بات نہیں کرے گی، بوجھل رہے گی اور یہ وہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو صرف دکان سنبھالتا تھا۔ گھر کی بہت بڑی ذمے داری تھی......اور وہ زلیخا کو سنبھالنا تھا۔

وہ صحن میں چارپائی پر دراز ہونے لگا تو زلیخا نے کہا۔ ''ابھی سوؤ گے نہیں؟''

''ذرا دیر یہاں لیٹوں گا۔ تم چائے بنا دو۔''

زلیخا نے اسے تکیہ لا کر دیا اور چائے بنا کر لے آئی۔ ''آؤ......تم بھی بیٹھ جاؤ۔'' نوشاد نے اس کے لیے جگہ بنا دی۔ ''اب مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں پریشانی کیا ہے؟'' اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

زلیخا تو بھری بیٹھی تھی۔ رونے لگی۔ نوشاد کو اندازہ ہو گیا کہ معاملہ سنگین ہے۔ بڑی



مشکل سے اس نے زلیخا کو چپ کرایا۔ پھر زلیخا نے اسے مجذوب کا پورا واقعہ سنا دیا۔

نوشاد بہت متحمل مزاج آدمی تھا۔ لیکن وہ سب کچھ سنتے ہوئے اسے زلیخا پر بڑی شدت سے غصہ آیا۔ پھر بھی اس نے خود پر قابو رکھا اور کسی مداخلت کے بغیر اس کی پوری بات سنی۔

''اب تم ہی بتاؤ'' میں پریشان نہ ہوں تو کیا کروں۔'' زلیخا نے کہا۔

''دیوار سے سر پھوڑ لو اپنا۔'' نوشاد نے غصے سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' زلیخا اور پریشان ہوگئی۔

نوشاد کو اس پر ترس بھی آرہا تھا۔ ''دیکھو زلیخا، ان پڑھ ہونا اتنی بڑی برائی نہیں، جتنی جہالت ہے۔''

''لو......ان پڑھ اور جاہل ایک ہی تو ہوتے ہیں۔''

''تم جو جی چاہے مجھے کہہ دیتے ہو۔'' زلیخا نے برا مانتے ہوئے کہا ''بتاؤ تو، میں نے کیا غلط کیا''

''تم نے اس فقیر کی بات کو خوامخواہ اتنی اہمیت دی۔''

''وہ فقیر نہیں، مجذوب تھا......مست۔''

''ایسے پتا نہیں کتنے بنے پھرتے ہیں۔'' نوشاد نے کہا۔ ''غیب کا علم بس اللہ کے پاس ہے۔''

''لیکن مجذوبوں کے منہ سے جو نکل جائے، ہو جاتا ہے۔''

''تو پھر پریشانی کیا ہے۔ جو اس نے کہا، اس پر یقین کر لو۔'' نوشاد نے سرد لہجے میں کہا۔

زلیخا پھر رونے لگی۔ ''تم تو مجھے اور پریشان کر رہے ہو۔''

نوشاد بری طرح جھنجلا گیا۔ مگر اس نے خود کو سنبھالا۔ ''میں تمہیں بتاتا ہوں کہ جہالت کیا ہے۔'' اس نے لہجہ نرم رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہر انسان جانتا ہے کہ ایک دن سب کو مرنا ہے۔ لیکن کس کو کب مرنا ہے' یہ کوئی نہیں جانتا۔ اور مرنے کی کوئی عمر بھی مقرر نہیں کی اللہ نے۔ ایسا نہیں کہ سب بوڑھے ہو کر مرتے ہوں۔ کوئی جوانی میں مرتا ہے تو کوئی بچپن میں۔ اور کوئی بہت بوڑھا کر مرتا ہے۔''

''یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔''

''کیسے جانتی ہو۔ تم تو ان پڑھ ہو۔''

''ارے...... یہ تو دنیا میں نظر آتا ہے۔''

''یہی میں بتا رہا ہوں۔ ان پڑھ اور جاہل میں یہی فرق ہوتا ہے۔ جاہل سب کچھ دیکھتا ہے' اُس سے سمجھتا ہے۔ لیکن کچھ نہیں سمجھتا۔ وقت آنے پر انکار کر دیتا ہے۔ تو جو جان سمجھ کر انکار کرے' وہ جاہل ہے۔''

''میں کیسے جاہل ہوں؟'' زلیخا نے آنکھیں نکالیں۔

''جانتی ہو کہ ہر انسان کی موت کا ایک وقت بھی مقرر ہے اور مقام اور طریقہ بھی...... اس سلسلے میں کوئی کچھ بھی کہے' کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ سچ کہہ رہا ہے یا جھوٹ۔ ہمیں دھیان ہی نہیں دینا چاہیے۔ پھر بھی تم پریشان ہو۔ یہ جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔''

''میں کہہ رہی ہوں کہ مجذوبوں کے منہ سے نکلی بات سچ ہو جاتی ہے۔''

''اب میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ غور سے سنو۔ مجھے پتا ہے کہ موت آنی ہے۔ اور یہ نہیں معلوم کہ کب آنی ہے۔ اب اگر میں اس کے خوف میں مبتلا ہو کر بیٹھ جاؤں تو زندگی معطل ہو جائے گی نا۔ موت سے بدتر ہو جائے گی۔ میں دکان بند کر کے بیٹھ جاؤں۔ مگر نہیں۔ یہی تو اللہ کا کرم ہے کہ اس نے موت کا وقت نہیں بتایا۔ سو یہ زندگی کے کام کرتا رہوں گا۔ زندگی کی دکان بند ہو جائے گی۔ مگر تمہارے رزق کی دکان انشاء اللہ چلتی



رہے گی۔ دنیا کا کاروبار نہیں رکتا کسی کے جانے سے۔ اور پھر دیکھو اللہ صبر بھی تو دیتا ہے۔ میں سوچتا تھا' اماں اور ابا کو کھو کر میں مر جاؤں گا۔ مگر چند دن دکھ رہا۔ اور اب وہ یاد بھی کبھی کبھی آتے ہیں۔

''اور اب یہ سوچو زلیخا کہ مرنے کے بعد آدمی کا دنیا سے واسطہ نہیں رہتا۔ میں زندگی میں تمہاری اور بچوں کی کتنی ہی فکر کروں' مر گیا تو یہ فکر نہیں ہوگی۔ تم سب اپنے اپنے نصیب کی زندگی جیو گے۔ اپنے اپنے حصے کی خوشیاں' دکھ' آرام اور تکلیف اٹھاؤ گے۔ میں نہ کچھ کر سکوں گا' نہ مجھے علم ہوگا اور نہ فکر ہوگی۔ اب یہ بتاؤ کہ ایک دن تمہیں' مجھے' سب کو مرنا ہے نا۔ اور ایک دن عبداللہ کو بھی مرنا ہے۔ ہے نا؟''

''ہاں۔ لیکن عبداللہ کے متعلق میں ایسے نہیں سوچ سکتی۔'' زلیخا نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

''تو یہ تمہارے ایمان کی کمزوری ہے۔ اور مجذوب کی بات پر پکا یقین کر لینا بھی کمزوری ہے۔ یاد کرو' تم بیٹے کے لیے کہاں کہاں نہیں گئیں۔ ہر مزار پر' ہر طرح کے بزرگوں کے پاس۔ لیکن تمہیں بیٹا نہیں ملا۔ اور جب تمہیں صبر آ گیا تو اللہ نے تمہیں یہ عبداللہ دے دیا۔ اللہ نے دیا کہ نہیں۔''

''ہاں جی...... بالکل اللہ پاک نے دیا......''

''اور تم نے پھر بھی سبق نہیں لیا۔ شرک نہیں چھوڑا۔'' نوشاد کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ''اب سوچو' عبداللہ تمہارے پاس امانت ہے اللہ کی۔ اور وہ اپنی امانت جب چاہے' واپس لے لے۔ تمہیں ہنسی خوشی دینا چاہیے۔''

''بس جی' ایسی باتیں نہیں کرو۔ اس سے پہلے میں نہ مر جاؤں۔''

''پھر وہی جہالت کی بات۔ اللہ کی مرضی کے بغیر نہ تم مر سکتی ہو اور نہ عبداللہ ایک سانس جی سکتا ہے۔ اب بات کرتے ہیں اس مجذوب کی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ سچا تھا یا کوئی بہروپیا۔ لیکن تمہاری جگہ میں ہوتا تو اس کے ہاتھ چومتا' اس کا منہ مٹھائی سے بھر

دیتا اور جو کچھ بھی میرے پاس ہوتا' اس کے قدموں میں رکھ دیتا۔ کیونکہ اس نے دو بڑی خوش خبریاں سنائی تھیں تمہیں۔''

زلیخا پھر رونے لگی۔ ''تمہارا تو دل پتھر کا ہے۔ میں جانتی ہوں' تمہیں عبداللہ سے بھی محبت نہیں ہوئی۔ غضب خدا کا۔ مجذوب کی اس بات کو خوش خبری کہتے ہو۔''

اب نوشاد کا تحمل جواب دینے لگا۔ اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''ارے جاہل عورت...... خوش خبری نہیں سمجھتی۔ اس نے یہی کہا تھا نا کہ تیرا بیٹا شہید ہوگا۔ بڑے مرتبے والا ہے۔ یہی کہا تھا نا؟''

''ہاں جی۔ مگر شہادت بھی تو موت ہی ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ۔'' نوشاد نے پھنکار کر کہا۔ اس کے لیے تحمل قائم رکھنا دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔ ''موت برحق ہے۔ مگر اس میں بھی عزت اور ذلت کا فرق ہے۔ موت تو ولیوں' پیغمبروں کو بھی آئی اور فرعون' نمرود اور شداد کو بھی۔ تجھے فرق نظر نہیں آتا۔ موت تو آنی ہے۔ اپنے وقت پر آئے گی۔ کوئی برا کام کرتا ہوا مرے' پھانسی پائے تو دنیا تھوتھو کرتی ہے اس پر۔ اور کوئی اللہ کی راہ میں لڑتا ہوا مرے تو سعادت ہے۔ خود اللہ کہتا ہے کہ وہ صرف دنیا والوں کے لیے مرا ہے۔ ورنہ درحقیقت وہ زندہ ہے اور اس کا رزق جاری ہے۔ اور تو ناشکری شکر کے مقام پر کفر کرتی ہے۔ میرا بھی ستیاناس کرائے گی اور بچوں کا بھی۔''

کچھ تو شوہر کے جلال کا اثر ہوتا اور کچھ اس کی بات کا۔ زلیخا لرز کر رہ گئی۔ سہم کر بولی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو جی۔ میں سمجھ گئی تمہاری بات۔ پر اس دل کا کیا کروں۔ ماں کا دل ہے نا۔''

''ماں کا دل ہی تو سب سے بڑا ہوتا ہے۔ ایسی بھی مائیں ہوتی ہیں کہ سات بیٹوں کو جہاد پر بھیج دیا۔ ساتوں شہید ہوگئے۔ پھر وہ روئیں...... بیٹوں کی شہادت پر نہیں۔ اس پر کہ اللہ کی راہ میں لڑنے کے لیے اب کوئی بیٹا نہیں رہا۔ وہ سوچتی ہیں کہ کاش ایک



اور بیٹا ہوتا۔ اللہ کے ہاں رتبہ ایسے ہی نہیں ملتا۔''

زلیخا رونے لگی۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو جی۔ میں توبہ کرلوں گی۔ اللہ معاف کرنے والا ہے۔''

اب نوشاد نے اُس کے زخم پر مرہم رکھنے کا سوچا۔ ''اور تم نے یہ نہیں پوچھا کہ مجذوب نے دوسری خوشخبری کیا دی۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''تم بتاؤ نا۔'' زلیخا نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

''وہ بہت بڑی اور کھلی خوش خبری ہے۔'' نوشاد نے کہا۔ ''تم ہوش میں رہ کر غور کرتیں تو سمجھ میں آتی۔ اس نے کہا تھا کہ عبداللہ بڑے مرتبہ والا ہے...... شہادت پائے گا۔ تو اللہ کی بندی' شہید ہونے کے لیے جوان ہونا تو ضروری ہے نا۔ اور شہادت بڑی عمر میں بھی مل سکتی ہے۔ تو کیا یہ خوش خبری نہیں کہ اللہ پاک انشاء اللہ عبداللہ کو بڑی عمر دیں گے۔''

زلیخا بچوں کی طرح خوش ہوگئی۔ ''ہاں...... یہ بات تو ہے۔ سچ کہتے ہو تم۔ میں واقعی بہت جاہل ہوں۔ میں نے بڑی زیادتی کی اس مجذوب کے ساتھ۔ اسے کچھ دیا بھی نہیں۔ اتنی بڑی خوش خبری سنائی تھی اس نے۔''

''زیادتی تم نے اپنے اور عبداللہ کے ساتھ کی۔ اگر وہ سچا مجذوب تھا تو اسے کچھ چاہیے بھی نہیں تھا تم سے۔ تم نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا۔''

''بس غلطی ہوگئی۔ اور وہ سچا مجذوب تھا جی۔ اس نے صرف ایک نوالہ کھایا تھا اور ایک عبداللہ کو کھلایا تھا۔ مگر عبداللہ کے ساتھ میں نے کیا زیادتی کی؟''

''تم نے اس کے دل میں موت کا ڈر بٹھا دیا۔ یہ ڈر آسانی سے نہیں نکلے گا۔''

زلیخا نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی۔ اس کا بوجھ ہلکا ہوگیا تھا۔ اب وہ پرسکون تھی۔ سکون سے سو سکتی تھی۔

سات سالہ عبداللہ کی نفسیات، اس کی شخصیت، بلکہ اس کی زندگی ہی تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ لڑنے والا بچہ تو کبھی نہیں رہا تھا۔ بلکہ وہ صلح جو تھا۔ لیکن ہاتھ پاؤں کا مضبوط تھا۔ کاٹھی بھی اچھی تھی۔ کسی کی زیادتی وہ بھی برداشت نہیں کرتا تھا۔ اور لڑنے سے وہ بچتا تھا۔ مگر ڈرتا ہرگز نہیں تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ لڑنے کا لفظ اس کی لغات امکان سے یکسر خارج ہو گیا تھا۔ اسکول میں بچوں کے درمیان لڑائیاں بھی ہوتی ہیں۔ بچے ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی بھی کرتے ہیں۔ اگر کوئی دبو ہو، زیادتی سہنے لگے تو اس کے ساتھ سبھی بڑھ چڑھ کر زیادتی کرنے لگتے ہیں۔ عبداللہ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ کلاس کے لڑکے اسے دبانے لگے۔ اس کی پنسلیں اور ربر اس سے چھیننے لگے۔

ایک شام کو وہ اسکول کا کام کرنے بیٹھا تو اس نے اماں سے کہا۔ ''اماں...... مجھے پینسل چاہیے۔ اسکول کا کام کرنا ہے۔''

''ابھی کل ہی تو پنسل دی تھی تمہیں۔ وہ کیا ہوئی؟'' زلیخا نے حیرت سے پوچھا۔

عبداللہ نے نظریں جھکائیں اور دبے دبے لہجے میں بولا۔ ''بستے میں سے گر گئی کہیں۔''

پنسل یا اسٹیشنری کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ گھر کی دکان تھی۔ جنرل اسٹور تھا۔ نوشاد اسٹیشنری کا سامان بھی رکھتا تھا۔ پنسل کا ایک باکس اس نے زلیخا کو دے دیا تھا کہ جب کسی کو ضرورت ہو، دے دے۔ زلیخا نے دیکھا کہ باکس خالی ہو چکا تھا۔ اس نے کہا۔ ''جا کر دکان سے لے آؤ۔''

عبداللہ باہر چلا گیا۔ مگر زلیخا سوچتی رہی۔ اسے خیال آ رہا تھا کہ پنسلوں کا ڈبہ بہت جلدی ختم ہو گیا ہے۔ اب لڑکیوں کو تو پنسلوں کی ضرورت کم ہی پڑتی تھی۔ تقریباً پورا ڈبہ عبداللہ نے ہی ختم کر دیا تھا۔ یہ کیا بات ہے آخر۔



عبداللہ آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پنسل تھی اور ایک پنسلوں کا ڈبہ۔ ڈبہ اس نے ماں کی طرف بڑھایا۔ ''یہ ابا نے دیا ہے۔''

زلیخا نے فیصلہ کر لیا کہ اس بار پورا دھیان رکھے گی۔

ایک ہفتے میں تین بار عبداللہ کی پنسل کھوئی تو زلیخا کو تشویش ہونے لگی۔ ''یہ تم پنسلوں کا کیا کرتے ہو آخر؟'' اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''گر جاتی ہیں اماں۔'' عبداللہ نے معصومیت سے کہا۔

''ہر روز؟''

''روز تو نہیں اماں۔ کبھی کبھی گر جاتی ہیں۔''

زلیخا کی تشویش اور بڑھ گئی۔ وہ کوئی غیر ذمے دار بچہ نہیں تھا۔ ضرور کوئی بات ہے۔ کہیں یہ بیچ تو نہیں دیتا پینسلیں۔ اس نے سوچا۔ سوچتا ہو کہ پنسل تو مل ہی جائے گی۔ اور پیسے کھا جاتا ہو۔ کوئی چاٹ، کوئی لت تو نہیں پڑ گئی اسے۔ پنسل کی تو کوئی بات نہیں۔ لیکن اس عمر کی بری عادتیں مشکل ہی سے چھوٹتی ہیں۔

اس نے سخت لہجے میں عبداللہ سے کہا۔ ''دیکھو عبداللہ، یہ پنسلیں دکان سے مفت نہیں آتی ہیں۔ تمہارے ابا پیسوں سے خرید کر لاتے ہیں۔ اب ایک ہفتے سے پہلے مجھ سے پنسل نہ مانگنا۔''

اس کے بعد دو دن خیریت سے گزر گئے۔ عبداللہ نے پنسل نہیں مانگی۔ تیسرے دن شام کے وقت وہ اس کا منہ دھلا رہی تھی کہ اس کے ہاتھ پر نظر پڑ گئی۔ وہ لرز کر رہ گئی۔ ''ادھر دکھاؤ اپنے ہاتھ۔''

عبداللہ ہاتھوں کو چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن زلیخا نے زبردستی اس کے ہاتھ اپنے سامنے پھیلا لیے۔ ان پر صاف نیل پڑے ہوئے تھے اور سوجن بھی تھی۔ وہ اُس کے ہاتھ دیکھ کر تڑپ گئی۔ ''یہ کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں اماں۔ گر گیا تھا۔ رگڑ لگ گئی۔''

مگر نیلی دھاریاں کچھ اور ہی بتا رہی تھیں۔ اور زلیخا کوئی بچی نہیں تھی۔ "یہ رگڑ کے نشان نہیں ہیں۔ سچ بتا' کیا ہوا ہے؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں اماں۔"

"نہیں۔ میں نہیں مان سکتی۔ سچ بتا۔ ورنہ انہی ہاتھوں پر اور ماروں گی۔"

عبداللہ ڈر گیا۔ "وہ اماں...... وہ...... ماسٹر جی نے مارا تھا بید سے۔"

زلیخا بپھر گئی۔ "اس ماسٹر کو تو میں کچا چبا جاؤں گی۔ خون پی جاؤں گی اس کا۔"

"نہیں اماں۔" عبداللہ نے جلدی سے کہا۔ "ابا کہتے ہیں' استاد کا حق باپ سے زیادہ ہوتا ہے۔ ابا خفا ہوں گے آپ سے۔"

زلیخا ڈر گئی۔ یہ بات سچ تھی۔ نوشاد بہت خفا ہوتا۔ لیکن ایسے بے درد ماسٹر کو یوں چھوڑ دینا بھی اچھی بات نہیں۔ اگلی بار تو وہ کم بخت کھال ہی اتار دے گا بچے کی۔ یہ سب سوچتے ہوئے اچانک اسے خیال آیا کہ ماسٹر صاحب نے عبداللہ کو بلا وجہ تو نہیں مار ہوگا۔ کوئی دشمنی تو نہیں ہے نا۔ کوئی بات ہوگی۔ کوئی بدتمیزی کی ہوگی اس نے۔ "اچھا ...... کس بات پر مارا ہے ماسٹر صاحب نے؟" اُس نے پوچھا۔

عبداللہ گڑبڑا گیا۔ چند لمحے بعد اُس نے کہا۔ "بچے شور مچا رہے تھے اماں۔ کس نے میرا نام لے دیا۔"

زلیخا ان پڑھ ضرور تھی۔ مگر ناسمجھ نہیں تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ عبداللہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اور یہ بہت بری بات تھی۔ وہ جھوٹ بولنے والا بچہ نہیں تھا۔ اب اُس سے سچ بھی اگلوانا تھا۔ اُس نے بہت سخت لہجے میں کہا۔ "تمہارے ابا کچھ بھی کہیں۔ میں تمہارے ماسٹر سے جا کر ضرور پوچھوں گی کہ بلا وجہ اتنی بیدردی سے مارنے کا حق انہیں کس نے دیا ہے۔"

عبداللہ گھبرا گیا۔ "نہیں اماں' اس کی ضرورت نہیں۔ ماسٹر صاحب کی کوئی غلطی نہیں تھی۔"



زلیخا نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ "تو پھر تمہاری غلطی ہوگی۔ سچ سچ بتا دو۔ ورنہ میں ماسٹر صاحب کے پاس ضرور جاؤں گی۔"

عبداللہ چند لمحے ہچکچاتا رہا۔ پھر بولا۔ "جی اماں' غلطی میری تھی۔ میں نے گھر کا کام نہیں کیا تھا۔"

"کیسے نہیں کیا تھا۔ کیوں نہیں کیا۔ روز تو کام کرنے بیٹھتے ہو تم۔" زلیخا کو پہلی بار اپنے ان پڑھ ہونے پر افسوس ہونے لگا۔

"وہ...... اماں...... پنسل نہیں تھی نا میرے پاس۔"

"ہیں...... پنسل نہیں تھی۔ کیوں؟" زلیخا ہکا بکا رہ گئی۔ "اس دن جو پنسل دی تھی میں نے۔"

"وہ گر گئی تھی اماں۔" عبداللہ نظریں چرانے لگا۔

دیکھو عبداللہ۔ یہ بہت بری بات ہے کہ تم باقاعدہ جھوٹ بولنے لگے ہو۔" زلیخا نے بہت سخت لہجے میں کہا۔ "جھوٹے کو اللہ جہنم میں جلاتے ہیں۔" "اگر تم نے جھوٹ بولا تو میں تمہارے جسم پر گرم گرم چمٹا رکھ دوں گی۔ سچ سچ بتاؤ' وہ پنسل کہاں گئی؟"

"وہ اماں اصغر نے مجھ سے چھین لی تھی۔"

پلک جھپکتے میں بات زلیخا کی سمجھ میں آ گئی۔ اسے عبداللہ پر ترس آنے لگا۔ اور وہ حیران بھی ہوئی۔ "تم نے کیوں چھیننے دی اسے پنسل؟"

"میں لڑنا نہیں چاہتا اماں۔"

"تو ماسٹر صاحب کو بتا دیتے۔ وہ تمہیں پنسل واپس دلا دیتے۔"

"معاف کر دینا زیادہ اچھا ہوتا ہے اماں۔ اس سے دشمنی پیدا نہیں ہوتی۔" عبداللہ نے بڑوں کے سے انداز میں کہا۔ وہ بہت ذہین بچہ تھا۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ شکایت کرنے سے پنسل مل جائے گی۔ لیکن چھٹی کے بعد اصغر اُس سے لڑائی کرے گا اور اُسے مارے گا۔ اور وہ لڑنا نہیں چاہتا۔

''اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ دوسرے تمہارے ساتھ زیادتی کریں تو تم انہیں روکو بھی نہیں۔''

''اماں...... میں تمہیں دکھ نہیں دینا چاہتا۔ میں کسی سے کبھی نہیں لڑوں گا۔''

زلیخا کو اُس پر ترس آیا اور خود پر غصہ۔ نوشاد نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اب اُس کا ڈر آسانی سے نہیں نکلے گا۔ بے چارہ معصوم، مظلوم بچہ۔ اُس نے منع کر دیا تھا۔ سو وہ اس سے پنسل نہیں مانگ سکتا تھا۔ اور لڑائی کے ڈر سے ماسٹر صاحب سے شکایت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے کام نہ کرنے پر پٹائی گوارا کر لی۔

اور اُس نے نہ دیکھا ہوتا تو شاید پورے ہفتے پٹتا رہتا۔ نئی پنسل ملنے تک۔

''تو آج بھی اسکول کا کام نہیں کیا تم نے؟'' اُس نے پوچھا۔

''کیا کروں اماں۔ پنسل جو نہیں ہے۔''

''اور کل بھی پٹائی ہوگی؟''

عبداللہ نے جواب دینے کے بجائے سر جھکا لیا۔

''اس سے پہلے بھی لڑکے تجھ سے پنسلیں چھینتے رہے ہیں؟'' زلیخا نے پوچھا۔

''جی ہاں اماں۔ پنسلیں بھی اور ربر بھی۔''

''کون کون ہیں۔ نام بتا مجھے۔ اور دیکھ جھوٹ نہ بولنا۔ ورنہ اللہ میاں تجھے بعد میں جلائیں گے۔ میں ابھی جلا دوں گی۔''

عبداللہ نے گھبرا کر چار پانچ لڑکوں کے نام گنوا دیئے۔ پھر بولا۔ ''شکایت نہ کر اماں......''

''تجھ پر سے میں ہزاروں پنسلیں قربان کر سکتی ہوں۔ لیکن زیادتی برداشت نہیں کر سکتی۔ تو فکر نہ کر۔ اب کسی کو اتنی جرات نہیں ہوگی۔'' زلیخا نے کہا۔ پھر وہ اٹھ کر گئی اور اسے پنسل لا کر دی۔ ''لے...... کام کر لے اسکول کا۔ پٹنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آئندہ کبھی کسی قیمت پر جھوٹ نہ بولنا۔ جھوٹے پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے۔''



عبداللہ کام کرنے تو بیٹھ گیا۔ لیکن زلیخا دیکھ رہی تھی کہ وہ سہما ہوا ہے۔ اُس نے سوچا، کوئی بات نہیں۔ کل یہ ڈر نکل جائے گا۔

اگلے روز زلیخا عبداللہ کے ساتھ اسکول گئی اور اُس کے ٹیچر سے ملی۔ ٹیچر نے کہا۔

''مجھے تو اس نے کبھی بتایا ہی نہیں۔''

''دل کا نرم ہے۔ نہیں چاہتا کہ دوسروں کی پٹائی ہو۔ خود پٹ لیتا ہے۔''

''نہیں بی بی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ پچھلے دو مہینوں سے یہ کچھ بدلا بدلا لگتا ہے۔ خیر آپ فکر نہ کریں۔ میں دیکھ لوں گا۔''

''اور آئندہ یہ کام کر کے نہ لائے تو اسے مارنے کے بجائے مجھے بلوا لیجئے گا۔ یہ کوئی بدشوق بچہ نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''

زلیخا نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ وہ چھٹی کے وقت بھی اسکول گئی۔ بچے اسکول سے نکلے تو وہ ان بچوں سے خود ملی، جن کا عبداللہ نے نام لیا تھا۔ ''غور سے سن لو میری بات۔'' اُس نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''اگر اب کسی نے عبداللہ سے کچھ چھینا یا اسے تنگ کیا تو میں اُس کی ٹانگیں توڑ دوں گی۔ اور عبداللہ کو بھی گیا گزرا نہیں سمجھنا۔ میں نے لڑنے سے منع کر رکھا ہے اسے۔ ورنہ یہ خود بھی تمہیں ٹھیک کر سکتا ہے۔''

لڑکوں کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ خود بھی یہ بات جانتے اور سمجھتے ہیں۔ بس عبداللہ کے دبنے کی وجہ سے وہ شیر ہو گئے تھے۔ اب انہیں پتا چل گیا ہے کہ عبداللہ ماں کی ممانعت کی وجہ سے دبتا تھا۔ ورنہ وہ اب بھی انہیں ٹھیک کر سکتا ہے۔

یوں اس مسئلے کا تو تدارک ہو گیا۔ لیکن زلیخا کو پتا چلا کہ مسائل اور بھی ہیں۔ اور وہ پتا بھی یوں چلا کہ اب وہ اس پر گہری نظر رکھ رہی تھی۔ ٹیچر کی بات نے کہ وہ بدل گیا ہے، اسے چوکنا کر دیا تھا۔ وہ سمجھنا چاہتی تھی کہ بچے میں کس قسم کی تبدیلیاں آئی ہیں...... اور اسے اس سلسلے میں کیا کرنا ہے۔

اور مشاہدہ کرنے پر وہ حیران رہ گئی۔ عبداللہ بہت بدل چکا تھا۔ وہ تو وہ بچہ رہا ہی نہیں تھا' جو وہ کبھی تھا۔ درختوں پر چڑھ کر پھل توڑنا' دیوار کے ذریعے چھت پر چلے جانا اُس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اُس کے جسم میں بلا کی لچک تھی۔ پاس پڑوس کی عورتیں تو اسے بندر کہتی تھیں۔ دو سال پہلے اشفاق کے امی اور ابا دو بڑی بیٹیوں کے ساتھ کسی شادی میں گئے تھے۔ گھر میں اشفاق چھوٹی بہن کے ساتھ تھا۔ ان لوگوں کو شادی سے واپسی میں دیر ہوگئی۔ دس بج گئے تھے۔ وہ واپس آئے تو اشفاق اور چھوٹی بہن دونوں سو چکے تھے۔ وہ لوگ دروازہ پیٹ پیٹ کر تھک گئے۔ پورا محلہ جمع ہوگیا۔ لیکن سونے والے تو جیسے گھوڑے بیچ کر سوئے تھے۔ گھر کی چھت پر پتھر تک مارے گئے۔ لیکن اُن دونوں میں سے کوئی بھی نہیں جاگا۔

عبداللہ بھی سو چکا تھا۔ لیکن دروازہ پیٹے جانے کے شور سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔ وہاں محلے کے لوگوں کے درمیان نوشاد اور زلیخا بھی موجود تھے۔

عبداللہ کو دیکھتے ہی نجمہ نے اشفاق کی امی سے کہا۔ ''لو بھئی تمہارا مسئلہ حل ہوگیا۔ عبداللہ آ گیا ہے۔''

اس پر نوشاد نے چونک کر نجمہ کو دیکھا۔ ''عبداللہ کیا کرلے گا؟''

''دیوار پر چڑھ کر اندر کود دے گا اور دروازہ کھول دے گا۔''

نوشاد نے دیوار کو غور سے دیکھا۔ وہ کافی اونچی تھی۔ چنائی بھی بہت اچھی کی گئی تھی۔ اینٹوں کے درمیان جہاں سیمنٹ کا بسالہ لگایا جاتا ہے' وہاں رخنے تو تھے۔ لیکن ایسے نہیں کہ ہاتھوں کے لئے گرفت کے یا ٹھیک طرح سے پاؤں جمانے کے کام آئیں۔ دیوار پر چڑھنا آسان ہوتا تو وہاں کئی لڑکے موجود تھے۔ اب تک کوئی یہ کام کرچکا ہوتا۔ ''اتنی اونچی دیوار پر عبداللہ کیسے چڑھے گا۔ یہ تو خطرناک ہے۔'' اُس نے گھبرا کر کہا۔



''ارے بھائی صاحب' یہ عبداللہ بہت تیز ہے ان کاموں میں۔ اس سے اونچی اور مشکل دیوار ہو تو بھی چڑھ جائے۔'' ایک اور عورت بولی۔

کئی لوگوں نے اس کی تائید کی۔ ''نوشاد بھائی' یہ تو کھجور کے درخت پر بھی چڑھ جاتا ہے۔''

عبداللہ سو کر اٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں بات نہیں آ رہی تھی۔ ''اماں ...... کیا ہوا ہے؟''

''ارے بھائی صاحب' یہ عبداللہ بہت تیز ہے ان کاموں میں۔ اس سے اونچی اور مشکل دیوار ہو تو بھی چڑھ جائے۔'' ایک اور عورت بولی۔

کئی لوگوں نے اس کی تائید کی۔ ''نوشاد بھائی' یہ تو کھجور کے درخت پر بھی چڑھ جاتا ہے۔''

عبداللہ سو کر اٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں بات نہیں آ رہی تھی۔ ''اماں ...... کیا ہوا ہے؟''

''بیٹا...... دروازہ اندر سے بند ہے۔ اور اشفاق گہری نیند سو رہا ہے۔'' زلیخا نے بتایا۔

عبداللہ کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا۔ اشفاق کی امی نے کہا۔ ''تُو دیوار پر چڑھ کر اندر کود جا بیٹے اور دروازہ کھول دے۔''

اب بات پوری طرح عبداللہ کی سمجھ میں آ گئی۔ اُس نے چپلیں اتاریں اور پائینچے چڑھانے لگا۔

نوشاد گھبرا رہا تھا۔ لیکن دوسرے لوگ عبداللہ کے سلسلے میں پراعتماد تھے۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے بیٹے سے ٹھیک طرح سے واقف ہی نہیں ہے۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ زلیخا نے اُسے تسلی دی۔ ''فکر مت کرو جی۔ عبداللہ یہ کام کرسکتا ہے۔''

عبداللہ نے دیوار پر چڑھنا شروع کیا تو نوشاد نے دم سادھ لیا۔ لیکن اسے عبداللہ کی پھرتی پر واقعی حیرت ہوئی۔ وہ محض لمحوں میں دیوار پر چڑھ گیا تھا' جیسے وہ کوئی ہموار دیوار نہ ہو' سیڑھی ہو۔ اوپر چڑھ کر وہ ایک پل دیوار پر اکڑوں بیٹھا۔ پھر دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔

نوشاد کا گھبراہٹ سے برا حال تھا۔ دھپ کی آواز سے وہ اور گھبرا گیا۔ کہیں عبداللہ بے تکا نہ گر گیا ہو۔ مگر اگلے ہی لمحے عبداللہ نے دروازہ کھول دیا۔ پھر وہ اپنے گھر میں یوں چلا گیا' جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔

گھر آ کر نوشاد نے دیکھا۔ عبداللہ سو چکا تھا۔ ''یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔'' اُس نے زلیخا سے کہا۔ ''تم اسے روکتی کیوں نہیں۔''

''پہلے میں بھی ڈرتی تھی۔ مگر وہ قدرتی طور پر ایسا ہے۔ اللہ نے اسے بنایا ہی ایسا ہے۔'' زلیخا نے اُسے سمجھایا۔

''پھر بھی...... اگر گر جائے تو......؟''

'وہ سنتا ہی کہاں ہے۔ روز کسی نہ کسی درخت پر چڑھ کر پھل توڑتا ہے۔''

اور یہ سچ تھا۔ اور دیوار پر چڑھ کر چھت پر جا بیٹھنا بھی عبداللہ کا روز کا معمول تھا۔ مگر اب وہ سوچ رہی تھی کہ بہت دنوں سے عبداللہ چھت پر نہیں چڑھا ہے۔ اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ آخری بار ایسا کب ہوا تھا۔ لیکن اسے یاد نہیں آیا۔ یہ بہر حال وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ مجذوب والی بات کے بعد سے اُس نے عبداللہ کو چھت پر نہیں دیکھا ہے۔

دو تین دن کے مشاہدے کے نتیجے میں زلیخا پر یہ افسوس ناک انکشاف ہوا کہ جس بیٹے کو پانے کے لئے اُس نے ہزار جتن کئے تھے' کہاں کہاں ماری ماری پھری تھی' جو اُس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھا' وہ اُس کی طرف سے بے پروا



ہو چکی ہے۔ یہ تو مجرمانہ غفلت ہی ہوئی نا کہ وہ اپنے تمام معمولات ترک کر چکا ہے اور اسے اب تک اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا۔

اسے یاد تھا کہ عبداللہ اسکول سے آنے کے بعد ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھاتا اور پھر ایک گھنٹے کے لئے سو جاتا۔ سو کر اٹھتے ہی وہ اسکول کا کام کرتا۔ پھر وہ اس کے پاس آتا۔ ''اماں...... میں کھیلنے کے لئے چلا جاؤں؟''

''چلا جا۔ لیکن زیادہ دور نہ جانا۔ اور ہاں' مغرب سے پہلے گھر آ جانا۔ تیرے ابا کا سخت حکم ہے یہ۔''

''آپ فکر نہ کریں اماں۔ میں مغرب سے پہلے واپس آ جاؤں گا۔''

یہ اُس کا روز کا معمول تھا۔ اور اب کچھ عرصے سے اُس نے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کبھی نکلتا بھی تو دس پندرہ منٹ میں واپس آ جاتا۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کیسی غیر ذمہ دار ماں ہے۔ بیٹے کی اتنی بڑی تبدیلیاں اسے نظر نہیں آئیں۔

اُس نے سوچا کہ اب وہ بیٹے سے بات کرے گی۔ وہ اسے اکسائے گی کہ وہ اپنے معمولات پر آ جائے۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ زندگی سے دور ہو گیا ہے۔ لیکن عجیب بات تھی کہ اسے مجذوب یاد آتا تو اُس کی کہی ہوئی بات بھی یاد آتی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں ہول اٹھنے لگتے۔

ایک بات طے تھی۔ جانتی تھی کہ وہ بیٹے سے موت کے بارے میں اب کبھی بات نہیں کر سکے گی۔

❁......❁......❁

کسی کو احساس ہو یا نہ ہو' عبداللہ کو اپنے تبدیل ہونے کا مکمل ادراک تھا! وہ جانتا تھا کہ ایک شام اور اس کے بعد آنے والی صبح کے درمیان وہ پوری طرح بدل گیا تھا۔ جو وہ تھا' وہ نہیں رہا تھا۔ اور جو وہ نہیں تھا' وہ ہو گیا تھا۔

اس بابا کو وہ کبھی نہیں بھول سکا۔ اس کی صورت اُس کے حافظے پر نقش ہو گئی تھی۔ اُس کا خیال آتا تو اُس کا چہرہ...... جیتا جاگتا' سانس لیتا چہرہ اس کے تصور میں ابھر آتا۔ یہی نہیں' اسے اس کی کہی ہوئی ہر بات یاد تھی...... لفظ بہ لفظ۔ وہ بھی جو اُس نے گھر کے صحن میں بیٹھ کر کہا تھا اور وہ بھی جو اُس نے گلی میں کہا تھا۔ اُس کی پکار...... پھر نجمہ خالہ سے اس کی دو باتیں؟ وہ سب اسے یاد تھا۔ مگر بہت عرصے تک وہ بابا کی صرف اس گفتگو میں الجھا رہا' جو اُس نے اُس کے متعلق کی تھی...... اور بابا کی باتوں سے زیادہ اہم اُس کے لئے اماں کا ردِ عمل تھا۔

وہ اُس روز سہم گیا تھا۔ اس بابا میں عجیب سا جلال تھا...... ہیبت تھی۔ اُس سے خوف آتا تھا۔ اُس کے سامنے اسے اُس کا دیا ہوا نوالہ کھانے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ بس جیسے تیسے اُس نے حلق سے اتار لیا تھا۔ اور جب بابا گھر سے رخصت ہوا تو اُس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ لیکن اندر ایک افسوس بھی تھا...... اس بات پر کہ بابا خفا ہو کر گیا تھا۔ کاش...... کاش وہ ہنسی خوشی چلا جاتا۔ نجانے کیوں اسے لگتا تھا کہ یہ بات بہت اہم تھی۔ بہر حال بات برابر کی تھی۔ پہلے بابا نے اماں کو خفا کیا تھا۔ پھر اماں نے بابا کو۔ لیکن اماں فوراً ہی منتیں کرنے لگی تھیں۔ جبکہ بابا سخت ہو گیا تھا۔

اُس رات عبداللہ سونے کے لئے لیٹا تو اُس کا ذہن نہ چاہتے ہوئے بھی خود کار انداز میں ان تمام باتوں کو دہراتا رہا۔ اور وہ ان باتوں پر سوچتا رہا۔ بابا نے شہادت کی خبر یوں دی تھی' جیسے وہ خوش خبری ہو۔ اس سے پہلے انہوں نے کہا تھا...... قسمت کا دھنی تو ہے یہ بچہ۔ لیکن اماں کے نزدیک وہ منحوس خبر تھی۔

اماں نے کہا تھا کہ شہادت موت ہی ہوتی ہے۔ لیکن دادا اور دادی شہید نہیں ہوئے تھے۔ مرے تھے۔ اور سب لوگوں کہتے تھے کہ وہ بہت سکون سے مرے



ہیں۔ دیکھو تو چہرے پر مسکراہٹ ہے۔ اور رونق کیسی ہے۔ کتنے خوب صورت لگ رہے ہیں۔ لگتا ہے' سو رہے ہیں۔ سب آنے والوں نے انہیں دیکھ کر اسی طرح کے جملے کہے تھے۔ تو وہ آرام سے مر گئے تھے۔

اور اماں نے بتایا تھا کہ شہادت اور موت میں بس یہ فرق ہے کہ شہادت میں آدمی لڑتا ہے اور زخموں سے چور ہو کر مرتا ہے۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ نہ وہ کبھی لڑے گا اور نہ زخموں سے چور ہو کر مرے گا۔ اور ابا نے کہا تھا کہ موت اللہ کا اٹل حکم ہے۔ مرنے پر کسی کا اختیار نہیں۔ یہ سن کر اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ سکون سے مرے گا۔ شہید ہونا مناسب نہیں۔

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔ اُس نے خواب دیکھا۔ اور وہ بڑا جیتا جاگتا خواب تھا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ بیک وقت کئی افراد سے لڑ رہا ہے۔ اور ان سب کے ہاتھوں میں مختلف ہتھیار ہیں۔ سب سے پہلے اسے تلوار کا زخم بازو پر لگتا ہے۔ وہ درد سے چلاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اب میں مر جاؤں گا۔ لیکن وہ نہیں مرتا۔ پھر تلوار اُس کے دوسرے بازو پر لگتی ہے۔ وہ درد اور تکلیف سے تڑپتا ہے۔ لیکن اب بھی نہیں مرتا۔ اس کے بعد تیسرا شخص اسے نیزہ مارتا ہے' جو سینے پر لگتا ہے۔ وہ گر پڑتا ہے۔ اب سب اسے مسلسل مار رہے ہیں۔ تلوار سے' نیزے سے' لاٹھی سے اس کے جسم کے مختلف حصوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ وہ زخموں سے چور ہو گیا ہے۔ وہ چلا رہا ہے کہ میں مر جانا چاہتا ہوں...... سکون سے...... آرام سے۔ لیکن دشمنوں کا ہر وار اس کی تکلیف میں اضافہ کر رہا ہے۔ پھر ایک شخص آتا ہے اور وہ پستول سے اس کے سینے پر فائر کرتا ہے۔ وہ لہولہان ہے۔ اُس کی جان نہیں نکل رہی ہے......

اسی کیفیت میں اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُس کا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ دل

سینے میں دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ بھنچے ہوئے ہونٹوں سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ چیخنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ اُس کے بس میں نہیں تھا۔

وہ برابر میں سوئے ہوئے ابا کو جگانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ ہلنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ بہت دیر تک وہ بے بس پڑا رہا۔ اُس کا ذہن بس ایک بات کی تکرار کئے جا رہا تھا۔ میں کبھی کسی سے نہیں لڑوں گا۔ میں شہید نہیں ہوں گا۔

پھر نجانے کب اسے نیند آ گئی۔

اس دن سے وہ بالکل بدل گیا۔ چوٹ لگنے سے وہ گھبرانے لگا۔ تکلیف کے خیال سے اسے پسینے آ جاتے تھے۔ اس کے نتیجے میں اس کی زندگی' اس کا سب کچھ بدل کر رہ گیا۔ لڑائی جھگڑے کے لئے تو اس کے اندر بہت شدید مزاحمت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ بات نہیں کہ وہ کوئی جھگڑالو بچہ تھا۔ مگر ضرورت کے وقت لڑنے سے وہ بالکل نہیں گھبراتا تھا۔ ایک اور بات اُس کی فطرت میں تھی۔ وہ کسی پر زیادتی ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایسے مظلوم کی مدد کرنا وہ فرض سمجھتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر کوئی کمزور ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی طاقتور اسے دبائے' اس کے ساتھ زیادتی کرے۔ کلاس میں کوئی بچہ کسی بچے کے ساتھ زیادتی کرتا تو وہ میدان میں اتر جاتا۔

یہاں تک کہ ٹیچر کسی بچے کو غلط ڈانٹتے تو وہ خاموش نہیں رہ پاتا تھا۔ ''سر...... ذیشان کی کوئی غلطی نہیں۔ یہ آواز صدیق نے نکالی تھی۔''

اور وقفے میں صدیق اُسے پکڑتا۔ ''تم نے میری شکایت لگائی۔''

''میں نے شکایت نہیں لگائی۔ سچ بولا ہے۔'' وہ بے پروائی سے کہتا۔ ''بے چارے ذیشان کو بلاوجہ ڈانٹ پڑ رہی تھی۔''

ایسے میں صدیق بات آگے بڑھاتا تو عبداللہ لڑنے کو تیار ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ



نکلا کہ کلاس کے شریر لڑکے اس کے حریف بن گئے۔ لیکن وہ اس سے ڈرتے بھی تھے۔

مگر اب وہ بدل گیا۔ یہ الگ بات کہ اُس کے ہم جماعتوں کو فوری طور پر اس تبدیلی کا احساس نہیں ہوا۔ پھر ایک دن پول کھل گئی۔ ہوا یوں کہ مشتاق نے فاروق کے شارپنر پر قبضہ کر لیا۔ دونوں میں بحث ہو رہی تھی' ''اچھا' تمہارا ہے تو اس کی کوئی نشانی بتاؤ۔'' مشتاق نے چیلنج کیا۔

''ہاں...... اس کے کٹر کے اوپر ایک لکیر پڑی ہے۔'' فاروق نے جھٹ کہا۔

اور شارپنر پر واقعی اسی جگہ ایک خراش تھی۔ مگر مشتاق ہٹ دھرمی پر اتر آیا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ شارپنر بس میرا ہے۔''

عبداللہ سب کچھ سن رہا تھا اور خاموش تھا۔ فاروق نے مدد کے لئے اُس کی طرف دیکھا۔ ''دیکھو عبداللہ...... یہ تو زیادتی ہے۔'' اُس نے فریاد کی۔

مشتاق کچھ گھبرایا۔ ''معاملہ میرا اور تمہارا ہے۔ عبداللہ کو کیوں بیچ میں لاتے ہو۔'' اس نے فاروق سے کہا۔

''میں نے نشانی بھی بتا دی۔ تم پھر بھی نہیں مانتے۔ تو میں کیا کروں۔ دیکھو نا عبداللہ...... نشان پڑا ہے نا۔''

عبداللہ کڑھ رہا تھا۔ لیکن وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اب کسی سے نہیں لڑے گا۔

''میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم لوگ آپس میں ہی نمٹ لو۔'' اُس نے ناخوشی سے کہا۔ سچ یہ ہے کہ اسے خود پر افسوس بھی ہو رہا تھا۔ آدمی فطرت کے خلاف کچھ کرے تو خوش ہو ہی نہیں سکتا۔

اُس کے جواب نے فاروق کو مایوس کر دیا۔ جبکہ مشتاق کھل اٹھا۔ اور وہاں مشتاق جیسے اور بھی تھے۔ ان کے دبے ہوئے حوصلے سر اٹھانے لگے۔

چند بار اسی نوع کے معاملات ہوئے اور عبداللہ نے پہلوتہی کی تو سب کو اس تبدیلی کا اندازہ ہوگیا۔ وہ سب شیر ہوگئے۔

پھر ایک بار خود عبداللہ ان کا نشانہ بن گیا۔ سعید نے اُس کی پنسل چھین لی۔

''یہ تو میری ہے۔''

عبداللہ نے دبا دبا احتجاج کیا۔ لیکن بالآخر صبر کرلیا۔ اُس کے بعد تو یہ آئے دن کا معمول ہوگیا۔ عبداللہ کو زیادہ پروا بھی نہیں تھی۔ گھر میں ہمیشہ پنسلوں کا باکس موجود رہتا تھا۔ جب بھی پنسل چھنتی' وہ اماں سے نئی پنسل لے لیتا۔

مگر پھر ایک دن اماں نے پنسل دینے سے انکار کردیا۔ ''اب ایک ہفتے سے پہلے نئی پنسل نہیں ملے گی۔'' انہوں نے پنسل دیتے ہوئے کہا۔

اور پنسل اگلے ہی روز چھن گئی۔ اب وہ کام کیسے کرتا۔ کام نہ کرنے پر اگلے روز سر نے اس کے ہاتھوں پر بید برسائے...... اور اسی دن ہاتھ منہ دھلاتے ہوئے اماں نے اس کے ہاتھ دیکھ لئے۔ یوں بات کھل گئی۔

عبداللہ ذہین بھی تھا اور فہیم بھی۔ اس کا مشاہدہ بھی بہت اچھا تھا۔ اس پورے عرصے میں اس نے ایک بہت اہم بات سیکھی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ جب آپ کسی کو کسی کی زیادتی سے بچاتے ہیں تو خود بھی زیادتی سے بچتے ہیں۔ اور جب آپ کسی پر ظلم ہوتے ہوئے خاموشی سے دیکھتے رہیں تو جلدی ہو یا دیر سے' آپ کی اپنی باری بھی آجاتی ہے۔ اور جب کوئی آپ کے ساتھ زیادتی کرے تو اس وقت آپ کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یعنی کسی کو ظلم و زیادتی سے بچانا صرف اس پر مہربانی کرنا نہیں' خود پر مہربانی کرنا بھی ہے۔ اس میں آپ کا اپنا فائدہ بھی ہے اور دوسروں کا بھی۔ جب آپ زیادتی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں تو دوسرے لوگ جو آواز اٹھانا چاہتے ہیں' لیکن ڈرتے اور گھبراتے ہیں' ان کو بھی حوصلہ مل جاتا



ہے۔ یوں آواز اٹھانے والوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔

لیکن یہ سمجھنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ تو بالکل ہی ہار چکا تھا۔ وہ تو زیادتی کے خلاف آواز اٹھانے والے کی تائید کرنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتا تھا۔ بہرحال یہ طے تھا کہ اُس میں اپنی عمر سے زیادہ سمجھداری آرہی ہے۔ وہ زندگی کو غیر محسوس طور پر سمجھ رہا تھا۔ جبکہ بےفکری کی اس عمر میں عموماً ایسا نہیں ہوتا۔

اور جب اماں نے تفتیش شروع کی تو اُس نے بات بنانے کی کوشش کی۔ وہ اسے بے ضرر فعل سمجھ رہا تھا۔ لیکن اماں نے اسے بتایا تو اسے احساس ہوا کہ وہ جھوٹ بھی بولنے لگا ہے۔ اور جھوٹ کے بارے میں اسے بتایا گیا تھا کہ وہ سب سے بڑے گناہوں میں سے ہے۔ اُس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اتنی چھوٹی سی بات اتنا بڑا گناہ کیسے ہوسکتی ہے۔ اس پر اُس کے اسلامیات کے ٹیچر نے اسے سمجھایا تھا کہ جھوٹ کی وجہ سے آدمی سینکڑوں گناہوں میں ملوث ہوجاتا ہے۔ ایک تو ایک' چھوٹے سے جھوٹ کو نبھانے کے لئے بعض اوقات ہزاروں جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ آدمی دوسروں پر تہمت بھی لگاتا ہے۔ اور یہ کہ جھوٹ وہ آدمی بولتا ہے' جس کی شخصیت کمزور ہو۔ اور جھوٹ بولتے بولتے وہ اور کمزور ہوتا جاتا ہے۔ اور یہ کہ کمزوری درحقیقت اللہ سے دور ہونے میں ہے۔ اور جھوٹ انسان کو اللہ سے دور کرتا چلا جاتا ہے۔

یہ سب کچھ وہ پوری طرح سمجھتا تو نہیں تھا۔ لیکن اسے لگتا تھا کہ اس کے اندر کوئی ہے' جو یہ سب کچھ سمجھ رہا ہے۔ لیکن اُسے سمجھا نہیں سکتا۔ اور یہ تو وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ اندر سے کمزور ہوگیا ہے۔ اور جھوٹ بول کر اور کمزور ہوتا جارہا ہے۔

اس کا ثبوت یہ تھا کہ اماں نے معاملے سے نمٹنے کے لئے جو قدم اٹھانے کا

فیصلہ کیا' وہ اسے ناپسند تھا۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ ڈرتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ شکایت کے بعد وہ سب لڑکے انتقامی کارروائیوں پر اتر آئیں گے اور اُس کا اسکول میں رہنا دوبھر ہو جائے گا۔ وہ مار پیٹ کریں گے۔ اسے چوٹ لگے گی۔ تکلیف ہوگی...... اور کوئی بڑی چوٹ لگ گئی تو......؟ لیکن وہ اماں کو روک بھی نہیں سکتا تھا۔

اماں صبح سویرے اسکول آئیں اور سر سے ملیں۔ ان کے جانے کے بعد سر نے بید سے ان تمام لڑکوں کی پٹائی کی۔ اُس کے بعد وقفے تک وہ لڑکے اسے خون خوار نظروں سے دیکھتے رہے۔ وقفہ ہوا تو عبداللہ کا کلاس سے باہر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ڈر کی وجہ سے۔ لیکن پھر اُس نے سوچا' یوں تو وہ کلاس میں اکیلا رہ جائے گا' اور شاید وہ اُس کی مرمت کر دیں۔ بچانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔

وہ جان بوجھ کر دو بچوں کے ساتھ کلاس سے نکلا۔ اسی وقت ایک طرف سے نذیر آیا۔ ''بچو...... ہماری پٹائی تو ہوگئی۔ اب تیری باری ہے۔ چھٹی کے بعد اسکول سے باہر واپس نکلے گا نا۔ پھر بتائیں گے تجھے۔''

اس کے بعد عبداللہ کا دل پڑھائی میں نہیں لگا' اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ خوف زدہ تھا اور دل ہی دل میں اماں کو برا بھلا کہہ رہا تھا' جنہوں نے پینسل جیسی معمولی چیز کے لئے اتنی بڑی مصیبت کھڑی کر دی۔

چھٹی کی گھنٹی بجی تو وہ بہت تیزی سے...... سب سے پہلے کلاس سے نکلا۔ گیٹ کی طرف تیز قدموں سے جاتے ہوئے اسے اپنے پیچھے سے لپکتے ہوئے قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ پلٹ کر دیکھنے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے دشمن ہی ہوں گے۔

گیٹ سے نکلتے ہی وہ بھاگنا چاہتا تھا کہ کسی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے



گھبرا کر دیکھا۔ وہ اماں تھیں۔ ''اماں...... آپ؟''

''ہاں۔ ذرا مجھے ان بچوں کی صورت تو دکھا۔'' اماں نے کڑے لہجے میں کہا۔

اس کا دل بہت بڑا ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اسی لمحے سر سے پٹنے والوں کا گروہ انتقام کے جذبے سے بھرا ہوا گیٹ سے نکلتا نظر آیا۔ ''یہ رہے اماں وہ لوگ۔'' اس نے اشارے سے کہا۔

لڑکوں نے بھی اماں کو دیکھ لیا تھا اور گھبرا کر کھسک لینا چاہتے تھے کہ اماں نے کڑک کر کہا۔ ''بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ادھر آؤ اور میری بات سنو۔''

وہ ہچکچائے۔ مگر اماں کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

''میری ایک بات کان کھول کر سن لو۔ دوبارہ نہیں کہوں گی۔'' اماں نے کہا۔ ''اگر اب عبداللہ سے کسی نے کچھ چھینا یا اسے تنگ کیا تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گی۔ اور عبداللہ کو بھی گیا گزرا نہ سمجھنا۔ میں نے لڑنے سے منع کر رکھا ہے اسے۔ ورنہ تم سب کو یہ اکیلا ہی ٹھیک کر سکتا ہے۔'' پھر اماں نے اس کا ہاتھ تھاما اور بولیں۔ ''چلو عبداللہ۔''

''ایسا نہیں ہوگا خالہ۔ عبداللہ تو ہمارا دوست ہے۔'' پیچھے سے نذیر نے کہا۔

اماں نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ اس کا ہاتھ تھامے چلتی رہیں۔

اس لمحے عبداللہ کے دل سے اماں کے لئے دعا نکلی۔ اماں نے اسے بچا لیا۔ فوراً ہی اندر سے کسی نے کہا...... نہیں' اللہ نے مجھے بچا لیا۔ اسے یاد آ گیا۔ ابا کہتے تھے' ہر فائدہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اس کا شکر ادا کیا کرو۔ آدمی تو بس وسیلہ ہوتا ہے۔ حکم اللہ کا ہوتا ہے۔

اگلے روز کلاس میں لڑکوں کا رویہ اس کے ساتھ دوستانہ تھا۔ نذیر نے اس سے کہا۔ ''تم نے اپنی اماں کا کہنا مان کر لڑنا بھڑنا چھوڑ دیا' تم بہت اچھے ہو۔''

سارے معاملات ٹھیک ہو گئے۔

مگر پھر اسے یہ احساس ہوا کہ گڑبڑ اور بہت سے معاملات میں بھی ہے۔ ب اسکول کا اور ہم جماعتوں والا معاملہ اس کے لئے اتنا سنگین ہو گیا تھا کہ کہیں او توجہ دینے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ اب مہلت ملی تھی تو وہ معاملات سمجھ میں آ شروع ہوئے۔

اب وہ سمجھا کہ صرف ایک خوف نے ...... زخم لگنے اور تکلیف کے خوف نے اس سے اس کی تمام خوشیاں چھین لی تھیں۔ درخت پر چڑھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس سے اسے خوشی ملتی تھی۔ بچپن سے وہ پرندوں کو بہت غور سے دیکھتا تھا۔ ان کا پر پھیلا کر اڑنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ سوچتا' انہیں کیسا مزہ آتا ہو گا۔ کم وقت میں ادھر سے اڑ کر ادھر چلے گئے۔ اور اڑتے ہوئے دور دور تک دیکھ سکتے ہوں گے۔ واہ بھئی واہ' اس کا خود بھی بہت جی چاہتا کہ وہ اڑے۔

وہ چھوٹا سا تھا کہ ایک دن اس نے اڑنے کی کوشش کی۔ صحن میں کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے اپنے دونوں بازو پھیلائے اور انہیں حرکت دیتے ہوئے صحن میں دوڑا۔ وہ گھر کے دروازے تک پہنچ گیا۔ لیکن وہ فضا میں ذرا سا بھی بلند نہیں ہو سکا۔

وہاں رک کر اس نے سوچا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔ پرندوں کو وہ بہت غور سے دیکھتا تھا۔ ان کا ہر انداز اسے یاد تھا۔ اور وہ تصور میں بار ہا پرواز کر چکا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ وہ بالکل پرندوں کی نقل کرتا ہے۔ پھر وہ اڑ کیوں نہیں سکا۔



چند لمحے وہ سوچتا رہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاید ایک کمی رہ گئی ہے۔ اس نے بازو بھی پھڑپھڑائے اور دوڑا بھی۔ لیکن اس نے دونوں پاؤں فضا میں بلند کر کے خود کو اٹھایا نہیں۔ ورنہ شاید وہ اڑ جاتا۔ چنانچہ اس بار اس نے گھر کے دروازے سے صحن کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ اور بیچ صحن میں پہنچ کر اس نے پورے اعتماد کے ساتھ فضا میں جست لگائی۔ ساتھ ہی بازو پھڑپھڑانے کا عمل بھی جاری رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ منہ کے بل گرا تو پھڑپھڑاتے ہوئے ہاتھ اسے چوٹ سے بچانے کے لئے آگے نہیں آ سکے۔ وہ عملاً ناک کے بل گرا۔ چوٹ لگی۔ لیکن اصل میں ناکامی کے احساس کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

چند لمحے وہ جیسے گرا تھا' ویسے ہی پڑا رہا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کی کوشش پرواز کے دوران دادا کمرے سے نکل آئے تھے اور انہوں نے پورا منظر دیکھا تھا۔

''کیا ہوا عبداللہ' اٹھتے کیوں نہیں؟'' دادا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چوٹ کو بھی بھول گیا۔

دادا اس کے پاس چلے آئے۔ ''یہ کیا کر رہے تھے تم بچو؟'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے شفقت سے کہا۔

''میں اڑنے کی کوشش کر رہا تھا دادا جی۔''

''تم کیسے اڑ سکتے ہو؟''

''جیسے چڑیاں اڑتی ہیں...... کوّے اڑتے ہیں۔'' اس نے معصومانہ جواب دیا۔

دادا خوب ہنسے۔ ''بھئی انہیں اللہ نے اڑنے کے لئے بنایا ہے اور تمہیں چلنے کے لئے۔'' وہ بولے۔ ''تمہارے پاس پر تو نہیں ہیں نا۔''

''ہیں نا دادا جی۔'' اس نے بڑے یقین سے کہا اور دونوں بازوؤں کو پروں کی طرح پھڑ پھڑایا۔

''بچے یہ ہاتھ ہیں پر نہیں۔ پر ہوتے تو یہ پھیلے ہوئے ہوتے اور کندھے کے بجائے تمہاری کمر سے اُگے ہوتے۔'' پھر دادا نے اسے سمجھایا کہ پر کیونکہ پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ تو جب وہ پھڑ پھڑائیں تو ان کے نیچے موجود ہوا حرکت کرتی ہے...... طاقت کے ساتھ۔ اور وہ ہوا پرندوں کے جسم کو اوپر اٹھاتی ہے۔ ''اب تم ہاتھ پھڑ پھڑا رہے ہو تو ہاتھوں کے نیچے اتنی ہوا تو موجود ہی نہیں۔ کیونکہ وہ اتنے پھیلے ہوئے نہیں ہیں اور جو تھوڑی بہت ہوا حرکت کرے گی تو اس کی طاقت اتنی نہیں ہوگی کہ وہ پورے جسم کو اٹھا سکے۔ اور پھر ہاتھ بیچ میں بھی نہیں ہیں' اوپر ہیں۔''

اس کی سمجھ میں کچھ آیا' کچھ نہ آیا۔ بہر حال اس نے سمجھ لیا کہ وہ اڑ نہیں سکتا۔

''تمہارے چوٹ بھی تو لگی ہے۔'' دادا نے کہا۔

تب عبداللہ کو چوٹ کا خیال آیا۔ وہ ناک سہلانے لگا۔

''کوئی بات نہیں۔ یہ شوق کی قیمت ہے۔'' دادا نے کہا۔ ''ہر شوق کی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے۔ کھیلو گے تو چوٹ لگے گی۔ چوٹ سے ڈرو تو کھیلو مت۔''

عبداللہ نے دادا کی وہ بات گرہ میں باندھ لی تھی' جو بعد میں اس کے کام آئی۔

اس نے اڑنے کا خیال دل سے نکال دیا۔ ایک دن وہ محلے کے بچوں کے ساتھ تھا۔ صفدر کے گھر کے سامنے امرود کا ایک درخت تھا۔ اس پر امرود آئے ہوئے تھے۔ بچے للچا رہے تھے۔ چند ایک بار انہوں نے پتھروں سے امرود گرانے کی کوشش کی۔ امرود تو کوئی نہیں گرا۔ لیکن صفدر کی امی گھر سے نکل آئیں۔ ''ارے



کم بختو' چین نہیں ہے تمہیں۔ گھر میں پتھر پھینک رہے ہو۔ کسی کا سر پھٹ جائے تو کیا ہو؟''

عبداللہ کا دل للچا رہا تھا۔ اس نے سوچا' میں پرندہ ہوتا تو اوپر جا بیٹھتا اور پھل توڑ توڑ کر گراتا رہتا۔ پھر اسے خیال آیا کہ دادا نے کہا تھا...... انسان کو اللہ نے زمین پر چلنے' پہاڑوں پر چڑھنے اور اترنے کے لئے بتایا ہے۔ اس نے سوچا پہاڑ تو بہت اونچے ہوتے ہیں۔ درخت تو ان کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ تو پھر درخت پر چڑھ اور اتر کیوں نہیں سکتا۔

اس نے درخت کا جائزہ لیا۔ تنے کا چند فٹ کا حصہ ایسا تھا' جہاں شاخیں نہیں تھیں۔ مگر وہاں کچھ ابھری ہوئی جگہیں تھیں' جن پر پاؤں رکھ کر اوپر جایا جا سکتا تھا۔ پھر اس کے بعد تو وہ شاخوں پر چڑھ جاتا۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا کہ وہ چڑھ سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے پیدا کئے ہوئے انسان کو اسی طرح اس کی صلاحیتوں سے متعارف کراتے ہیں۔

وہ درخت پر چڑھا' اور چڑھتا چلا گیا۔ اور جب اس نے امرود گرانے شروع کئے تو اس کے ساتھی خوش ہو گئے۔ وہ اسے داد دینے...... تالیاں بجانے لگے۔ ایک لڑکا جھولی میں امرود جمع کرنے لگا۔ ''میرا حصہ رکھ دینا۔'' عبداللہ نے اوپر سے کہا۔

''نہیں۔ تم نیچے آؤ گے تو سب مل کر کھائیں گے۔'' ساجد نے کہا۔ وہ اس کا سب سے اچھا دوست تھا۔

اور عبداللہ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر اترتا آخری شاخ پر آیا۔ اب اس کے سامنے خالی تنا تھا۔ اس نے ایک لمحے تنے کو دیکھا۔ ابھرے ہوئے حصوں پر

پاؤں رکھ کر جیسے وہ چڑھا تھا' ویسے ہی اتر بھی سکتا تھا۔ لیکن اس کے اندر کوئی رہنما اسے بتا رہا تھا کہ اترتے ہوئے پاؤں پھسلنے کا خطرہ بھی ہے۔ ایک لمحے میں اس نے فیصلہ کرلیا کہ یہاں سے وہ چھلانگ لگائے گا۔ اس وقت ناکام پرواز کا وہ تجربہ اس کے کام آ گیا۔ اسے دونوں ہاتھ زمین کی طرف رکھتے ہوئے پیروں کے بل کودنا ہے۔ ورنہ وہ منہ کے بل گرے گا۔

اس نے چھلانگ لگائی...... کامیاب چھلانگ۔ اور اس کا دل خوش ہو گیا۔ سینہ اعتماد سے بھر گیا۔

اس دن کے بعد درختوں پر چڑھنا' چھت پر چڑھنا اس کا محبوب مشغلہ بن گیا۔ اس کے لئے وہ اڑنے کے شوق کا نعم البدل تھا۔ اور دوسری طرف وہ دوستوں کی ضرورت بن گیا۔ کسی درخت سے پھل توڑنے ہوتے تو وہ اسے لینے کے لئے آجاتے۔

پھر بچوں کی دیکھا دیکھی اسے گیند بلے کا شوق ہو گیا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کھیل کا نام کرکٹ ہے۔ اور اس کے گھر میں کسی نے بھی کرکٹ نہیں کھیلی تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کھیل کی قدرتی صلاحیت اس میں موجود ہے۔ لیکن بستی کے بڑے لڑکوں نے اس کی صلاحیت دیکھ اور بھانپ لی۔

کبھی تو وہ چھوٹے بچوں کے ساتھ گلی میں ٹینس کی گیند سے کرکٹ کھیلتا تھا اور کبھی بستی کے باہر بستی اور کھیل کے بڑے میدان کے درمیان۔ کیونکہ وہاں جگہ ذرا زیادہ مل جاتی تھی اور گیند بار بار گھروں میں نہیں جاتی تھی۔ محلے کی عورتوں سے گیند واپس لینا بھی ایک مسئلہ ہوتا تھا۔

ایک بار وہ میدان کے کنارے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ بستی کی بڑی کرکٹ ٹیم کے چند کھلاڑی وہاں سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے اسے کھیلتے دیکھا



تو رک گئے۔ اس نے شاٹ ہی ایسا کھیلا تھا۔

''یار...... یہ کیسا شاٹ کھیلا ہے بچے نے۔'' معاذ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''ڈھیل لگتی رہتی ہے اس کھیل میں'' سہیل نے بے پروائی سے کہا۔ وہ بڑوں کی ٹیم کا کپتان تھا۔

''ذرا رک کر دیکھو تو۔ مجھے تو غیر معمولی سا لگ رہا ہے یہ لڑکا۔'' معاذ نے اصرار کیا۔

وہ کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔ عبداللہ نے اگلی چار پانچ گیندوں پر جو شاٹ کھیلے' انہوں نے انہیں حیران کر دیا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔'' سہیل نے معاذ سے کہا۔ ''یہ بچہ پیدائشی بیٹسمین ہے۔ سیدھے بلے سے کھیلتا ہے۔ اور پرفیکٹ شاٹ منتخب کرتا ہے۔''

''اور جسم کی' کہنیوں کی پوزیشن دیکھو' فٹ ورک دیکھو۔ کرکٹ بک کی شاٹس ہیں۔'' افتخار نے تبصرہ کیا۔

''یہ ان بچوں میں کھیلتا رہا تو اس کی صلاحیت ضائع ہو جائے گی۔''

انہوں نے عبداللہ کو پاس بلایا۔ ''تم ہمارے ساتھ کھیلا کرو۔'' سہیل نے عبداللہ سے کہا۔ ''وہ سامنے میدان میں۔ ہر روز ساڑھے چار بجے آجایا کرو۔''

عبداللہ گھبرا گیا۔ ''لیکن آپ تو بڑے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ کیسے کھیل سکتا ہوں۔''

''کیوں نہیں کھیل سکتے۔ تمہارا کھیل اچھا ہے۔ بڑوں میں کھیلو گے تو بہت جلدی بہت اچھے کھلاڑی بن جاؤ گے۔''

عبداللہ ہچکچایا۔ مگر بالآخر مان گیا۔

اگلے روز سے وہ بڑے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ وہ لوگ لال رنگ کی سخت گیند سے کھیلتے تھے، جو بہت زیادہ اچھلتی نہیں تھی۔ تمام وقت وہ اس سے فیلڈنگ کراتے رہے اور فیلڈنگ کے طریقے اور درست انداز سکھاتے رہے۔ عبداللہ کو کوئی پروا نہیں تھی کہ اب تک اس کی باری نہیں آئی۔ یہ اعزاز اس کے لئے بہت تھا کہ وہ کرکٹ کی اصل گیند سے بڑے لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔

آخر میں انہوں نے اسے بیٹنگ کے لئے بلایا۔ ''یہ پیڈز باندھو اور گلووز پہنو۔'' سہیل نے کہا

عبداللہ کو وہ سب بہت عجیب لگا۔ اس نے پیڈ باندھ تو لیا۔ لیکن فوراً ہی اتار بھی دیا۔ ''اسے باندھ کر مجھ سے پاؤں نہیں ہلائے جاتے۔ اور دستانوں کے ساتھ بلا ٹھیک سے نہیں پکڑا جاتا۔'' اس نے کہا

چند روز وہ اسی طرح کھیلتا رہا۔ اس کا اعتماد بڑھ گیا۔ بیٹنگ کی اس میں واقعۃً قدرتی صلاحیت تھی۔

ادھر سہیل اور دوسرے لڑکوں نے اس پر پیڈ اور گلووز نہیں تھوپے۔ لیکن وہ ان کی اہمیت کو سمجھتے تھے اور انہوں نے اس کی اہمیت کو اس پر اجاگر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک دن معاذ نے عبداللہ کو تیز گیند کرائی تو سہیل نے منصوبے کے مطابق اسے ٹوکا۔ ''تیز گیند مت کرو۔ وہ بچہ ہے۔'' اس نے کہا

عبداللہ کو یہ سننا اچھا نہیں لگا۔ اس نے کہا۔ ''میں بہت تیز گیندیں بھی کھیل سکتا ہوں۔''

''یہ میں بھی جانتا ہوں۔'' سہیل نے کہا۔ ''اسی لئے تمہیں یہاں لایا ہوں۔ لیکن پیڈ اور گلووز کے بغیر کوئی گیند لگ گئی تو چوٹ لگے گی۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں چوٹ لگنے سے نہیں ڈرتا۔'' عبداللہ نے اکڑ کر کہا۔



اسے نسبتاً تیز گیندیں کرائی جانے لگیں۔ لیکن وہ لوگ اسے کرکٹ کے واقعات بھی سناتے تھے۔ کتنے ہی بیٹس مین ایسے تھے، جن کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ چند ایک کے جبڑے ٹوٹے تھے اور سر میں فریکچر ہوا تھا۔ چند کھلاڑی ایسے تھے، جن کے سینے پر دل کے مقام پر گیند لگی اور وہ دوسری سانس بھی نہیں لے سکے۔ اس لئے جہاں تک حفاظتی تدبیریں ممکن ہو، کرنی چاہئیں۔

چوتھے پانچویں دن لائن میں آکر ایک گیند کو کھیلتے ہوئے موومنٹ کی وجہ سے عبداللہ نے اسے مس کیا۔ خوش قسمتی سے گیند اٹھتی ہوئی تھی...... اور بہت زیادہ اٹھی ہوئی بھی نہیں تھی۔ گیند اس کی ران پر لگی۔ بلا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ وہیں بیٹھ گیا۔

''اسی لئے تو کہتا ہوں، پیڈ باندھا کرو۔'' سہیل نے کہا۔

اس روز گھر جا کر اکیلے میں عبداللہ نے اپنی ران کا جائزہ لیا۔ جہاں گیند لگی تھی، وہاں نیل پڑ گیا تھا...... اور تکلیف بھی ہو رہی تھی۔

وہ نڈر بچہ تھا۔ ڈرپوک ہوتا تو اس دن کے بعد بڑوں میں کھیلنے کے لئے نہ جاتا۔ مگر اس نے پیڈز کی اہمیت سمجھ لی۔ اگلے روز اس نے پیڈ بھی باندھے اور گلووز بھی پہنے شروع میں عجیب لگا۔ مگر دو تین دن میں اسے ان چیزوں کی عادت ہو گئی۔ اس نے خود محسوس کیا کہ اس کا کھیل بھی بہتر ہو گیا ہے۔

مگر پھر مجذوب والے واقعے کے بعد اس کی کایا پلٹ ہو گئی۔ اگلے روز اس نے معمول کے مطابق اسکول کا کام پورا کیا۔ پھر کھیلنے کیلئے باہر نکل ہی رہا تھا کہ اس پر خوف کا حملہ ہوا۔ وہ دروازے سے پلٹ آیا اور صحن میں چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ یہ کرکٹ تو خطرناک کھیل ہے۔ کتنے کھلاڑی تو اس میں مر چکے ہیں...... اور وہ سب مشہور کھلاڑی تھے۔ اس جیسے تو سینکڑوں مرے ہوں گے۔ کسی نے اہمیت بھی

نہیں دی ہوگی۔ ابھی ماجد خان کا جبڑا ٹوٹا ہے۔ کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔ اس نے تصور کیا اور لرز کر رہ گیا۔ ماجد خان کی تصویر اس نے دیکھی تھی۔ اس کے کپڑوں پر خون کے کتنے دھبے تھے۔

وہ جتنا سوچتا رہا' اس کا خوف اتنا ہی بڑھتا گیا۔ اس کھیل میں تو آنکھ بھی پھوٹ سکتی ہے۔ اور انگلی تو گلووز پہننے کے باوجود بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ اور کل رات اس نے اماں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرے گا' جس میں موت کا ڈر ہو۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ اب وہ کرکٹ کبھی نہیں کھیلے گا۔

دو دن وہ کھیلنے کے لئے نہیں گیا۔ مگر تیسرے دن اس کا دل مچلنے لگا۔ اس نے سوچا' ٹینس کی گیند سے تو وہ کھیل سکتا ہے۔ وہ اپنے پرانے ساتھیوں میں چلا گیا۔ مگر وہاں بھی ایک واقعہ ہوگیا۔ ٹینس کی گیند کسی کنکر پر پڑ کر اچھلی اور قمر کی ناک پر لگی۔ اگلے ہی لمحے قمر کی ناک سے خون جاری ہوگیا۔

عبداللہ کا خوف اور بڑھ گیا۔ ٹینس کی گیند سے ایسی چوٹ لگ سکتی ہے تو کوک کی گیند کیا حشر کرے گی۔ وہ کھیل سے تائب ہی ہوگیا۔

اب اس نے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ اس کے سارے مشغلے چھوٹ گئے۔ بڑے لڑکوں کو اس نے بتایا تھا کہ اس کے ابا نے اسے کھیلنے سے روک دیا ہے۔ اس کے ہم عمر بچے اسے بلانے کے لئے آتے۔ ''آؤ عبداللہ...... کرکٹ کھیلیں۔''

وہ منع کر دیتا۔ ''مجھے کرکٹ نہیں کھیلنی۔''

دوسرے بچے آتے۔ ''چلو عبداللہ...... بیر توڑ کر کھائیں گے۔''

''نہیں بھئی۔ اماں نے مجھے منع کر دیا ہے۔''

کچھ دن تو بچے آتے رہے۔ پھر انہوں نے بھی آنا چھوڑ دیا۔

اب وہ شام کے وقت گھر میں بولایا ہوا پھرتا رہتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا



کہ وہ کیا کرے۔ ایک دن اس کا دل مچلا تو وہ چھت پر چڑھنے کے ارادے سے دیوار پر چڑھنے لگا۔ لیکن اس کے انداز میں اعتماد نہیں تھا۔ وہ ڈر رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاؤں پھسلا اور وہ دھڑام سے نیچے گرا۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کسی نے وہ منظر نہیں دیکھا تھا۔ اور اسے چوٹ بھی نہیں لگی تھی۔ وہ کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن اس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اب کبھی دیوار پر نہیں چڑھے گا۔

اب وہ افسردہ رہنے لگا...... پژمردہ' بجھا بجھا۔ وقت اس سے کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ ناخوش تھا...... خود سے' زندگی سے' اپنے گردوپیش سے۔ سات آٹھ سال کا بچہ اپنا اصل مسئلہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ بچپن کے خوش رہنے والے عرصے میں وہ ان تمام مشغلوں سے محروم ہوگیا تھا' جو اسے خوشی دیتے تھے۔ بے فکری کی عمر میں اسے تفکرات لاحق ہوگئے تھے۔ وہ اس عمر میں خوف کا شکار ہوگیا تھا' جس میں بچوں کو خوف کا مطلب بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اور خوف بھی موت کا' جو پختہ عمر کے عاقل وبالغ افراد کو لاحق ہوجائے تو ان کی زندگی بھی اجیرن کر دیتا ہے۔

اسکول آتے جاتے اسے ایک سڑک پار کرنی ہوتی تھی۔ یہ کام وہ ایسے کرتا تھا کہ اسے احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی خطرناک کام ہے۔ پھر ایک روز اس نے ایک حادثہ دیکھ لیا۔

ایک تیز رفتار بس نے سڑک پار کرتے ہوئے دو افراد کو کچل دیا تھا۔ وہ اس وقت اسکول سے واپس آ رہا تھا۔ سڑک پر بھیڑ دیکھ کر اسے تجسس ہوا اور وہ اس طرف چلا گیا۔

اس منظر نے اسے دہلا دیا۔ اتنا بہت سا خون اور اتنا زخمی کوئی انسان اس نے

پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ دونوں جوان آدمی تھے۔ ان کے کپڑے خون میں لت پت تھے۔ ان میں ایک کے حلق سے دردناک کراہیں نکل رہی تھیں۔ جبکہ دوسرا ساکت پڑا تھا۔ اس کے صرف ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ لیکن کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ایک آدمی نے اس کا سر اپنی ران پر رکھا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''جلدی سے کوئی ٹیکسی روکو۔ اسے اسپتال لے کر جانا ہے۔''

وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ لیکن زمین نے جیسے اس کے پاؤں پکڑ لئے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکا اور سحر زدہ سا انہیں دیکھتا رہا۔

اچانک ساکت آدمی کے جسم کو جھٹکے لگنے لگے۔ اس کے حلق سے عجیب سی گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔ جو شخص اسے لیے بیٹھا تھا' اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''لگتا ہے' جان نکل رہی ہے۔''

تو یہ ہوتی ہے موت۔ عبداللہ نے تڑپتے ہوئے لہولہان شخص کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ اماں ٹھیک ہی ڈرتی ہیں۔ موت تو بڑی ڈراؤنی چیز ہوتی ہے۔ لیکن نہیں۔ اس کے اندر فوراً ہی تردید ابھری۔ دادا جی کو دیکھ کر لگتا تھا کہ سکون سے سو رہے ہیں۔ مگر یہ موت......

زخمی شخص کے جھٹکے اور بڑھ گئے۔ اس کا پورا جسم بری طرح ہل رہا تھا۔ پھر ایک شدید جھٹکے کے بعد اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ ''یہ تو ختم ہو گیا۔'' اس شخص نے کہا اور مرے ہوئے آدمی کا سر نرمی سے ہٹا کر زمین پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''دوسرے کا کیا حال ہے؟''

''اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ چکی ہیں۔ بڑی اذیت میں ہے۔'' کسی نے بتایا۔



''مرنے والا فائدے میں رہا۔ بچتا تو پوری زندگی معذوری میں گزرتی۔ کیا فائدہ ایسی زندگی کا۔''

''وہ ٹیکسی آ گئی ہے۔'' اچانک کسی نے کہا۔ پھر وہ لوگ مل کر زخمی شخص کو ٹیکسی میں لٹانے لگے۔

تو ایسی صورت میں موت زندگی سے بہتر ہوتی ہے۔ ننھے عبداللہ نے سوچا۔ اور وہ بھی ایسی ڈراؤنی موت۔ اس کے دل و دماغ خوف سے بھر گئے۔

یوں اسے ایک اور خوف مل گیا۔ دن میں دو بارا سے وہ سڑک پار کرنی ہوتی تھی...... اور وہ اس کے لیے بہت سخت مرحلہ بن گیا تھا۔ خوف نے اس کی قوت فیصلہ کو متزلزل کر دیا تھا' وہ اِدھر اُدھر آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھتا' فیصلہ کرتا کہ اب سڑک پار کی جا سکتی ہے۔ یہ سوچ کر وہ چلتا۔ پھر آتی ہوئی گاڑی کو دیکھ کر گھبراتا کہ وہ اس تک پہنچ جائے گی...... اور گھبرا کر پلٹ آتا۔ بعض اوقات وہ آدھی سڑک پار کر کے پلٹ آتا تھا۔ ایسے میں کئی بار وہ دوسری طرف کی گاڑیوں سے بال بال بچا۔ یوں اس کا خوف اور بڑھ گیا۔ کئی بار اس مشکل کی وجہ سے وہ اسکول دیر سے پہنچا۔ اس کا حل اس نے یہ نکالا کہ گھر سے جلدی نکلنے لگا۔

اتنا سمجھدار وہ بہرحال تھا کہ اس نے اپنے اس خوف کو کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس مسئلے کا کوئی حل نہیں۔ ابا اسے چھوڑنے اور لینے آتے تو اور مشکل ہوتی۔ اسے ابا کے ساتھ ہر حال میں سڑک پار کرنی ہوتی۔ وہ پلٹ بھی نہ سکتا۔

خوشی سے محرومی اور خوف' دونوں میں سے کوئی ایک بھی آدمی کو اندر سے چاٹ ڈالتے ہیں۔ بدقسمتی سے اس کے ساتھ بیک وقت دونوں مسئلے تھے۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ اس کی صحت خراب ہو رہی ہے۔ ایک دن ابا نے یہ بات محسوس کر لی۔ ''کیا بات ہے۔ یہ کمزور ہو رہا ہے۔'' انہوں نے اماں سے کہا۔

''تم اس کو کم دیکھتے ہو۔ اس لیے فرق لگ رہا ہے۔'' اماں نے بے پروائی سے کہا۔

''تم اسے زیادہ دیکھتی ہو۔ اس لیے تمہیں تبدیلی نظر نہیں آتی۔'' ابا نے تیز لہجے میں کہا۔ ''یہ سچ مچ کمزور ہو رہا ہے۔''

''قد بھی تو نکال رہا ہے۔'' اماں نے تاویل پیش کی۔ ''ایسے میں بچے کمزور لگنے لگتے ہیں۔''

ابا کی تسلی تو نہیں ہوئی۔ لیکن یہ بات ان کے دل کو بہر حال لگی۔ وہ چپ ہو گئے۔

اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اماں نے اس کا ایک مسئلہ کتنی آسانی سے حل کر دیا۔ کلاس کے لڑکوں میں اس کی عزت بحال ہو گئی۔ لیکن اور جو مسئلے ہیں' وہ تو اماں حل نہیں کر سکتیں۔ وہ موت سے تو نہیں لڑ سکتیں۔ وہ تو خود موت سے ڈرتی ہیں۔

وہ اپنی سوچوں میں اتنا منہمک تھا کہ اسے اماں کے پکارنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہ تو جب اماں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''عبداللہ...... سنتا نہیں ہے۔ بہرا ہو گیا ہے کیا؟'' تو اس نے چونک کر سر اٹھا کر اماں کو دیکھا۔

اماں اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''کیا بات ہے اماں؟'' اس نے پوچھا۔

❁........❁........❁

اسکول والے واقعہ کو تین دن ہو گئے تھے۔ اور ان تین دنوں میں زلیخا نے ہر لمحے عبداللہ پر نظر رکھی تھی۔ وہ اسے بغور دیکھتی رہی تھی۔ وہ پڑھی لکھی نہ سہی' بہر حال ماں تھی۔ اس نے بہت کچھ سمجھ لیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ عبداللہ کے پاس



فرصت کے اوقات میں کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ اور وہ ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے دور اور محروم ہے' جو بچپن میں ہر بچے کو ملتی ہیں۔ سات آٹھ سال کا بچہ اور ناخوش۔ یہ سوچ کر ہی وہ لرز گئی۔ اتنے بڑے بچوں کو تو کسی بات کی فکر ہی نہیں ہوتی۔ اس عمر میں بچے سوچتے نہیں۔ شرارتیں کرتے ہیں۔ ڈانٹ کھاتے ہیں۔ کبھی مرمت بھی ہوتی ہے ان کی۔ اور وہ سب کچھ بھول کر نئی شرارتوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اور اس نے غور کیا تو اسے نوشاد کی بات درست لگی۔ عبداللہ واقعی کمزور ہو رہا تھا۔

اس نے اس پر سوچا۔ عبداللہ کے معمولات پر غور کیا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کا ننھا سا اکلوتا بیٹا مشین جیسی زندگی گزار رہا ہے۔ وہ صبح اٹھتا' تیاری کرتا اور اسکول کے لیے نکل جاتا۔ بلکہ پچھلے کچھ عرصے سے تو وہ زیادہ جلدی نکل رہا تھا۔ اس کے ٹوکنے پر اس نے کہا تھا کہ صبح کے وقت اچھا لگتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ جاتا ہے۔ اس لیے جلدی نکلتا ہے۔

پھر اسکول سے آتا تو ہاتھ منہ دھو کر وہ کھانا کھاتا اور کچھ دیر سوتا۔ اٹھنے کے بعد وہ اسکول کا کام کرتا۔ پھر رات تک وہ گھر میں اِدھر اُدھر بے مقصد گھومتا پھرتا یا صحن میں چارپائی پر بیٹھ کر کچھ سوچتا رہتا۔ اور سوچتے ہوئے اس کے چہرے پر تفکر اور پریشانی کا تاثر ہوتا۔ زلیخا سوچتی...... کاش مجھے معلوم ہوتا کہ یہ کیا سوچ رہا ہے بہر حال یہ طے تھا کہ وہ کوئی اچھی بات نہیں سوچ رہا ہے۔

زلیخا کی سمجھ میں نہ آیا کہ مسئلہ کیا ہے اور اس کا حل کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن چوتھے دن بہر حال اس نے مداخلت کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ عبداللہ کو اس کے پرانے معمولات کی طرف واپس لے جائے گی۔

عبداللہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ اس کے کئی بار پکارنے پر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ ''عبداللہ...... سنتا نہیں ہے۔ بہرا ہو گیا ہے کیا؟'' اس نے جھنجلا کر اسے ڈپٹا۔

عبداللہ نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ ''کیا بات ہے اماں؟''

''تو ہر وقت بیٹھا کیا سوچتا رہتا ہے؟''

عبداللہ کے چہرے پر الجھن نظر آئی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا۔

''کچھ بھی نہیں اماں؟''

''اچھا...... ایک کام کر دے۔'' زلیخا نے کہا۔ ''چھت پر سے کچھ لکڑیاں اتار دے۔''

عبداللہ یہ سن کر گھبرا گیا۔ پھر اس نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ ''اچھا اماں...... اتار دوں گا۔''

''اتار دوں گا نہیں' ابھی اتار دے۔ ضرورت اب ہے۔''

عبداللہ اٹھ تو گیا۔ مگر وہ ہچکچا رہا تھا۔ وہ دیوار پر چڑھ کر چھت پر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اماں کو وہ سچی بات بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ اور اسے کوئی بہانہ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔ اور بہانہ ضروری تھا۔ کیونکہ چھت پر چڑھنا تو اُس کا معمول رہا تھا۔

وہ مرے مرے قدموں سے دیوار کی طرف بڑھا۔ وہاں کھڑا ہو کر وہ چند لمحے سوچتا رہا۔

''کیا بات ہے...... چڑھ جانا۔'' زلیخا نے اسے اکسایا۔

اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ عبداللہ نے کہا۔ ''عبداللہ مجھے ڈر لگ رہا ہے اماں۔''

زلیخا ہنسنے لگی۔ ''بے وقوف بناتا ہے مجھے۔ دن میں دسیوں بار تو چڑھتا تھا اس دیوار پر۔''



''اب یہ دیوار خطرناک ہو گئی ہے اماں۔''

''لے...... یہ تو اور آسان ہو گئی ہے۔ بے پلاسٹر کی دیوار ہے۔ جھڑتی رہتی ہے۔ رخنے بڑے ہو گئے ہیں۔''

''میرے پاؤں بھی تو بڑے ہو گئے ہیں۔'' عبداللہ نے تاویل گھڑی۔

''فضول باتیں نہ کر۔ چڑھ جا جلدی سے۔''

''اچھا اماں' اگر میرا پاؤں پھسلا اور میں گر گیا تو کیا ہوگا۔''

''چوٹ لگے گی۔ اور کیا ہوگا۔''

عبداللہ نے رحم طلب نظروں سے ماں کو دیکھا۔ ''اماں...... آپ چاہتی ہیں کہ مجھے چوٹ لگے۔''

''اول تو تُو گرے گا نہیں۔ روز کا درختوں پر چڑھنے والا۔ اس دیوار کی کیا حیثیت ہے۔'' زلیخا نے حوصلہ افزائی کرنے والے انداز میں کہا۔ ''اور گرا بھی تو معمولی سی چوٹ لگے گی۔ ایسی چوٹیں تو زندگی میں لگتی ہی رہتی ہیں۔''

''مگر اماں' چوٹ لگی تو تکلیف ہوگی مجھے۔''

''ماسٹر جی نے بید برسائے تھے ہاتھ پر' تو تکلیف ہوئی تھی نا۔ اس چوٹ کی تکلیف اس سے کم ہی ہوگی۔'' زلیخا نے جل کر کہا۔

''اماں...... ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے تو میں معذور ہو جاؤں گا زندگی بھر کے لیے۔ اور سر کے بل گرا تو مر بھی سکتا ہوں۔'' عبداللہ نے ماں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی لیکن زلیخا کی دکھتی رگ کہیں غائب ہو گئی تھی۔ ''ارے کیسی بری باتیں نکالتا ہے منہ سے۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ چل چڑھ جا جلدی سے۔''

اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ عبداللہ دیوار پر چڑھنے لگا۔ لیکن وہ ڈر رہا تھا۔ کئی بار اس کا پاؤں پھسلتے پھسلتے رہ گیا۔ جیسے تیسے وہ چھت پر چڑھا اور اس نے لکڑیاں نیچے

پھینکیں۔ پھر وہ واپس دیوار پر آیا اور اس نے زلیخا سے کہا۔ ''اماں...... کری
رکھ دیں یہاں۔ میں ایسے نہیں اتر سکتا۔''

زلیخا نے اس کی بات مان لی۔ جو اسے دیکھنا تھا' دیکھ لیا تھا۔ اس کا لڑ
ڈرپوک ہو گیا تھا۔ اس نے کرسی لا کر رکھی اور کچن میں چلی گئی۔

عبداللہ نیچے اتر آیا۔ اس کا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ کئی بار وہ گرتے گر
بچا تھا۔ ایک بار اس نے یہ بھی سوچا کہ واقعی اس چھت پر وہ دن میں دسیو
شوق سے چڑھتا تھا۔ فرق یہ تھا کہ پہلے وہ بے سوچے سمجھے چڑھ جاتا تھا۔ اور
گرنے کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔

پھر اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹکا اور موجودہ مسئلے پر غور کرنے
اماں تو آئے دن اس سے چڑھنے کو کہیں گی۔ اور کبھی وہ گرے گا اور چوٹ کھ
گا۔ یہ ہے ہر وقت گھر میں رہنے کا نقصان۔

اسی وقت اماں آ گئیں۔ ''یہ تو ہر وقت گھر میں گھسا رہتا ہے۔ باہر کیوں
جاتا بیٹے۔ تو نے کھیلنا بھی چھوڑ دیا۔'' انہوں نے بے حد محبت سے کہا۔

عبداللہ خود اس وقت یہی سوچ رہا تھا۔ ''کھیلنے کو دل نہیں چاہتا اماں۔''
نے آسان سا جواب دیا۔ مگر حقیقت وہ جانتا تھا۔ وہ باہر جاتا تو لڑکے بھی اس
کسی درخت پر چڑھنے کو کہتے اور کبھی کرکٹ یا مارم پٹی کھیلنے کو۔ اور یہ سب و
نہیں چاہتا تھا۔ وہ انکار کر دیتا۔ اس کے نتیجے میں لڑکے اسے ڈرپوک کہنے
تنگ آ کر اس نے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ اب کبھی وہ گھر سے نکلتا تو ساتھی لڑکے
اور انداز سے چھیڑتے۔ ''لڑکی ہے بھئی' لڑکی ہے۔'' وہ کورس میں گاتے

''میں لڑکی نہیں ہوں۔'' وہ احتجاج کرتا۔

''ہر وقت گھر میں گھسی رہنے والی لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔''



سو اس نے گھر سے نکلنا بالکل ہی چھوڑ دیا۔ مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ گھر میں
ہے گا تو اماں چھت پر چڑھائیں گی۔

ادھر زلیخا بھی یہی کچھ سوچ رہی تھی۔ یہ لڑکا گھر میں گھسا رہے گا تو لڑکیوں
ے بدتر ہو جائے گا۔ اور دھکیل کر باہر نکالنا مناسب نہیں ہے۔ پتا نہیں کہاں
ائے' کیا کرے۔ کچھ تو ہونا چاہیے۔ کچھ تو کرنا ہو گا۔

جب کچھ نہ سوجھے تو آدمی کو خدا ہی یاد آتا ہے۔ زلیخا کو بھی اللہ یاد آیا۔
وہ پڑوس کی نجمہ کے ہاں چلی گئی۔ نجمہ کے ہاں محلے بھر کے بچے قرآن پاک
ڑھنے کے لیے آتے تھے۔ ''میرے عبداللہ کو بھی پڑھا دیا کرو۔'' اس نے کہا۔

نجمہ تو کھل اٹھی۔ ''سر آنکھوں پر باجی۔ عبداللہ تو مجھے بہت ہی اچھا لگتا ہے۔
ر آج کل تو صورت ہی نظر نہیں آتی اس کی۔''

''لیکن وہ چار بجے آ سکے گا۔'' زلیخا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ کیونکہ نجمہ چار
بجے پڑھنے والے بچوں کو رخصت کر دیتی تھی۔

''کوئی بات نہیں۔ میں غزالہ کو قاعدہ شروع کرانے کا سوچ رہی ہوں کب
ے۔ عبداللہ کے ساتھ ہی شروع کرا دوں گی۔ چار بجے کے بعد بس یہ دونوں
ڑھیں گے۔ مجھے کوئی مشکل نہیں ہو گی۔ گھر کا کام بھی کر لوں گی۔'' غزالہ نجمہ کی
کلوتی اولاد تھی۔ پانچ سال کی ہو گی۔

زلیخا نے واپس آ کر عبداللہ سے کہا۔ ''اتنا بڑا ہو گیا۔ اب تو قرآن پڑھنے
جایا کر نجمہ خالہ کے ہاں۔''

عبداللہ تو خوش ہو گیا۔ اس کا ایک اور مسئلہ حل ہو گیا۔ اب وہ گھر سے دور رہ
سکے گا۔

اس رات زلیخا نے نوشاد کو یہ بات بتائی تو اس نے خوش ہو کر کہا۔ ''زندگی میں

پہلی بار کوئی اچھا کام کیا ہے تم نے۔''

❁ ........ ❁ ........ ❁

یہ نیا معمول عبداللہ کو خوب راس آ گیا۔ وہ خوش رہنے لگا۔ زندگی میں جیسے بہار آ گئی تھی۔

عبداللہ کھیلنے کے وقت میں قرآن پاک پڑھنے کے لیے جانے لگا۔ پھر یہ اس کا دن بھر کا سب سے خوش گوار وقت ہو گیا۔ ایک تو نجمہ خالہ اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ بہت توجہ دیتی تھیں اس پر۔ دوسرے پانچ سالہ غزالہ اسے بہت اچھی لگی۔ اتنے دنوں سے وہ دوستوں اور دوستی کو ترسا ہوا تھا۔ اس نے اپنی پوری توجہ غزالہ پر مرکوز کر دی۔

اسے مجذوب کی ہر بات یاد تھی۔ یہ بھی یاد تھا کہ جب وہ گلی میں آواز لگا رہا تھا تو نجمہ خالہ نے دروازہ کھول کر اسے کھانا دینے کو کہا تھا۔ مگر مجذوب نے انکار کر دیا تھا اسے ان دونوں کا ایک ایک مکالمہ یاد تھا۔ آخر میں مجذوب نے کہا تھا...... تُو کیوں دروازہ کھول کر کھڑی ہے ناقدری۔ جا' جا اپنا کام کر۔ اور مجذوب نے ناقدری پر خصوصیت سے زور دیا تھا۔

عبداللہ کی سمجھ میں ناقدری کا مطلب نہیں آیا تھا۔ اس نے سوچا' نجمہ خالہ سے ہی پوچھ لے۔ اس نے پوچھا۔ نجمہ خالہ نے کہا۔ ''اس عورت کو کہتے ہیں' جو کسی بہت قابل قدر چیز کی توہین کرے۔ وہ اسے مل رہی ہو۔ مگر وہ نہ لے۔ اس میں کیڑے...... عیب نکالے۔''

عبداللہ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''خالہ...... آپ ناقدری ہیں؟''

نجمہ خالہ مسکرائیں۔ ''نہیں بھئی' اللہ مجھے محفوظ رکھے۔ میں تو معمولی چیز کی بھی بڑی قدر کرتی ہوں۔ کسی چیز کو نہیں ٹھکراتی۔ اور ہر چیز کے لیے اللہ کا شکر ادا



کرتی ہوں۔ ناقدر آدمی تو ناشکرا بھی ہوتا ہے۔'' انہوں نے کہا۔ پھر اچانک انہیں خیال آیا تو انہوں نے پوچھ لیا۔ ''تم نے یہ بات کیوں پوچھی عبداللہ؟''

عبداللہ نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ ''تو پھر ان بابا نے آپ کو ناقدری کیوں کہا تھا؟'' اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''کس بابا نے؟'' نجمہ نے حیرت سے کہا۔ اسے وہ واقعہ یاد ہی نہیں تھا۔

عبداللہ نے واقعہ دہرا کر اسے یاد دلایا تو اسے یاد آ گیا۔ ''ہاں...... یاد آیا۔ اس نے کھانا لینے سے منع کر دیا تھا۔''

''آپ ناقدری نہیں ہیں تو ان بابا نے آپ کو ایسا کیوں کہا؟'' عبداللہ نے پھر سوال اٹھایا۔

نجمہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ''میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ اب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی جعلی بابا ہو...... ڈھونگی ہو۔ ایسے لوگ دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے کچھ بھی کہہ دیتے ہیں۔''

''لیکن خالہ' وہ تو ایسا نہیں لگتا تھا۔'' عبداللہ نے کہا۔ لیکن دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ واقعی بابا جعلی بھی ہو سکتا ہے۔

''مجھے بھی وہ ایسا نہیں لگتا تھا۔'' نجمہ نے بڑی سچائی سے کہا۔ ''اور سچ مچ کے مجذوب ایسے ہوتے ہیں کہ وہ جو کہہ دیں' ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان کو اللہ نے نظر دی ہوتی ہے اور وہ دور تک دیکھتے ہیں۔ تو اس بابا کا مطلب یہ ہے کہ میں کبھی نہ کبھی کسی بہت بڑی نعمت کو ٹھکراؤں گی...... ناقدری کروں گی اس کی۔ اللہ مجھے محفوظ رکھے۔ اب میں یہ بات یاد رکھوں گی اور اس سے بچنے کی کوشش کروں گی۔''

نجمہ خالہ کی آخری بات سے تائید ہوتی تھی کہ پہلے سے پتا چل جائے تو آدمی بچ بھی سکتا ہے۔ جیسے وہ خود کوشش کر رہا تھا۔

عبداللہ کا دل نجمہ خالہ کے ہاں خوب لگنے لگا۔ غزالہ کے ابا بھی اس سے محبت کرتے تھے۔ پہلی بار انہوں نے عبداللہ کو دیکھا تو خوش ہو کر بولے۔

''آہا...... ہمارے گھر میں چاند نکل آیا۔ قسمت جاگ گئی ہماری۔ میاں عبداللہ تم تو نظر ہی نہیں آتے۔ کہاں رہتے ہو۔''

''جی گھر میں ہی رہتا ہوں۔ اب قرآن پڑھنے کے لیے یہاں آتا ہوں۔''

''بہت اچھا کرتے ہو' روز آیا کرو اور دل لگا کر پڑھا کرو۔''

حمید صاحب کبھی خالی ہاتھ گھر نہیں آتے تھے۔ ہمیشہ غزالہ کے لیے کچھ نہ کچھ لاتے تھے۔ اب وہ جو کچھ غزالہ کے لیے لاتے' وہ عبداللہ کے لیے بھی لاتے۔ وہ اس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔

پھر ایک دن باتوں باتوں میں غزالہ نے عبداللہ کو بتایا کہ رات کو ابو سونے سے پہلے ہمیشہ اسے کہانی سناتے ہیں۔ یہ سن کر عبداللہ کا دل مچل گیا۔ اسے کہانی سننے کا بہت شوق تھا۔ پہلے دادا اور دادی اسے کہانیاں سناتے تھے۔ ان کے مرنے کے بعد وہ اس نعمت سے محروم ہو گیا۔ ابا دکان سے تھکے ہوئے آتے تھے۔ بستر پر لیٹنے کے بعد وہ جاگ ہی نہیں سکتے تھے۔ فوراً ہی سو جاتے تھے عبداللہ نے کبھی ان سے فرمائش بھی نہیں کی۔ ہاں' اس نے اماں سے کہا لیکن اماں کو کہانی سنانا آتا ہی نہیں تھا اور بہنیں جلدی سو جاتی تھیں۔

مگر عبداللہ کو اس سلسلے میں محرومی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ یہ محرومی دادا اور دادی کی محرومی میں چھپ گئی تھی۔ کیونکہ وہ زیادہ بڑی محرومی تھی۔ لیکن اب غزالہ نے اسے بتایا کہ ابو اسے بڑے مزے کی کہانیاں سناتے ہیں تو اسے محرومی کا احساس ہوا۔

نجمہ نے اس کے تاثرات بھانپ لیے۔ ''کیا ہوا عبداللہ؟ تم ایسے کیوں



ہو گئے؟''

''کچھ نہیں خالہ۔ دادا دادی یاد آ گئے۔ وہ مجھے کہانیاں سناتے تھے۔''

''تو اب تمہیں کوئی کہانی نہیں سناتا؟'' غزالہ نے پوچھا۔

''نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔'' عبداللہ نے اداسی سے کہا۔

''تو تم ہمارے ہاں آ کر کہانی سن لیا کرو۔''

عبداللہ کے چہرے پر بے یقینی کا سایہ لہرایا۔ اس نے ملتجیانہ نظروں سے نجمہ خالہ کو دیکھا۔

''ہاں' کیوں نہیں۔ آپا اجازت دیں تو آ جایا کرو۔'' نجمہ خالہ نے کہا۔

اماں سے پوچھا تو انہوں نے اسے اجازت دے دی۔ اب وہ رات کو بھی نجمہ خالہ کے ہاں چلا جاتا۔ کبھی غزالہ خود اسے بلانے کے لیے آ جاتی۔ اسے بہر حال کھوئی ہوئی ایک بہت بڑی خوشی مل گئی۔ اس کا نجمہ خالہ کے ہاں جانا اور بڑھ گیا۔

اسب کچھ پہلے ہی جیسا تھا۔ مگر پھر بھی بہت بڑی تبدیلی آئی تھی۔ عبداللہ کا خوف ویسا ہی تھا...... اتنا ہی شدید۔ لیکن وہ ہر وقت اس پر طاری نہیں رہتا تھا۔ اور اب وہ عام طور پر خوش رہتا تھا۔ کم از کم ناخوش رہنے سے تو وہ محفوظ ہی ہو گیا تھا۔

اچھا وقت پر لگا کر اڑتا ہے۔ گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ وقت گزرتا رہا۔ تبدیلیاں آتی رہیں۔ چھ سال گزر گئے۔ اس عرصے میں تین بہنوں کی اور شادی ہو گئی۔ اب گھر میں صرف آمنہ رہ گئی تھی۔ گھر سونا سونا لگتا تھا۔ لیکن چھٹی کے دن کوئی نہ کوئی بہن آ جاتی اور گھر میں اس کے بچوں کی وجہ سے رونق ہو جاتی۔ بڑی بہنوں کے بچے اب بڑے ہو گئے تھے۔ عبداللہ کو پہلی بار پتا چلا کہ بچے اسے اچھے

لگتے ہیں۔ ورنہ چھوٹے بچوں سے تو وہ گھبراتا تھا۔ اسے گھن بھی آتی تھی اور انہیں گود میں لیتے ہوئے ڈر بھی لگتا تھا۔ مگر اب وہ آتے تو وہ ان کے ساتھ کھیلتا' انہیں باہر لے جا کر چیز دلاتا۔ ان کے منہ سے اپنے لیے ماموں سننا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ آتے تو وہ سب کچھ بھول جاتا۔ اس روز اسے نجمہ خالہ کے گھر جانے کا خیال بھی نہ آتا۔

یہ بھی اللہ کی قدرت تھی کہ بیٹے کو ترسنے والی سات بیٹیوں کی ماں زلیخا کی تمام بیٹیوں کو اللہ نے بیٹوں سے نوازا تھا۔ چھ بیٹیوں میں سے صرف ایک کے ہاں ایک بیٹی ہوئی تھی۔ عبداللہ جو ہمیشہ بھائی کو ترستا رہا تھا۔ بھانجوں سے بہت خوش ہوتا تھا۔ وہ ماموں کہتے تو اسے احساس ہوتا کہ وہ بڑا ہو گیا ہے۔ اور ان کے ساتھ کھیلتے ہوئے اسے احساس ہوتا کہ اسے کئی بھائی مل گئے ہیں۔

باقی سب کچھ ویسا ہی تھا۔ چھت پر چڑھنے سے وہ اب بھی گھبراتا تھا۔ سڑک پار کرنا اسے دشوار ترین کام معلوم ہوتا۔ بعض اوقات پندرہ منٹ ہو جاتے اور وہ سڑک پار نہ کر پاتا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ بستی پھیل گئی تھی اور سڑک پر ٹریفک بہت بڑھ گیا تھا۔

کچھ بھی ہو' اُس کے اندر کے خوف اب بھی توانا تھے۔ خاص طور پر موت کے خیال سے اسے پسینے چھوٹنے لگتے تھے۔ لیکن پندرہ سال کی عمر میں پے درپے کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ اس کی زندگی یکسر تبدیل ہو گئی۔

❁ ............ ❁ ............ ❁

اس رات نوشاد گھر آیا اور کھانا کھانے کے لیے بیٹھا تو اسے عبداللہ کا خیال آیا۔ ''یہ عبداللہ کہاں ہے؟'' اس نے بیوی سے پوچھا۔

''نجمہ کے ہاں ہے۔ کہانی سن رہا ہوگا اس کے ابو سے۔''



نوشاد چند لمحوں کے لیے منہ کے نوالے کو بھی بھول گیا۔ اسے خیال آیا کہ اس کا بیٹا لڑکپن اور جوانی کے ملکوں کے درمیان No man`s Land پر کھڑا ہے۔ لیکن ماں کے لیے شاید وہ اب بھی چھوٹا سا بچہ تھا' جسے کہانیاں سننے کا شوق تھا...... اور گھر میں جسے کہانی سنانے والا کوئی نہیں تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے وہ بہت کچھ سوچتا رہا۔ اسے احساس تھا کہ جس گھر میں وہ جاتا ہے' وہاں ایک جوان ہوتی لڑکی بھی موجود ہے۔ اور وہ سات بیٹوں کا باپ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیٹیاں کتنی جلدی جوان ہو جاتی ہیں...... بیٹوں سے بھی پہلے۔ اسے کسی کے کردار پر شک نہیں تھا...... نہ اپنے بیٹے پر اور نہ نجمہ کی بیٹی پر۔ وہ دونوں معصوم تھے۔ لیکن فطرت اور جبلت کی طاقت کو وہ سمجھتا تھا۔ کسی بھی وقت آگہی کا ایک لمحہ اترے گا تو چوکنے پن سے عاری اور بے خبر معصومیت ختم ہو جائے گی۔ اور شیطان ایسے ہی موقعوں کی تاک میں رہتا ہے۔ اس کے لئے سب سے آسان کام معصوم لوگوں کو ورغلانا ہے۔ ایسے میں معصومیت اور معصیت کے درمیان بس بال برابر فاصلہ رہ جاتا ہے۔

پھر دوسرا زاویہ بھی تھا' جسے سات بیٹیوں کے باپ سے بڑھ کر کون سمجھ سکتا تھا۔ بچوں کی معصومیت اپنی جگہ' لیکن اس گھر میں کوئی لڑکا بھی نہیں تھا۔ بس ایک جوان ہوتی ہوئی لڑکی اور اس کی ماں۔ اس گھر میں عبداللہ کا آنا جانا پہلے تو محلے والوں کی زبانیں کھولتا...... اور پھر انگلیاں اٹھنے لگتیں۔ اس میں نوشاد کا یا عبداللہ کا کوئی نقصان نہیں تھا۔ البتہ لڑکی بدنام ہو جاتی۔

سو نوشاد اُس لڑکی کی بھلائی سوچ رہا تھا۔ اور اس نے ایک فیصلہ بھی کر لیا۔

زلیخا جواب دینے کے بعد اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ نوشاد بہت آہستگی سے کھا رہا تھا۔ اس کا دھیان کھانے میں نہیں تھا۔

پھر اچانک نوشاد نے بے حد سرسری انداز میں کہا۔ ''عبداللہ قرآن پڑھنے
بھی تو جاتا ہے حمید صاحب کے ہاں؟''

''جی ہاں''

''قرآن ختم بھی کیا اس نے؟''

''ہاں جی۔ کب کا کر لیا۔'' زلیخا نے جواب دیا۔ پھر شکایتاً بولی۔ ''تم اپنے
کاروبار میں ایسے مگن ہوتے ہو کہ بچوں کے بارے میں تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں
ہوتا۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے سوچنا چاہیئے''۔ نوشاد نے کہا۔ پھر سرسری انداز
میں بولا۔ ''چلو...... اب یہ وقت خالی ہوگا اُس کے پاس۔ اس سے کہو اب پڑھائی
پر زیادہ دھیان دے۔ اگلے سال میٹرک کا امتحان دینا ہے اسے۔''

''جی ٹھیک ہے۔ کہہ دوں گی۔'' زلیخا نے آہستہ سے کہا۔ ۳۲ سال کی
ازدواجی زندگی میں کوئی عورت اپنے شوہر کو جتنا سمجھ سکتی ہے' وہ بھی سمجھتی تھی۔ اُس
نے پوری طرح سمجھ لیا کہ نوشاد کس انداز میں سوچ رہا ہے۔ اور وہ نوشاد کے آخری
جملے کا مطلب بھی سمجھ گئی۔ اب یہ وقت خالی ہوگا اُس کے پاس'...... اس جملے میں
ایک حکم چھپا تھا۔ عبداللہ قرآن پڑھ چکا ہے۔ اب اسے حمید صاحب کے گھر جانے
کی ضرورت نہیں۔ مگر وہ حیران تھی کہ نوشاد نے رات کو کہانی سننے کے لئے جانے
کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگایا۔ یہ نہیں کہا کہ اب وہ بچہ نہیں رہا ہے۔ اب اسے
کہانیاں سننے کی ضرورت نہیں۔ کہانیوں کا شوق ہے تو کتابیں لا کر پڑھ لیا کرے۔

لیکن اس کی یہ حیرت تین دن بعد دور ہوگئی' جب نوشاد نے ایک فیصلہ سنایا۔
تب زلیخا کو اپنے شوہر کی عقل مندی پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ وہ حیرت سے سوچتی رہی



یہ نرم دل اور محبت کرنے والا شخص کتنا سمجھ دار ہے۔

اگلے روز عبداللہ نجمہ کے ہاں جانے لگا تو زلیخا نے اُسے روک دیا اور نوشاد کا
حکم اُسے دیا۔

''مگر اماں' پڑھائی پر تو میں پورا دھیان دیتا ہوں۔''

''تیرے ابا کے خیال میں زیادہ دھیان دینے کی ضرورت ہے۔''

''ٹھیک ہے اماں۔ میں ابھی پندرہ منٹ میں آ جاؤں گا۔''

زلیخا نے سمجھ لیا کہ بیٹے کو کھل کر سمجھانا پڑے گا۔ ''دیکھ بیٹے۔ اب تُو جوان
رہا ہے۔ اور اُس گھر میں ایک تیرے برابر کی لڑکی بھی ہے۔ اب تُو پہلے کی طرح
وہاں نہیں جا سکتا۔''

''مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے اماں۔''

''فرق پڑتا ہے۔ دنیا میں رہنا ہے تو دنیا کے اصولوں پر چلنا پڑتا ہے۔''

عبداللہ طبعاً فرماں بردار لڑکا تھا۔ اس نے ماں کی بات مان لی۔ لیکن اس کے
لئے حجرہ ہفت بلا کا دوسرا دروازہ کھل گیا۔ پہلا دروازہ بھی اماں ہی نے کھولا
تھا...... مجذوب کی باتوں کے حوالے سے۔ اور اس خوف سے وہ اب تک جان
نہیں چھڑا سکا تھا۔

وہ نجمہ خالہ کے گھر نہیں گیا۔ مگر صحن میں چارپائی پر بیٹھ کر اسی بارے میں
سوچتا رہا۔ دنیا میں رہنا' دنیا کے اصولوں پر چلنا' یہ کچھ بھی اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا
تھا۔ یہ کیا کہ ایک دن میں سب کچھ بدل جائے۔ ایک دن پہلے آپ ایک جگہ
جا سکتے ہیں۔ اور اگلے دن اُس کے لئے ممانعت ہو جاتی ہے۔ اس نے تو اب تک
یہی دیکھا تھا کہ تبدیلیاں آہستہ آہستہ رونما ہوتی ہیں۔ ایک دم ایک' پل میں نہیں
آ جاتیں۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہ دنیا کا اصول ہے کہ عبداللہ نجمہ خالہ کے گھر نہیں جا سکتا۔ اب یہ بات بھی اس کے لئے ناقابل فہم تھی کہ دنیا کو عبداللہ سے اور نجمہ خالہ سے کیا غرض ہے۔ اور اس نے ان کے لئے اصول کیوں بنا دیئے ہیں۔ جبکہ وہ کسی کی کوئی مدد بھی نہیں کرتی۔ وہ کتنا خوف زدہ رہتا ہے۔ اتنے برسوں میں ان پر کیا گزری...... صرف ایک بابا کی وجہ سے جو کھانا مانگنے آیا تھا۔ اور دنیا نے اس کی کیا مدد کی۔ کسی کو پتا بھی نہیں کہ اس پر کیا گزری۔ اور اماں کو دنیا کی اتنی فکر ہے کہ اس سے اس کی خوشی چھینے لے رہی ہیں۔

زلیخا بیٹے کو دیکھ رہی تھی...... اس کی کیفیت کو سمجھ رہی تھی۔ وہ پریشان تھی کہ کیا کرے۔ وہ اپنی جگہ سوچ رہی تھی۔

ادھر سوچتے سوچتے عبداللہ کو خیال آیا کہ اماں کے بیان میں دو اہم جملے تھے۔ پہلا یہ تھا کہ اب وہ جوان ہو رہا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی آ رہی ہے؟ بہت غور کرنے پر بھی اس کی سمجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکی۔ وہ تو ویسا ہی تھا۔ اس نے سر پر ہاتھ پھیر کر دیکھا کہ کہیں وہاں سینگ تو نہیں نکل آئے ہیں۔ مگر وہاں بالوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ کبھی ایسا لڑکا نہیں رہا تھا' جو خود کو آئینے میں غور سے دیکھتا ہو۔ ویسے تو کوئی ایسا نہیں ہوتا' جو ہر روز کئی بار خود کو نہ دیکھتا ہو۔ وہ بھی دیکھتا تھا۔ لیکن دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ مگر اس وقت یہ اس کے لئے ضروری تھا۔

وہ سیدھا اماں کے کمرے میں چلا گیا' جہاں لوہے کی الماری تھی جس میں قد آدم شیشہ لگا تھا۔ اماں اور آپا اس وقت کچن میں تھیں۔ وہ اطمینان سے آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

ایک نظر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ اماں ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ وہ جوان ہوا ہو یا



نہ ہوا ہو' بڑا ضرور ہوا ہے۔ اسے یاد تھا کہ اس آئینے میں اسے اپنا چہرہ نظر آتا تھا۔ لیکن اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں وجہ ہی نہیں آئی۔ الماری کا آئینہ گردن تک اس کا عکس دکھا رہا تھا۔ اوپر پورا چہرہ غائب تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

پھر اچانک اس کی سمجھ میں بڑے ہونے کا مفہوم آ گیا۔ وہ لمبا ہوا تھا۔ اس لئے اس کا چہرہ آئینے سے باہر ہو گیا تھا۔ تو میں بڑا ہو گیا ہوں۔ اس نے خود سے کہا۔ اس کے لہجے میں فخر تھا۔ جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا تھا۔ لیکن اسے لگتا تھا کہ کوئی بڑی بات ہو گئی ہے۔

اب اسے اپنا چہرہ دیکھنا تھا۔ اس کے لئے جھکنا ضروری تھا۔ وہ جھکا تو اس کے چہرے کا عکس آئینے میں نظر آیا۔ اور اس لمحے اسے شاک سا لگا۔ وہ اس کا چہرہ تو نہیں...... کوئی اجنبی چہرہ تھا۔ اپنا جو چہرہ اسے یاد تھا' یہ وہ نہیں تھا۔ وہ تو روشن چہرہ تھا۔ بے داغ شفاف جلد۔ بھرے بھرے رخسار۔ جبکہ اس چہرے پر نکلنے کے بعد مرجھا جانے والے مہاسوں کے چھوڑے ہوئے نشان تھے' جن کی وجہ سے وہ کھردرا لگ رہا تھا۔ اور رخساروں پر' ٹھوڑی پر بھورے رنگ کا گہرا رواں تھا' ایسا جیسے کہیں کہیں زمین پر خودرو گھاس اگ جاتی ہے۔

اسے خود سے کراہت آنے لگی۔ یہ میں کیسا ہو گیا ہوں۔ بدشکل' کھردرا۔ نہیں...... یہ میرا چہرہ نہیں۔ اپنا چہرہ تو میں روز دیکھتا ہوں۔ اور اگر روز یہ چہرہ دیکھتا تو اس وقت یہ مجھے اجنبی کیوں لگتا۔ یہ یقیناً اس آئینے میں کوئی گڑبڑ ہے۔

اسے اچانک خیال آیا کہ ہر صبح' ہر شام اور اسکول سے آنے کے بعد وہ جس آئینے میں چہرہ دیکھتا ہے' وہ تو باتھ روم کا چھوٹا آئینہ ہے' جو واش بیسن کے اوپر لگا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ الماری کے آئینے میں عکس دیکھنے کے لئے جھکتے جھکتے اس کی کمر دکھ گئی ہے۔ وہ سیدھا ہو گیا۔ پھر وہ باتھ روم میں گیا' وہاں

آئینہ صحیح جگہ لگا تھا۔ اسے اپنا عکس دیکھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

الماری کا آئینہ کچھ کچھ اترا ہوا تھا۔ جبکہ باتھ روم کا آئینہ بالکل ٹھیک تھا۔ جو کچھ اس نے الماری کے آئینے میں دیکھا تھا' اس آئینے نے وہی کچھ بالکل صاف اور واضح کر کے دکھا دیا۔ اس بار اس کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔ یہ آئینہ تو میں روز دیکھتا رہا ہوں۔ آج صبح بھی دیکھا تھا۔ پھر مجھے یہ فرق کیوں نظر نہیں آیا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

آئینہ ہر آدمی دیکھتا ہے۔ لیکن اپنے اپنے مزاج کے مطابق۔ خود پسند اور نرگسیت کے مارے لوگ گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو دیکھتے رہتے ہیں۔ انہیں بعد میں بھی اپنے چہرے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اور خود سے بے پروا لوگ آئینہ صرف اس لئے دیکھتے ہیں کہ وہ ان کے سامنے ہوتا ہے۔ اور مجبوراً دیکھتے ہیں۔ مگر دیکھ کر بھی نہیں دیکھتے۔ عبداللہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ انسانوں کے اس دوسرے قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔

بہرکیف اس آئینے میں دیکھ کر عبداللہ کو اپنا آپ اچھا نہیں لگا۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں ایسا تو نہیں تھا۔ اس سے اچھا تھا۔ یہ کیا ہوا۔ اسی وقت اماں کی آواز اس کی سماعت میں ابھری...... اب تو جوان ہو رہا ہے بیٹے......

تو یہ ہے جوان ہونا۔ اس نے تلخی سے سوچا۔ یہ تو سراسر نقصان کا سودا ہے۔ صورت بھی خراب ہو گئی۔ اور نجمہ خالہ کے ہاں جانا بھی چھوٹ گیا۔ اسے جوانی سے چڑ سی محسوس ہونے لگی۔ کیا ضروری تھا کہ میں جوان ہوتا۔

پھر اسے اماں کا دوسرا جملہ یاد آیا۔ اماں نے غزالہ کے بارے میں کہا تھا کہ وہ بھی اس کے برابر کی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بھی جوان ہو رہی ہے۔ تو کیا وہ بھی اس کی طرح بدصورت ہو گئی ہے۔



اس نے غزالہ کا تصور کیا۔ لیکن وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اس کے گھر میں اس کے ساتھ وقت گزارنے کے باوجود اس نے کبھی غزالہ کو نظر بھر کے نہیں دیکھا تھا۔ وہ شاید اسے ایسے ہی دیکھتا تھا' جیسے ہر روز آئینہ دیکھتا تھا۔ اس کے تصور میں پانچ سالہ غزالہ کا چہرہ تھا۔

مگر اب اسے تجسس ہونے لگا۔ اس تجسس میں اشتیاق بھی تھا۔ اب وہ غزالہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن کیسے...... اماں نے تو جانے سے منع کر دیا ہے۔

اُدھر زلیخا بھی اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ بیٹے کی مایوسی کا سوچ کر اس کا دل کٹ رہا تھا۔ وہ بس ایک ہی بات سوچ رہی تھی۔ کیا کرے۔ کیسے بیٹے کی دل جوئی کرے۔ اس پابندی کے بعد وہ کتنا دل گرفتہ نظر آنے لگا ہے۔

پھر اسے ایک نکتہ سوجھ ہی گیا۔ نوشاد نے کچھ نہیں کہہ کر بہت کچھ کہا تھا۔ اُس نے کہہ دیا تھا کہ اب عبداللہ کو نجمہ خالہ کے ہاں قرآن پڑھنے کے لئے جانے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ لیکن اُس نے کہانی سننے کے لئے جانے کو منع نہیں کیا تھا۔ ویسے وہ جانتی تھی کہ اُس کے عقل مند شوہر نے اس سلسلہ میں بھی کچھ نہ کچھ سوچا ہوگا۔ مگر فی الحال تو وہ بیٹے کو بہلا سکتی ہے۔

وہ کچن سے باہر آئی۔ عبداللہ صحن میں پڑی چارپائی پر یوں دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا تھا' جیسے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہو۔ اسے اُس پر ترس آنے لگا۔ وہ اُس کے پاس بیٹھ گئی۔ ''عبداللہ...... میرے بیٹے...... کیا سوچ رہے ہو تم؟''

''سوچ رہا ہوں۔ بڑے ہونے کے کتنے نقصان ہیں۔ فائدہ کیا ہے بڑے ہونے کا۔'' عبداللہ نے سچائی سے بتا دیا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

''بہت فائدے ہیں بڑے ہونے کے۔ اور یہ تو بتاؤ' نقصان کیا ہے؟''

''یہ نقصان کم ہے کہ اب میں کہانی نہیں سن سکوں گا۔''

''یہ تم سے کس نے کہا۔ کہانی سننے تو تم جا سکتے ہو۔''

''سچ اماں۔'' عبداللہ کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ ''واقعی اماں۔''

''ہاں۔ اس میں کیا حرج ہے۔'' زلیخا نے کہا۔ مگر دل میں وہ سوچ رہی تھی کہ تمہارے ابا اسے بھی کسی نہ کسی طرح روک دیں گے۔ پھر وہ بولی۔ ''اچھا بیٹے...... یہ تو بتاؤ' حمید بھائی کہانیاں کس طرح کی سناتے ہیں۔''

''پہلے تو پریوں کی' دیوؤں کی کہانیاں بناتے تھے۔ اب عبداللہ کے لہجے میں زندگی تھی' چہکار ہی تھی۔ ''مگر ایک دو سال سے تاریخی راقعات سناتے ہیں۔ بہادری کے قصے سناتے ہیں۔''

زلیخا کو تجسس ہونے لگا۔ ''مثلاً؟''

''ایک واقعہ میں کبھی نہیں بھولتا۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''انہوں نے کسی صحابی کا واقعہ سنایا تھا' جنہیں ایک جنگ میں پرچم اٹھانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ پرچم کسی قیمت پر گرنا نہیں چاہیے۔ وہ پرچم ہاتھ میں لئے لڑتے رہے۔ پھر ان کا سیدھا ہاتھ کٹ گیا۔ انہوں نے پرچم بائیں ہاتھ میں لے لیا۔ کچھ دیر بعد ان کا بایاں ہاتھ بھی کٹ گیا۔ انہوں نے پرچم کو دانتوں میں دبا لیا۔ مگر گرنے نہیں دیا۔ میں سوچتا ہوں اماں' وہ کتنے بہادر اور حوصلے والے تھے۔''

''حوصلہ دینے والا اللہ ہے میرے بیٹے۔'' زلیخا کے دل میں کوئی طاقت ور جذبہ انگڑائیاں لینے لگا۔ اُس کے اندر کوئی تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔

''اماں...... میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی ایسا بنوں۔ لیکن سوچتا ہوں کہ مجھ میں ایسا حوصلہ ہے ہی نہیں۔ میں تو تکلیف سے...... چوٹ لگنے سے ڈرتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں' ان کے ہاتھ کٹے ہوں گے تو کتنی تکلیف ہوئی ہوگی انہیں۔ اماں' ان کے ہاتھ کٹ کر جسم سے الگ ہو گئے تھے۔ میں تو اتنی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا اماں۔''

زلیخا کے اندر جو پچھتاوا آٹھ برس سے پل رہا تھا' رہ رہ کر ڈنک مارتا تھا' پوری شدت سے ابھر آیا۔ اُس نے بیٹے کو بزدل بنا کر رکھ دیا تھا۔ اُس نے سوچا' آج اس کی



تلافی کر دی جائے۔ اُس نے کہا۔ ''کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا میرے بیٹے۔''

''لیکن انہوں نے برداشت کی تھی اماں۔''

عورت کتنی ہی جاہل اور بے علم ہو۔ لیکن ایمان پر پیدا ہوئی ہو تو اُس کا ایمان بے حد توانا ہوتا ہے اور کبھی نہ کبھی ابھر آتا ہے۔ زلیخا اس وقت ایسی ہی کیفیت میں تھی۔

''بیٹے' انہیں تکلیف کا پتا بھی نہیں چلا ہوگا۔ جو لوگ اللہ سے محبت کرتے ہیں' اس کے فرماں بردار ہوتے ہیں اور اس کی راہ میں لڑتے ہیں' اللہ انہیں ان کی بڑی سے بڑی تکلیف کا پتا نہیں چلنے دیتا۔ اور اللہ انہیں حوصلہ اور برداشت عطا فرماتا ہے۔ ورنہ بیٹے یہ انسان کے بس کی بات نہیں۔''

عبداللہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر سر اٹھا کر بولا۔ ''میں اللہ سے محبت کروں' اس کا حکم مانوں تو وہ مجھے حوصلہ اور برداشت دے گا۔''

''ضرور دے گا' اور ایسی طاقت بھی جو صرف اللہ کے ان بندوں کو ملتی ہے۔''

وہاں سے ہٹی تو زلیخا کے دل کا بوجھ بڑی حد تک کم ہو چکا تھا۔

رات کو عبداللہ نجمہ خالہ کے گھر چلا گیا۔ نوشاد گھر آیا تو وہ ہیں تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے پھر اُس نے عبداللہ کے بارے میں پوچھا' زُلیخا نے بتایا تو وہ چپ رہا۔ کوئی تبصرہ نہ کوئی ردعمل۔ زلیخا اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ نجانے ان کے دل میں کیا ہے۔ کیا سوچ رکھا ہے انہوں نے۔ اُس نے سوچا۔ پھر بولی۔ ''آج شام وہ جا رہا تھا۔ میں نے منع کر دیا۔ کہا' اپنی پڑھائی پر دھیان دو اب۔''

''بہت اچھا کیا۔'' نوشاد نے دھیرے سے کہا۔

پھر زلیخا نے اسے بتایا کہ حمید صاحب اسے کیسی کہانیاں سناتے ہیں۔ وہ یہ سن کر خوش ہوا۔

اس کے بعد جو چھٹی کا دن آیا تو دکان پر جانے سے پہلے نوشاد نے عبداللہ کو اپنے پاس بلایا۔ ''دیکھو بیٹے' اب تم بڑے ... ہے ہو'' اُس نے کہا۔

عبداللہ نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ حالانکہ وہ اس بڑے ہونے سے بیزار تھا۔

''تو اب تمہیں میرا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔'' نوشاد نے کہا۔ ''تمہی میرا بازو ہو...... میری طاقت ہو۔''

یہ سننا عبداللہ کو بہت اچھا لگا۔ ''میں حاضر ہوں ابا۔''

''تم ہر شام چھ بجے دکان پر آ جایا کرو اور دکان بند ہونے تک میرے ساتھ رہا کرو۔''

عبداللہ خوش ہو گیا۔ ''ضرور ابا۔'' اُس نے کہا۔ وہ تو ہمیشہ سے دکان پر کام کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ابا ہی منع کر دیتے تھے۔ ''اور چھٹی والے دن ابا میں پورے دن دکان پر رہوں گا۔''

''وہ تمہاری مرضی ہے۔ چاہو تو چھٹی کر سکتے ہو۔''

یہ آواز زلیخا کے کان میں پڑی تو وہ لپکی ہوئی آئی۔ ''یہ کیا کر رہے ہو تم۔ اسے پڑھا لکھا کر دکان پر بٹھاؤ گے؟'' اُس کے لہجے میں ملامت تھی۔

''تو اور کیا۔ اپنا کاروبار ہوتے ہوئے یہ کہیں ملازمت کرے، یہ تو شرم کی بات ہو گی۔'' نوشاد نے کہا۔ ''تمہارا مسئلہ یہ ہے زلیخا کہ تم کچھ سمجھتی نہیں ہو۔ تعلیم کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ آدمی پیسہ کمائے یا تعلیم کے غرور میں ناکارہ ہو جائے۔ تعلیم تو ذہن کو روشن کرنے کے لئے، آدمی کو دنیا کی، اپنے عہد کی آگہی دینے کے لئے ہوتی ہے۔ معاش سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ دکان پر بیٹھے گا تو اس سے اس کی تعلیم کی توہین نہیں ہو گی۔ اور میں اسے پڑھنے سے کبھی روکوں گا بھی نہیں۔''

''ابا ٹھیک کہہ رہے ہیں اماں۔'' عبداللہ نے جلدی سے کہا۔

وہ اُس روز بھی ضد کر کے نوشاد کے ساتھ دکان پر چلا گیا۔

✿......✿......✿

اگلے روز عبداللہ بال بال بچا۔ موت اسے چھو کر گزر گئی تھی!



اسکول سے واپسی پر سڑک پار کرتے ہوئے وہ معمول کے مطابق خوف زدہ تھا۔ کئی بار وہ سڑک پار کرنے کے لئے بڑھا۔ مگر فوراً ہی پلٹ آیا۔ کچھ اماں کی کل کی باتوں کا اثر تھا۔ اسے اپنی بزدلی اور خوف پر جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ اُس نے بائیں جانب دیکھا۔ اُس طرف سے آنے والی ویگن ابھی دور تھی۔ وہ داہنی جانب دیکھے بغیر فٹ پاتھ سے سڑک پر اتر آیا اور سڑک پار کرنے کے لئے بڑھا۔ بدقسمتی سے اُسی لمحے ویگن کی رفتار خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔ بہرحال وہ اب بھی بھاگتا تو سڑک پار کر سکتا تھا۔ لیکن اندر بیٹھا ہوا خوف آڑے آ گیا۔ ایک لمحے کو جو وہ جھجکا تو ویگن اور قریب آ گئی۔ اب سڑک پار کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ گھبرا کر واپسی کے لئے پلٹا۔

اُس لمحے اسے احساس ہوا کہ سڑک پر اترتے ہوئے اُس نے داہنی جانب نہیں دیکھا تھا۔ اس طرف سے ایک ٹرک آ رہا تھا...... اور اب وہ اُس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ خوف سے اُس کا جسم شل ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ اب ویگن سے بچ کر وہ سڑک پار نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ پھرتی کا مظاہرہ کرتا تو اس ٹرک سے بچ کر واپس جا سکتا تھا۔ لیکن وہ تو اب ہلنے کے قابل بھی نہیں تھا۔

اُس لمحے ایک عجیب بات ہوئی۔ واضح طور پر کسی انجانی قوت نے اُسے دھکا دیا اور وہ اڑتا ہوا فٹ پاتھ پر جا گرا۔ ٹرک اسے تقریباً چھوتا ہوا گزرا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ زیادہ لوگ نہیں تھے۔ دو چار افراد اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ ''چوٹ تو نہیں لگی؟ تم خیریت سے تو ہو بیٹے؟'' کسی نے پوچھا۔

وہ چت پڑا آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اُسے کوئی چوٹ نہیں لگی تھی۔

''بس اللہ نے بچا لیا۔ ورنہ بچنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔'' کوئی اور بولا۔

پھر وہ آواز ابھری جو آٹھ برس سے اُس کی سماعت میں رہ رہ کر گونجتی تھی، جس کے لفظ اس کے حافظے پر نقش ہو گئے تھے۔ ''بے شک اللہ ہی بچاتا ہے۔'' وہ یقینی طور پر اُس

بابا کی آواز تھی، جس سے برسوں پہلے اماں الجھی تھیں۔ ''اللہ نے جو لکھ دیا، وہ ٹل نہیں سکتا۔ وہ سعادت عطا فرمائے تو کوئی محروم کیسے ہوسکتا ہے۔''

عبداللہ اب بھی ہلنے کے قابل نہیں تھا۔ لیکن بڑی کوشش کے بعد اُس نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ بابا ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ اسے ایک نظر میں پہچان گیا۔ اتنے برسوں میں وہ ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔ ویسا ہی تھا، جیسا اُس دن ہے اپنے ہاتھ سے نوالہ کھلاتے ہوئے تھا۔

''آدمی کی عقل تو دیکھو۔ موت سے ڈرتا ہے۔'' مجذوب کہہ رہا تھا۔ ''اس چیز سے ڈرتا ہے، جس سے بچ نہیں سکتا۔ اور تو اور شہادت سے ڈرتا ہے۔ خوش بختی ہے اور بدبختی کو پکارتا ہے۔ یہ نہیں سمجھتا کہ خوف کیسا ہی ہو، وہ وقت سے پہلے نہیں مر سکتا۔ ہاں ہاتھ پاؤں ٹوٹ سکتے ہیں۔ وہ اپاہج ہوسکتا ہے۔''

وہاں موجود لوگ مجذوب کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیوں کہہ رہا ہے۔ یہ بات بس عبداللہ سمجھ سکتا تھا۔ لیکن اُس کا جسم شل تھا اور زبان منہ میں اینٹھ گئی تھی۔ وہ بولنا چاہتا تھا۔ لیکن بول نہیں سکتا تھا۔

مجذوب پلٹا اور چل دیا۔ چند لمحوں میں وہ عبداللہ کے حیطۂ نگاہ سے باہر ہوگیا۔ عبداللہ بے بسی سے پڑا رہا۔ پھر کسی نے سہارا دے کر اُسے اٹھایا۔ ''تم کھڑے ہوسکتے ہو؟''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''اب چل کر دکھاؤ۔''

وہ چند قدم آگے پیچھے چلا۔ کہیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ''میں ٹھیک ہوں۔'' اُس نے کہا اور جھک کر کتابیں سمیٹنے لگا۔

اُس روز اسکول میں وہ یہی کچھ سوچتا رہا۔ بابا کی آج کی بات اسے یاد آرہی تھی۔ خوف بھی آدمی کو وقت سے پہلے نہیں مار سکتا۔ البتہ معذور کرسکتا ہے۔ معذور! اُس نے



معذور لوگ دیکھے تھے۔ اندھے...... دوسروں کی مدد کے محتاج۔ لنگڑے...... بیساکھی کے سہارے چلنے والے۔ یہ تو وہ گوارا کر ہی نہیں سکتا۔ معذوری سے تو موت اچھی ہے۔ لیکن اللہ کی جو مرضی ہے، وہ پوری ہو کر رہتی ہے۔ گویا مرنے کا خوف بھی بے جا اور معذوری کا ڈر بھی غلط۔ مگر وہ کیا کرے۔ اپنے خوف کو کیسے دور کرے۔

کل رات اماں کہہ رہی تھیں کہ آدمی اللہ سے محبت کرے، اُس کی فرماں برداری کرے تو اللہ اسے حوصلہ دیتا ہے اور تکلیف سے بچاتا ہے۔ تو اللہ کا فرماں بردار تو وہ تھا۔ اللہ کا حکم مانتا تھا۔ ماں باپ کی ہر بات مانتا تھا، خواہ اچھی لگے یا نہ لگے۔ بڑوں کی، استادوں کی عزت کرتا تھا۔ چھوٹوں سے محبت کرتا تھا۔ ان پر شفقت کرتا تھا۔ جو جو باتیں اسے معلوم ہیں، ان پر عمل کرتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ اللہ سے محبت کیسے کرے۔ اس کا کیا طریقہ ہے۔ وہ سوچتا اور الجھتا رہا۔

پھر اسے خیال آیا کہ اماں اُسے تو سمجھا رہی تھیں۔ مگر اُس دن جب پہلی بار بابا کھانا مانگتا ہوا آیا تھا اور اُس نے شہادت کی بات کی تھی تو پہلے تو انہیں غصہ آیا تھا۔ اور پھر وہ ڈر گئی تھیں۔ انہوں نے بابا کی خوشامد کی تھی۔ تو جو اپنا ڈر دور نہیں کرسکتا، وہ کسی اور کو کیا سمجھا سکتا ہے۔

بہرحال اُس نے ارادہ کرلیا کہ اللہ کا فرماں بردار بنے گا۔ اور اللہ سے محبت کے بارے میں پوچھتا رہے گا۔ سمجھ میں آ گیا تو اللہ سے محبت بھی کرے گا۔ پھر دیکھے گا کہ اُس کا خوف دور ہوتا ہے، اُسے حوصلہ ملتا ہے یا نہیں۔

یہ ارادہ کرتے ہی اس کے اندر ایک عجیب سی مضبوطی پیدا ہوگئی۔ اسے طاقت اور توانائی کا احساس ہونے لگا۔

اس ارادے کا فوری نتیجہ ہی بے حد حوصلہ افزا تھا۔ اُس روز سڑک پار کرنے سے پہلے اُسے ڈر نہیں لگا۔ لیکن وہ بیچ سڑک پر تھا کہ اندر سے پھر خوف ابھر آیا۔ اُس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ گویا خوف ختم نہیں ہوا تھا۔ لیکن خوف کے خلاف ایک مزاحمت اُس کے

اندر پیدا ہو گئی تھی۔

❁ ........ ❁ ........ ❁

زلیخا کو خوشی بھی تھی اور فخر بھی کہ اس کا شوہر اتنا عقل مند ہے۔ لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی اور سانپ بھی مر گیا۔ اُس نے بیٹے سے یہ بھی نہیں کہا کہ اب اُس کا حمید صاحب کے گھر جانا مناسب نہیں۔ اسے یہ بھی جتا دیا کہ اب وہ بڑا ہو رہا ہے اور مستقبل میں اُس کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہوں گی۔ اور اس کے حمید صاحب کے گھر جانے کی روک تھام بھی کر دی۔ لطف یہ کہ بیٹا اُس میں خوش بھی تھا۔ وہ پورے دن دکان پر رہا اور واپس یوں آیا، جیسے کوئی تمغہ جیت کر لایا ہو۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ حمید صاحب کے گھر نہیں گیا ہے۔

مگر اس کے ساتھ ہی اسے خود پر غصہ بھی آیا اور افسوس بھی ہوا۔ اُس نے عبداللہ کو نجمہ کے ہاں جانے سے روکا تو عبداللہ کا اس سے وجہ پوچھنا بھی فطری تھا۔ وہ اسے بس اتنا کہہ دیتی کہ قرآن ختم ہو چکا ہے۔ اب وہ گھر پر بھی پڑھ سکتا ہے۔ مگر نہیں، اُس نے اسے قائل کرنے کی غرض سے یہ جتا دیا کہ وہ جوان ہو رہا ہے اور غزالہ بھی۔ یہ تو آ بیل مجھے مار والی بات تھی۔ اب لڑکا نجانے کیا کیا سوچے گا، جو ویسے اُس کے ذہن میں کبھی آتا بھی نہیں۔ غزالہ اور عبداللہ اتنے برس تک ایک دوسرے کے قریب رہے ہیں۔ اور اب عبداللہ دوسرے انداز میں بھی سوچ سکتا ہے۔ یہ ہوتا ہے تعلیم کا فائدہ۔ اُس نے کڑھ کر سوچا۔ ماں باپ تھوڑی بہت تعلیم بھی دلا دیتے تو وہ کم از کم اتنی بے وقوف نہ ہوتی۔ کچھ سمجھ داری تو ہوتی اُس میں۔ اُس نے تو نوشاد سے الٹ کام کیا۔ لاٹھی بھی ٹوٹ گئی اور سانپ بھی نہیں مرا۔

یہ سب سوچتے سوچتے وہ اچانک ایک جوان بیٹے کی ماں بن کر سوچنے لگی۔ چلو ایسا کچھ ہوتا ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد...... چند برسوں کے بعد عبداللہ کی شادی تو کرنی ہے۔ غزالہ میں ایسی کوئی برائی بھی نہیں۔



بلکہ سچ تو یہ تھا کہ وہ غزالہ کو پسند کرتی تھی۔ نجمہ نے اُس کی تربیت بہت اچھی کی تھی۔ وہ سگھڑ تھی، سلیقہ شعار اور ہنر مند تھی۔ ابھی سے پورا گھر سنبھال لیا تھا اُس نے سب سے بڑی بات یہ کہ وہ باحیا تھی، اچھے کردار کی مالک تھی، اور خوش اخلاق اور باتمیز بھی تھی۔ ایسی ہی بہو تو گھر روشن کرتی ہے۔

پھر اُس نے سوچا، وہ ہوا میں گرہیں لگا رہی ہے۔ بے پر کا کوا بنا رہی ہے۔ یہ سوچ کر وہ مسکرا دی۔

❁ ........ ❁ ........ ❁

تین دن ہو گئے۔ عبداللہ سہ پہر کے معمول کے مطابق قرآن پڑھنے نہیں آیا۔ لیکن نجمہ کو کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ کیونکہ رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ کہانی سننے کے لئے بہرحال آ رہا تھا۔ وہ دن میں نہ آنے کی وجہ اُس سے پوچھنا چاہتی تھی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ رات کا وقت اُس کا خالص حمید صاحب کے لئے ہوتا تھا۔

مگر چوتھے دن یعنی جمعے کو وہ رات کو بھی نہیں آیا۔

تین دن اُس نے تو صبر کر لیا تھا۔ غزالہ نے بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ مگر جمعے کی رات آٹھ بجتے ہی حمید صاحب نے عبداللہ کا انتظار شروع کر دیا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے انہوں نے پریشان ہو کر کہا۔ ''یہ عبداللہ ابھی تک نہیں آیا۔ کیا بات ہے؟''

''کہیں چلا گیا ہوگا۔'' نجمہ نے بے پروائی سے کہا۔

''ابو...... آپ کہانی تو سنائیں۔'' غزالہ بولی۔

''ابھی عبداللہ آ جائے گا، تب سناؤں گا۔'' حمید صاحب نے کہا

نو بج گئے۔ نجمہ دیکھ رہی تھی کہ حمید صاحب کی نظریں دروازے پر لگی ہیں۔ پھر غزالہ نے فرمائش کی تو انہوں نے کہانی شروع کر دی۔ لیکن صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ بے دلی سے سنا رہے ہیں۔ غزالہ تو معمول کے مطابق ان کے پلنگ پر اُن سے جڑ کر بیٹھی تھی۔ مگر ان کی نظریں بار بار اُس خالی کرسی کی طرف اٹھ رہی تھیں، جس پر عبداللہ

بیٹھتا تھا۔

جیسے تیسے انہوں نے کہانی پوری کی۔ پھر غزالہ سے کہا۔ ''اب سو جاؤ بیٹا۔ رات بہت ہوگئی ہے۔''

عبداللہ اگلے روز بھی نہیں آیا۔ نجمہ سمجھ گئی کہ جو کچھ وہ سمجھ رہی تھی' بات وہی ہے۔ اسے تو پہلے ہی دن یہ احساس ہوگیا تھا کہ عبداللہ اب کبھی نہیں آئے گا۔ یہ سوچتے ہوئے اُس نے صحن میں جھاڑو دیتی ہوئی غزالہ کو دیکھا تو اسے جھٹکا لگا۔ ارے...... یہ اتنی بڑی ہوگئی۔ یہ تو بڑی تیزی سے جوانی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ کیسی بے خبر ماں ہے! اُس نے ملامتی انداز میں سوچا۔

کیسی عجیب بات ہے۔ لڑکے بڑے ہوتے ہیں تو پتا ہی نہیں چلتا۔ ماؤں کے لئے وہ ویسے ہی چھوٹے سے رہتے ہیں۔ لیکن بیٹی کی طرف بڑھتی ہوئی جوانی کی آہٹ پر اُن کے کان لگے رہتے ہیں...... اور انہیں پہلے ہی سے پتا چل جاتا ہے۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ عبداللہ آئے گا تو اُسے غور سے دیکھے گی۔ وہ یقیناً بڑا ہو رہا ہے۔

عبداللہ کو وہ بہت شروع سے چاہتی تھی۔ کچھ اس لئے کہ اُس کے نزدیک وہ اللہ پاک کا معجزہ تھا۔ سات بہنوں کے بعد...... اور اتنے عرصے کے بعد وہ پیدا ہوا تھا کہ اُس کی ماں تک آس چھوڑ بیٹھی تھی۔ اور کچھ یوں بھی کہ عبداللہ طبعاً بہت نیک اور من موہنا بچہ تھا۔

نجمہ عمر میں زلیخا سے بہت چھوٹی تھی۔ وہ شادی کے بعد یہاں آئی تو اُس کے تقریباً ایک سال بعد زلیخا کے ہاں عبداللہ کی پیدائش ہوئی۔ خود نجمہ نے دو بیٹے کھوئے تھے۔ پہلا تو صرف دو دن زندہ رہا تھا۔ اور دوسرے نے تو اس دنیا میں سانس ہی نہیں لی تھی۔ اُس کے بعد غزالہ پیدا ہوئی تو وہ بھی بڑی پیچیدگیوں کے بعد...... اور ڈاکٹر نے نجمہ کو بتا دیا تھا کہ اب وہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔

یوں نجمہ کو بیٹے کا ارمان رہ گیا۔ شوہر کو کوئی عورت بھی شیئر نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن



بیٹے کی آرزو ایسی تھی کہ نجمہ نے بارہا حمید صاحب سے کہا کہ وہ دوسری شادی کر لیں۔

''دیکھو نجمہ' جو ہمارے نصیب میں تھا' ہمیں مل گیا ہے۔ اور میں اس پر مطمئن اور قانع ہوں۔'' حمید صاحب نے ہر بار یہی جواب دیا تھا۔

نجمہ کو بھی صبر آ گیا۔ بلکہ اسے اپنی جذباتیت پر حیرت بھی ہوئی کہ اُس نے دُور تک سوچنے اور دیکھنے نہیں دیا۔ سوکن کا بیٹا کون سا اس کا اپنا ہوتا۔ پرایا ہی ہوتا۔ اور گھر کا سکون الگ غارت ہوتا۔ کسی اور کے بیٹے کو اپنا سمجھنا ہی ہے تو کسی کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے شوہر کو خود دوسری شادی کا راستہ دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو حماقت ہی کہلائے گی۔

غیر محسوس طور پر اُس کے دل میں عبداللہ کی محبت پیدا ہوئی اور بڑھتی گئی۔ وہ بچپن ہی سے اس پر خصوصیت سے توجہ دیتی۔ وہ اُس کے لئے بیٹے ہی کی طرح تھا۔ وہ اُس کے لئے امید کی علامت بھی تھا۔ وہ سوچتی' باجی کو اللہ نے اتنے برسوں کی ناامیدی کے بعد یہ بیٹا دے دیا تو کیا پتا وہ مجھے بھی نواز دے۔

عبداللہ اُس کے ہاں پڑھنے آنے لگا تو وہ نہال ہوگئی۔ اُس نے ہمیشہ اُسے غزالہ سے بڑھ کر ہی سمجھا۔ ان آٹھ برسوں میں وہ سچ مچ ایک ماں کی ہی طرح اُس سے محبت کرنے لگی۔ لیکن وہ خود اس سے بے خبر تھی۔ یہ تو اب اُس نے آنا چھوڑا تو اسے اس محبت کا پتا چلا۔

اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ پرائی چیز تو پرائی ہی ہوتی ہے۔ کتنی ہی محبت کر لو' اپنی نہیں بنتی۔ کوئی حق جو نہیں ہوتا۔ مگر وہ اس کے لئے تڑپ رہی تھی۔ تین دن ہوگئے۔ ایک نظر بھی تو نہیں دیکھا اسے۔

اسے یقین ہوگیا کہ باجی نے عبداللہ کو روک دیا ہے۔ وہ بڑا جو ہو رہا ہے...... اور ادھر غزالہ بھی بڑی ہو رہی ہے۔ باجی کی جگہ وہ ہوتی تو وہ بھی یہی کرتی' آگ اور تیل کو تو ایک ساتھ نہیں رکھا جا سکتا۔ مگر میرا کیا قصور ہے کہ میں اس سے محروم ہوگئی۔ اُس نے

جھنجلا کر سوچا۔

پھر پہلی بار...... پہلی بار اس کے دل میں وہ خیال آیا۔ اور وہ حیران ہوئی کہ یہ بات اُس نے پہلے کیوں نہیں سوچی۔ ایسا ممکن ہو یا نہ ہو' اسے تو فطری طور پر یہ بات سوچنی تھی۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکی کہ یہ بات وہ سوچنا نہیں چاہتی ہوگی۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ کسی چیز کی آرزو کرنا بہت آسان ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر آرزو پوری بھی ہو۔ اور آرزو جتنی شدید ہوگی' پوری نہ ہونے پر مایوسی بھی اتنی ہی شدید ہوگی۔ اس ممکنہ اذیت سے بچنے کے لئے انسان کا شعور اس آرزو کو لاشعور میں دھکیل دیتا ہے۔ تاکہ آدمی اُس سے بے خبر رہے۔ اُس کے ساتھ بھی شاید یہی ہوا تھا۔ ورنہ ایک بیٹی کی ماں ہو کر تو اسے لازماً اس انداز میں سوچنا چاہیئے تھا۔ بہر حال اب جبکہ محرومی آ چکی تھی تو لاشعور نے احتیاط کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے اس آرزو کو شعور کی طرف دھکیل دیا تھا۔

اُس نے سوچا' یہ ناممکن تو نہیں۔ غزالہ کی عبداللہ سے شادی ہو سکتی ہے۔ بیٹی بھی اللہ کی رحمت ہے۔ اُس کے نصیب اچھے ہوں تو وہ ماں کو بیٹھے بٹھائے ایک مفت کا بیٹا دلا سکتی ہے۔ اور عبداللہ تو پہلے سے ہی اُس کے لئے بیٹے کی طرح تھا۔

لیکن وہ فوراً ہی گھبرا گئی۔ اب یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ اُس نے غزالہ کے نصیب میں کیا لکھا ہے۔ ضروری نہیں کہ ایسا ہو۔ اور ہو بھی تو ابھی تو اس میں کئی سال لگیں گے۔ تو کیا اتنے دن وہ عبداللہ کو ترس جائے گی۔

اُسی وقت غزالہ نے اسے چونکا دیا۔ ''امی ...... اتنے دن ہو گئے۔ عبداللہ بھائی نہیں آئے۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

نجمہ نے چونک کر اُسے گہری نظر سے دیکھا۔ کہیں عبداللہ نے اس کے دل میں بھی تو جگہ نہیں بنالی۔ ''کتنے دن ہو گئے؟'' اُس نے پوچھا۔

''پتا نہیں امی۔ مجھے تو لگتا ہے' بہت دن ہو گئے۔'' غزالہ نے معصومیت سے کہا۔

نجمہ کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ غزالہ نے سادگی میں یہ بات کہی ہے؟



اُس کی کمی محسوس کر رہی ہے۔ ''تم سے کوئی تلخی تو نہیں ہوگئی اُس کی؟'' اُس نے پوچھا۔

''نہیں امی۔ لڑائی تو دور کی بات ہے۔ وہ تو کسی بات کا برا بھی نہیں مانتے۔'' غزالہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

عبداللہ اُس رات بھی نہیں آیا تو حمید صاحب پریشان ہو گئے۔ ''تم جا کر دیکھو تو۔ کہیں طبیعت تو خراب نہیں ہوگئی اس کی۔''

''بہت رات ہوگئی ہے۔ کل پوچھ لوں گی۔''

حمید صاحب کہانی سنانے کے بجائے صحن میں ٹہلتے رہے۔ وہ بہت مضطرب تھے۔ نجمہ سمجھ گئی کہ اُن کا حال بھی اُس جیسا ہی ہے۔ انہیں بھی عبداللہ میں بیٹا نظر آتا تھا۔ اور اسے کھونا انہیں گوارا نہیں تھا۔

اُس رات غزالہ کے سونے کے بعد نجمہ نے حمید صاحب سے بات کی۔ ''دیکھیے...... آپ غزالہ کے سامنے بے تابی ظاہر نہ کریں عبداللہ کے سلسلے میں۔''

''کیوں بھئی۔ مجھے فکر ہے اُس کی۔ وہ روز آتا تھا۔ اب دو دن ہو گئے' نہیں آیا۔ پتا نہیں' کوئی بات ہو۔ پوچھنا تو چاہیئے۔ اور غزالہ سے اس بات کا کیا تعلق؟''

''بات تو کوئی ہوگی۔ وہ دن میں قرآن پڑھنے بھی نہیں آیا۔ اس بات سے کچھ سمجھ سکتے ہیں آپ۔''

حمید صاحب گھبراہٹ میں اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ''تم نے تو مجھے پریشان کر دیا۔ خدانخواستہ طبیعت خراب ہے اُس کی۔''

''پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کو بتاتی ہوں۔ دیکھیں اپنی غزالہ اب تیرہ برس کی ہے۔ اور عبداللہ اس سے دو سال بڑا ہے۔ تو وہ پندرہ کا ہوا نا۔''

''ہاں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''کمال ہے۔ آپ سمجھتے ہی نہیں۔ بھئی بچے جوان ہو رہے ہیں۔ نوشاد بھائی عقل مند آدمی ہیں۔ انہوں نے عبداللہ کو روک دیا ہوگا۔''

"مگر کیوں؟" حمید صاحب اب بھی نہیں سمجھے۔

"جوان لڑکا اس گھر میں آئے گا تو باتیں بنیں گی نا۔"

"اوہ" حمید صاحب نے کہا اور یوں دراز ہو گئے، جیسے کسی غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔ "تو یہ بات ہے۔" انہوں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "بھئی مجھے تو وہ ہمیشہ بیٹے جیسا ہی لگتا تھا۔"

"اللہ اسے بیٹا ہی بنا دے۔ اب آپ سکون سے سو جائیں، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

✻ ........ ✻ ........ ✻

اگلے روز بھی نجمہ نے پہلے تو عبداللہ کا انتظار کیا۔ پھر وہ اُس کے گھر چلی گئی۔ زلیخا کے لئے اُس کی آمد متوقع تھی۔ تاہم اُس نے کہا۔ "آؤ نجمہ۔ اب تو مدت ہو جاتی ہے تمہاری صورت دیکھے۔"

"کیا کروں باجی۔ اب غزالہ کو اکیلے چھوڑ کر زیادہ دیر کے لئے نکل نہیں سکتی۔ اور آپ کے پاس آنے کے بعد جانے کو دل نہیں چاہتا۔"

زلیخا خوش ہو گئی۔ "چھوڑو یہ منہ دیکھے کی باتیں۔"

"نہیں باجی سچ کہہ رہی ہوں۔ آپ کو تو پتا ہے، محلے میں سب سے زیادہ آپ ہی سے دل ملتا ہے۔"

زلیخا مسکرا دی۔ بات سچی تھی۔ اور اس کا اپنا بھی یہی حال تھا۔

نجمہ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر بولی۔ "عبداللہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ خیریت تو ہے، باجی؟"

"ہاں، خیریت ہے۔ بس اب دکان پر جانے لگا ہے۔ اس کے ابا کہتے ہیں، پڑھائی اپنی جگہ۔ مگر اپنے کاروبار کا تو پتا ہونا چاہیئے۔"

"ٹھیک کہتے ہیں۔" نجمہ نے بجھے دل سے کہا۔ "آج چار پانچ دن ہو گئے۔



پڑھنے بھی نہیں آیا عبداللہ، تو مجھے فکر ہوئی۔ سوچا، چل کر پوچھ تو لوں۔"

"اب قرآن تو تم نے ختم کرا ہی دیا ہے۔ اب اُس کا امتحان ہونا ہے۔ اِدھر زیادہ پڑھائی کرنی ہوگی۔ میں نے کہا، قرآن تو اب گھر پر بھی پڑھ سکتا ہے۔ پڑھائی پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔" زلیخا نے اس بار شوہر کا نام لینا مناسب نہ سمجھا۔

لیکن نجمہ بچی نہیں تھی۔ اور پڑھی لکھی بھی تھی۔ سمجھ گئی کہ یہ باجی کی سوچ نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ بات کہنا ضروری نہیں تھا۔ اور اسے خوشی تھی کہ زلیخا نے اصل بات نہیں کہی۔ ایک حجاب تو درمیان رہ گیا۔ "بس باجی، عادت ہو گئی تھی۔" اُس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "اب اُس وقت میں عبداللہ کے بغیر گھر سونا لگتا ہے۔ آپ تو جانتی ہیں، میں کسی سے غرض مطلب نہیں رکھتی۔ مجھے اللہ نے بیٹا نہیں دیا۔ میں عبداللہ کو بیٹے کا درجہ ہی دیتی ہوں۔ آپ تو سمجھ سکتی ہیں۔"

اور زلیخا سمجھ رہی تھی۔ اُس سے زیادہ بیٹے کی محرومی کو کون سمجھ سکتا تھا۔ اُس نے عمر کا ایک حصہ بیٹے سے محروم، بیٹے کی آرزو کرتے گزارا تھا۔ اور پھر نجمہ سے اسے انسیت بھی تھی۔ وہ ضعیف الاعتقاد تھی۔ چیزوں کو، انسانوں کو مبارک اور نا مبارک کے درجوں میں بانٹنے کی قائل۔ اُس کے نزدیک تو نجمہ اُس کے لئے خوش قسمتی کا نشان تھی۔ وہ بیاہ کر پڑوس میں آئی تو اس کے چند دن کے بعد ہی عبداللہ اُس کی کوکھ میں آ گیا۔ وہ بڑی مبارک سہاگن تھی نجمہ کے نزدیک۔ یہ الگ بات کہ خود اس کی کوکھ بھری بھی اور اجڑ بھی گئی۔ اُس وقت بھی زلیخا نے سوچا تھا، کون جانے، نجمہ کی محرومی ہی اُس کی آرزو پوری ہونے کا سبب بنی ہو۔

کچھ بھی ہو، زلیخا نے کبھی کچھ کہا نہیں۔ لیکن دل میں وہ نجمہ کا احسان مانتی تھی۔ اُس کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اکلوتے بیٹے کو بھی بانٹ سکتی تھی، جو کسی اور کے ساتھ اسے بالکل گوارا نہیں تھا۔ محلے کی کوئی اور عورت عبداللہ پر التفات کرتی تو وہ غصے اور حسد سے پھنکنے لگتی۔ بس ایک نجمہ اس سے مستثنیٰ تھی۔

اِس وقت بھی اسے ملال ہو رہا تھا۔ اسے نجمہ پر ہی نہیں' حمید صاحب پر بھی ترس آ رہا تھا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ بیٹے سے محروم ان میاں بیوی کے لئے عبداللہ کی کیا حیثیت ہوگی...... اور اب اُس کی دوری پر وہ کیسا محسوس کر رہے ہوں گے۔

''اب میں کیا کروں۔'' اُس نے بے بسی سے کہا۔ ''لڑکے بڑے ہوتے ہیں تو آہستہ آہستہ ماں باپ کے ہاتھ سے بھی نکل جاتے ہیں۔''

نجمہ کے دل سے ہوک سی اٹھی۔ ''بیٹے ہاتھ سے نکل کر بھی گھر میں ہی رہتے ہیں۔ لیکن بیٹیاں تو گھر ہی چھوڑ جاتی ہیں باجی۔''

بات سچی تھی۔ لیکن زلیخا نے نجمہ کی دل جوئی کی کوشش کی۔ ''بیٹیاں تو پرائی ہو کر بھی ایک بیٹا دلا دیتی ہیں ماں باپ کو۔''

نجمہ خود بھی اس انداز میں سوچتی تھی۔ لیکن یہاں اس کے دل میں چور بھی تھا۔ اس لیے اس نے جلدی سے کہا۔ ''کچھ بھی ہو باجی۔ داماد پھر داماد ہوتا ہے۔''

زلیخا چپ ہوگئی۔ چند لمحے بعد نجمہ نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ''باجی...... عبداللہ کو مجھ سے دور نہ ہونے دیں۔'' اُس نے دانستہ دور نہ کریں' کہنے سے گریز کیا تھا۔ ''مجھے ایک جھلک تو مل جایا کرے اس کی۔ یہ میرا حق ہے۔ میں نے اُسے اللہ کا کلام پڑھایا ہے۔''

اُس کے لہجے میں ایسا درد تھا کہ زلیخا کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ''نجمہ تمہارے گھر میں باہر سے سودا سلف لانے والا تو کوئی ہے نہیں۔ عبداللہ سے کہہ دوں گی' وہ ہر شام کو تم سے پوچھ لیا کرے گا کہ کچھ منگانا تو نہیں ہے۔ اُسے بتا دیا کرنا۔''

نجمہ کھل اٹھی۔ ''باجی ...... آپ سچ مچ بہت اچھی ہیں۔ اللہ ہمیشہ آپ کو خوش رکھے۔''

''اور جمعہ کو عبداللہ کی چھٹی ہوگی۔ اس دن وہ حمید بھائی سے مل لیا کرے گا۔''



نجمہ کی شکر گزاری کی کوئی حد نہیں تھی۔

❁.......❁.......❁

عبداللہ کو دکان جاتے ہوئے تین دن ہو گئے تھے۔ اُس رات وہ دکان بند کر کے گھر کی طرف چلے۔ نوشاد نے عبداللہ کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ وہ دوسری گلی میں مڑنے لگا تو عبداللہ نے کہا۔ ''......ابا......ادھر کہاں جا رہے ہیں؟''

''بیٹا...... میں اپنے اسکول بھی تو جاتا ہوں۔''

عبداللہ حیران ہو گیا۔ ''آپ کا اسکول؟''

''ہاں بیٹے۔ جہاں سے علم حاصل ہو' وہ اسکول ہی ہوتا ہے۔''

عبداللہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔

''مجھے معلوم ہے۔ تم تھک بھی گئے ہو۔ اور تمہیں بھوک بھی لگ رہی ہوگی......''

''ایسی تو کوئی بات نہیں ابا۔'' عبداللہ نے جلدی سے کہا۔ اس کے دل میں تجسس اور اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔ ابا کا اسکول! اگر ابا نے یہ کہا ہوتا کہ ایک دوست کے گھر جا رہے ہیں تو وہ بھوک کی شکایت ضرور کرتا۔

''لیکن بیٹے' میں ہر روز وہاں جاتا ہوں اور جایا کروں گا۔ آج تمہیں بھی ساتھ لے جا رہا ہوں۔ کل سے تمہاری مرضی ہوگی۔ چاہو تو گھر چلے جانا۔ اور اگر اچھا لگے تو روز چلنا۔ میں وہاں ایک گھنٹا بیٹھتا ہوں۔'' نوشاد نے کہا۔

یوں عبداللہ باپ کے ساتھ برہان صاحب کی بیٹھک میں جا پہنچا۔

عبداللہ کو ایسا لگا کہ وہ کسی اور ہی دنیا میں آ گیا ہے۔ وہ خاصا بڑا کمرا تھا۔ لیکن بہت چھوٹا اور تنگ لگ رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں بہت سارے لوگ موجود تھے اور صورتِ حال یہ تھی کہ ایک جاتا تھا تو دو اور افراد آ جاتے تھے اور کمرا پہلے سے زیادہ تنگ ہو جاتا تھا۔

نوشاد نے بلند آواز سے سلام کیا۔ عبداللہ نے بھی سلام کیا۔ بے شمار لوگوں نے

جواب دیا۔ برہان صاحب نے جو کسی سے بات کرنے میں مصروف تھے۔ سر اٹھا کر دیکھا، مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔ ''اوہ ...... نوشاد میاں ہیں۔ اور یہ تمہارے ساتھ کون ہے۔''

''یہ میرا بیٹا ہے حضرت...... عبداللہ۔''

''ماشاءاللہ۔ بڑے روشن چہرے والا بچہ ہے۔ آگے اور زیادہ روشن ہوگا اس کا چہرہ۔ انشاءاللہ۔''

ان کے لہجے میں عجیب سی نرمی اور محبت تھی جو عبداللہ کے دل میں اتر گئی۔ اور وہاں کا ماحول اسے اسکول جیسا ہی لگا۔ برہان صاحب وہاں کے ٹیچر تھے۔

وہ نوشاد کے ساتھ ہی سمٹ کر بیٹھ گیا۔ پھیل کر بیٹھنے کی تو وہاں کسی کے لئے گنجائش نہیں تھی۔

چند لمحے وہ انتظار کرتا رہا کہ اب پڑھائی شروع ہوگی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ اب وہاں ہونے والی گفتگو دھیان سے سننے لگا۔

وہاں بیٹھ کر تھوڑی ہی دیر میں عبداللہ پر پہلی بار منکشف ہوا کہ دنیا میں کتنے مسائل ہیں، لوگ کتنے پریشان ہیں اور ہر شخص کسی نہ کسی اعتبار سے ضرورت مند ہے۔ وہ جسے طالب علموں کا مجمع سمجھ رہا تھا، وہ تو حاجت مندوں کا ہجوم تھا۔ ہر شخص برہان صاحب کے سامنے اپنی کوئی نہ کوئی حاجت بیان کر رہا تھا۔ ہر شخص اُن سے اپنے لئے دعا کرنے کو کہہ رہا تھا۔

ذرا دیر میں عبداللہ کو اندازہ ہوگیا کہ ابا نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ اسکول ہی تھا۔ برہان صاحب باتوں باتوں میں جو کچھ کہتے تھے، چاہے وہ سمجھ میں نہ آئے، لیکن یہ احساس بہرحال ہوتا تھا کہ وہ علم ہے...... اسکول میں پڑھائی جانے والی سائنس، معاشرتی علوم اور ریاضی سے کہیں بڑا علم۔ یہ احساس ہوتے ہی وہ سراپا سماعت بن گیا۔ اس کی تمام حسیات سماعت کے حق میں دست بردار ہوگئیں۔ وہ غور سے سن رہا تھا۔ مگر اسے یہ معلوم



نہیں تھا کہ وہ سب کچھ جذب بھی کر رہا ہے۔ اپنے اندر اتار رہا ہے۔ یہ خوبی اسے اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔

ایک گھنٹا گزر گیا اور پتا بھی نہیں چلا۔ وہ تو اُس وقت چونکا، جب ابا نے کھڑے ہوکر برہان صاحب کو مخاطب کیا۔ ''حضرت...... اب اجازت؟'' ان کا لہجہ مودبانہ تھا۔

''ضرور نوشاد میاں''۔ برہان صاحب نے بڑی محبت سے کہا۔ ''بچے کو اچھا لگے تو کبھی کبھار اسے بھی لے آیا کرو۔ تمہارا بیٹا ہے۔ سیکھنے اور سمجھنے میں تم پر ہی پڑا ہے۔''

''شرمندہ نہ کریں حضرت۔ سیکھنے اور سمجھنے کی تو مجھ میں اہلیت ہی نہیں ہے۔ بس سنتا رہتا ہوں۔ اور انشاءاللہ اب یہ بھی آیا کرے گا۔'' نوشاد نے کہا

وہ سلام کر کے باہر نکل آئے۔ گھر جاتے ہوئے نوشاد نے بیٹے سے پوچھا۔ ''تمہیں وہاں بوریت تو نہیں ہوئی؟''

''نہیں ابا۔ میرا تو اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ آپ اتنی جلدی کیوں اٹھ گئے ابا؟''

''بیٹا...... روز کا ایک گھنٹا ایک بار کے کئی گھنٹوں سے بہتر ہوتا ہے۔ اس طرح اکتانے کی نوبت نہیں آتی۔''

عبداللہ کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔ لیکن وہ اسے یاد ہوگئی۔ وہ خالصتاً نوشاد کا بیٹا تھا۔

✿..........✿..........✿

اب عبداللہ ہوم ورک کرنے کے بعد اضافی پڑھائی بھی کرتا تھا۔ ساڑھے پانچ بجے کے قریب اُس نے کتاب الٹ کر رکھی اور انگڑائی لی۔ وہ تھکن سی محسوس کر رہا تھا۔

اُسی وقت زلیخا نے اسے پکارا۔ ''اب بس کر بیٹے۔ تھک گیا ہوگا۔''

''بس اٹھ رہا ہوں اماں۔ اب دُکان پر بھی جانا ہے۔''

''جانے سے پہلے روز نجمہ سے پوچھ لیا کر کہ باہر سے کچھ منگانا تو نہیں ہے۔''

عبداللہ کو حیرت ہوئی۔ ''کیوں اماں؟''

''بیٹا...... اُن کے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے نا۔ تجھے خیال کرنا چاہیئے۔''

''ٹھیک ہے اماں۔''

''روز خود ہی پوچھ لیا کرنا۔ یاد دلانے کی ضرورت نہ پڑے۔''

''بے فکر رہیئے اماں۔''

اتنے دن ہو گئے تھے اور عبداللہ کو غزالہ کا خیال نہیں آیا تھا۔ جس روز سے اسے بڑے ہونے کا احساس دلایا تھا اور اس نے آئینے میں خود پر تنقیدی نظر ڈالی تھی اس روز اسے غزالہ کو دیکھنے کا اشتیاق ہوا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ بھی بڑی ہونے کے مرحلے میں اس کی طرح بے ڈھنگی ہوئی ہے یا نہیں۔ اُس رات وہ نجمہ خالہ کی کہانی سننے گیا۔ معمول کے مطابق وہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ حمید خالو بیڈ پر دراز تھے اور وہ ان سے چپکی بیٹھی تھی۔ پہلے تو کبھی اسے غزالہ کو دیکھنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ کبھی نظر اس پر ٹھہر گئی تو اسے دیکھ لیا۔ مگر یوں کہ جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ مگر اب وہ اسے نظر بھر کے دیکھنا چاہتا تھا...... بالارادہ۔

بہت دیر وہ سوچتا...... ارادہ کرتا رہا۔ اُس رات اُس کا دھیان کہانی میں بالکل نہیں تھا اور عجیب بات یہ تھی کہ اُس سے نظر اٹھائی نہیں جا رہی تھی۔ اشتیاق اپنی جگہ تھا مگر اندر سے ابھرنے والی تنبیہہ اپنی جگہ۔ اُس کے اندر کوئی طاقت تھی جو اسے منع کر رہی تھی کہ اس طرح دیکھنا بری بات ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اماں نے یہ کہہ کر اسے اپنے ہاں آنے سے نہ روکا ہوتا کہ اب وہ جوان ہو رہا ہے اور غزالہ بھی بڑی ہو رہی ہے۔ کوئی بھید تو ہوگا اس میں' کوئی بری بات یقیناً ہوگی۔

وہ اس بھید کو نہ سمجھ سکا۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ اللہ نے اپنی رحمت سے ان کے اندر ایک محتسب بٹھا رکھا ہے' جو ہر غلط بات پر' برے کام پر اسے ٹوکتا ہے۔ اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ خوش نصیب لوگ اس آواز پر کان دھرتے ہیں تو



وہ توانا' اور طاقت ور ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اُس کی آواز سننے کے عادی بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی رحمت سے استفادہ ہے۔ اس کے برعکس بدنصیب لوگ اپنے نفس کی سنتے ہیں اور ضمیر کی آواز کو نظر انداز کرتے رہتے ہیں' ان کا ضمیر کمزور ہو جاتا ہے۔ اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ نفس کے شور وغل میں اُس کی آواز سنائی ہی نہیں دیتی۔ اُس کی مزاحمت گھٹتے گھٹتے ختم ہو جاتی ہے۔

عبداللہ یہ سب کچھ جانتا نہیں تھا۔ لیکن یہ سمجھتا تھا کہ وہ کوئی بری بات کرنے والا ہو تو اندر سے یہ تنبیہہ ابھرتی ہے۔ جیسے ایک بار باورچی خانے میں مٹھائی دیکھ کر اُس کا دل للچایا تھا اور اُس نے مٹھائی کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ تب اُس کے اندر کسی نے کہا تھا...... بری بات۔ اور اماں ہمیشہ ٹوکتی تھیں۔ ''جو چیز تمہاری نہیں' چاہے وہ گھر میں ہو۔ بغیر پوچھے کبھی نہ لینا بیٹے۔ ورنہ یہ چوری کہلائے گی۔''

مگر تجسس اور اشتیاق اتنا زیادہ تھا کہ وہ تنبیہہ بھی اُسے نہ روک سکی' اُس نے نظر اٹھا کر غزالہ کو دیکھا...... اور دیکھتا رہ گیا' اسے غزالہ کا چہرہ پوری طرح یاد نہیں تھا۔ بس ایک دھندلا سا خاکہ تھا اُس کے پاس۔ اُس کے باوجود وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ غزالہ اب بہت خوب صورت ہو گئی ہے۔ اس کے چہرے پر اس کی طرح بال نہیں اگے تھے۔ اُس کی جلد اور خوب صورت ہو گئی تھی۔ رنگت پر گلابی پن غالب آ رہا تھا۔ آنکھیں شفاف اور بال لمبے ہو گئے تھے۔

اُس کا دل چاہا کہ اسے دیکھے جائے۔ مگر اس بار اندر کی تنبیہہ بہت تند تھی...... اور اشتیاق اس کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ اسے لگا کہ وہ چوری کر رہا ہے۔ اُس نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔

اس کے بعد وہ دو رات اور وہاں گیا۔ اور جتنی دیر وہ وہاں رہا' کہانی سننے کے بجائے غزالہ کو نظر جما کر دیکھنے کے اشتیاق سے لڑتا رہا۔ اور اُس نے نظر نہیں اٹھائی۔ لیکن ایک بار بھی وہ کہانی نہیں سن سکا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ حمید خالو کیا کہہ رہے ہیں۔

وہ تو خود سے مصروفِ جنگ تھا۔ چوری کے احساس نے اُس کے لڑنے کے جذبے کو مہمیز کر دیا تھا۔

پھر ابا نے اسے دکان پر چلنے کی نوید سنائی تو وہ اس خوشی میں کہانی سننے کے شوق کو بھول ہی گیا۔ ایک بار خیال آیا بھی تو اس نے سوچا کہ کہانی اب وہ سنتا ہی کہاں ہے۔ چنانچہ وہ بخوشی اپنی اس خوشی سے دست بردار ہو گیا۔

مگر ایک عجیب بات ہوئی تھی۔ وہ بستر پر سونے کے لئے لیٹتا تو خود بخود غزالہ کا جیتا جاگتا سراپا اس کے تصور کے پردے پر نظر آنے لگتا۔ اُس کا دل چاہتا کہ اسے چھو کر دیکھے۔ پھر اسے خیال آتا کہ اماں نے صرف اس لئے اسے غزالہ کے گھر جانے سے روک دیا تھا کہ وہ جوان ہو رہا ہے اور غزالہ بھی بڑی ہو رہی ہے۔ تو کیا جوان ہونا' بڑا ہونا کوئی برائی کی بات ہے؟ وہ اس پر سوچنے لگتا۔ لیکن اس کا جواب نفی میں تھا۔ بری بات کوئی نہیں تھی۔ اب تک صرف اس بات پر کسی نے نہ اسے برا سمجھا تھا اور نہ اس سے منہ پھیرا تھا کہ وہ جوان ہو رہا ہے۔ اور نہ ہی اس کے چہرے پر نمودار ہونے والی بدصورت تبدیلیاں کسی کو بری لگی تھیں۔ بلکہ اس کے جوان ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے اماں کے لہجے میں فخر تھا۔ بس آئینہ دیکھنے پر اسی کو اپنا آپ برا لگا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس جوانی کی آمد پر اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی تھی۔ کسی سے ملنے سے نہیں روکا گیا تھا...... سوائے غزالہ کے۔ تو اس میں کوئی مصلحت ہی ہوگی۔ وہ غور کرتا رہا۔ اس کے اور غزالہ کے درمیان ایک ہی فرق تھا۔ وہ لڑکی تھی...... اور وہ لڑکا تھا۔ مگر لڑکی تو آپا بھی ہیں۔ اس نے آمنہ کے بارے میں سوچا۔ پھر فوراً ہی خیال آیا کہ وہ تو اس کی بہن ہیں۔ یہ سب سوچتے ہوئے اس کی سمجھ میں رشتے آنے لگے۔ اور وہ یہ سمجھ گیا کہ جوان ہونے پر لڑکا اور لڑکے کو ایک دوسرے سے دور کر دیا جاتا ہے۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ لیکن اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

بہرحال وہ ہر روز دکان پر جانے سے پہلے نجمہ خالہ کے ہاں جا کر پوچھتا کہ انہیں



کچھ منگانا تو نہیں ہے۔ وہ کہتیں تو وہ کچھ لا دیتا۔ کچھ نہ منگانا ہوتا' تو بھی نجمہ خالہ پانچ دس منٹ اسے ضرور روکتیں۔ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتیں۔ پڑھائی کے بارے میں پوچھتیں۔ وہ خود بھی بات لمبی کرتا اور اس دوران نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار اس کی نظر غزالہ کی طرف اٹھتی رہتی۔ لیکن ہر بار اسے دیکھنے کے بعد اسے شرمندگی ہوتی۔ اس کے اندر ملامت ابھرتی جیسے...... اس نے کوئی جرم کیا ہو۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ غزالہ کو دیکھ کر اسے خوشی ہوتی تھی۔ اور وہ عام خوشیوں سے مختلف خوشی تھی۔ اس کے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔

اب اس خوشی میں شرمندگی اور خود ملامتی کیوں تھی' یہ وہ سوچتا تھا' مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

پھر ایک دن برہان صاحب کے ہاں اسے اس کا جواب بھی مل گیا۔

❁ ............ ❁ ............ ❁

برہان صاحب کہتے تھے کہ دین زندگی گزارنے کا ضابطہ ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں' جو دین سے باہر ہو۔ یہ ان کی گفتگو کی مرکزی تھیم تھی۔ بات کہیں سے بھی شروع ہوتی' یہیں پہنچتی۔ زندگی سے نابلد عبداللہ کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ اس کی زندگی میں یہ بیٹھک ہی رخ ہمیشہ کے لئے تبدیل کرنے والا انقلاب لائے گی۔ وہ تو بس اپنے باپ کی طرح خاموش بیٹھا' سب کچھ سنتا اور جذب کرتا رہتا۔

برہان صاحب کے پاس لوگ اپنے مسائل لے کر آتے۔ وہ ان سے باتیں کرتے ہوئے دین کے متعلق بہت کچھ بتاتے۔ عبداللہ کو اندازہ نہیں تھا کہ جو کچھ وہ سن رہا ہے' وہ اس کے اندر صرف جمع نہیں' مرتب بھی ہو رہا ہے۔

برہان صاحب کے لوگوں سے مکالمے کچھ اس طرح ہوتے۔ ''بھئی زندگی گزارنا تو بہت آسان ہے۔ مگر جانوروں کی طرح۔ سو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اللہ نے ہمیں انسان پیدا فرمایا ہے۔ اشرف المخلوقات۔ [illegible]ن زندگی کا ایک ہی مقصد ہے۔ اپنے رب کی

بندگی۔ اور بندگی کا مطلب ہے غیر مشروط اطاعت۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ بندہ اپنے رب کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہے۔ رب کا کائنات میں جو مقام ہے' وہ اپنے دل میں اس کے اس مقام کو قائم کرے۔ اس کے بعد سب آسان ہے۔ لیکن یہ مقام سمجھنا اور دل میں اسے قائم کرنا بہت مشکل ہے۔''

''لیکن اللہ کو کون سمجھ سکتا ہے۔'' محفل میں کوئی کہتا۔

''سچ ہے۔ اللہ کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ وہ پوری کائنات پر حاوی ہے۔ سب کچھ اس نے تخلیق کیا ہے۔ لیکن اللہ نے کسی حد تک ہمیں اپنے بارے میں بتایا ہے۔ اور جتنا بتایا ہے' وہ درحقیقت بہت بہت کم ہے لیکن غور کریں تو ہمارے لئے بہت ہے۔''

''لیکن اسے سمجھنے کی کوشش کیوں کریں' جو سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ بس اسے مان لیں' اتنا کافی نہیں'' کوئی اور کہتا۔

''تو پھر یہ سوچو کہ اللہ نے ہمیں اپنے بارے میں بتایا کیوں۔ اس کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں۔ اس کی ہر بات میں ہزاروں حکمتیں ہوتی ہیں۔ اور اس کا حکم ہے کہ اس کے بارے میں غور کریں۔ اس کے کلام پر غور کریں۔ اور اس کیوں کا جواب یہ ہے کہ جب تک ہم اسے سمجھیں گے نہیں تو بندگی کیسے کریں گے''۔

''بندگی تو ہم یوں بھی کر سکتے ہیں۔ اسے بن دیکھے ایمان لائے ہیں اس پر''۔

''بے شک بن دیکھے ایمان لائے ہیں۔ لیکن یہ ایمان لانا پہلی سیڑھی ہے۔ قرآن پاک میں ہر جگہ ایمان کے ساتھ نیک اعمال کی شرط ہے۔ یہ نہیں کہ ایمان لائے اور بخشش ہوگئی۔ اور نیک اعمال جب نصیب ہوں گے کہ بندگی کرو' اطاعت کرو۔ اس کا ہر حکم مانو۔ جس کام کو کہا' وہ کرو۔ جس کو منع فرمایا' وہ نہ کرو''۔

''اس کے لئے سمجھنے کی ضرورت کہاں ہے''؟

''ضرورت ہے''۔ برہان صاحب بڑے تحمل سے کہتے۔ ''اچھا' اس محفل میں کوئی ایسا ہے' جس نے پوری زندگی والدین کی مکمل اطاعت کی ہو۔ کبھی ان کی نافرمانی نہ کی



ہو۔ ہے کوئی ایسا؟''

اس پر وہاں سناٹا چھا جاتا۔ برہان صاحب چند لمحے انتظار کرتے۔ پھر مسکراتے ہوئے کہتے۔ ''کوئی نہیں ہے! سچ یہ ہے کہ میں بھی نہیں ہوں۔ اب ذرا اس پر غور کرو۔ تمام والدین کسی نہ کسی اصول پر سختی سے کاربند ہوتے ہیں۔ اس کے معاملے میں بچہ نافرمانی کرے تو اُس کے ساتھ سختی کرتے ہیں' مرمت لگاتے ہیں۔ اس کے باوجود بچے نافرمانی کرتے ہیں۔ جبکہ والدین سے ڈرتے بھی ہیں۔ کیوں؟''

''ماں باپ سے چھپ کر نافرمانی کرتے ہیں۔ ان کے غیاب میں' ان کی بے خبری میں کرتے ہیں''۔

''اب ذرا اس پر غور کرو کہ بن دیکھے اللہ پر ایمان لانے والے کس دھڑلے سے اللہ کی نافرمانی' اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ انھیں اس کا خیال نہیں آتا۔ ڈر نہیں لگتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ انھوں نے اس کی صفات کے حوالے سے اس کے مقام کو اپنے دل میں متعین نہیں کیا ہے۔ ذرا سوچو تو۔ وہ حاضر و ناظر ہے۔ ہر جگہ موجود ہے۔ وہ سمیع و بصیر ہے۔ سب کچھ دیکھتا ہے اور سنتا ہے۔ علیم و خبیر ہے۔ اس نے اپنے علم سے پوری کائنات کا احاطہ کر رکھا ہے۔ وہ ہر چیز سے' ہر بات سے باخبر ہے۔ وہ نگاہوں کی چوری جانتا ہے۔ سینوں میں چھپے بھید جانتا ہے۔ اور وہ عزیز ہے۔ زبردست ہے۔ قادر ہے۔ قدرت والا ہے۔ وہ قہار ہے مذلّ ہے۔ چاہے تو تمھیں ذلت دے۔ وہ خافض ہے۔ چاہے تو تمھیں پست کر دے' وہ قوی اور متین ہے۔ بڑی طاقت اور شدید قوت والا ہے۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ تم اس کی ان صفات کے ساتھ اس پر ایمان رکھتے ہو تو اس کے حکم کی خلاف ورزی اس کی نافرمانی کیسے کرتے ہو؟ اور اس پر غضب کہ اس کے بعد ڈرتے بھی نہیں۔ معافی بھی نہیں مانگتے۔ توبہ بھی نہیں کرتے۔ یعنی یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ ودود ہے بہت محبت کرنے والا ہے۔ غفار ہے۔ درگزر اور پردہ پوشی فرماتا ہے' ہر روز تمہارے لاکھوں چھوٹے چھوٹے گناہ تو وہ بغیر توبہ کے بخشش دیتا ہے۔

وہ رحمان ہے' رحیم ہے۔ رؤف ہے۔ بہت شفیق' بہت مہربان' نہایت رحم کرنے والا وہ تو
اب ہے۔ توبہ کو قبول کرنے والا ہے۔ پاک کرنے والا ہے۔ تم یہ سب کچھ جانتے
ہو۔ لیکن اسے اپنے وجود میں' اپنی زندگی میں جاری نہیں کرتے۔ بھئی ماں باپ سے
ڈرتے ہو۔ ان کے حکم کی خلاف ورزی چھپ کر کرتے ہو۔ اس یقین کے ساتھ کہ انہیں
پتا نہیں چلے گا۔ اور پتا چل جائے اور وہ سختی کریں تو معافی مانگتے ہو ان سے۔ آئندہ کے
لئے عہد کرتے ہو کہ ایسا نہیں کرو گے۔ تو بھئی اللہ سے چھپ کر تو تم کچھ کر نہیں سکتے۔ مگر
فطرت سے مجبور ہو۔ گناہ کرتے ہو۔ لیکن ذہن میں رکھو کہ وہ سب دیکھ رہا ہے
۔ تمہارے دل کا حال بھی جانتا ہے۔ تو ڈرو۔ گناہ سے بچنے کی کوشش تو کرو۔ اور پھر بھی
ہو جائے تو توبہ کرو۔ گڑگڑا کر...... روکر...... اس سے ڈرتے ہوئے' لرزتے ہوئے۔
لیکن یہ سب تو اس وقت ہوگا' جب تم اسے سمجھو گے اور اس کے احکام کے ساتھ ایمان
لاؤ گے۔ زبانی ایمان سے تو بات نہیں بنتی۔''

وہ عبداللہ کے لئے ان بے شمار انقلاب آفریں لمحوں میں سے ایک لمحہ تھا' جو اس کی
زندگی میں آئے۔ نگاہوں کی چوری کے حوالے پر وہ گھبرا گیا۔ اسے غزالہ کا خیال آیا۔ وہ
تھرا گیا۔ یہ خیال بے حد ڈراؤنا تھا کہ اس کے غزالہ کو چوری چوری دیکھنے کا کسی
کو پتا نہیں چلا۔ لیکن اللہ جانتا ہے۔ اس نے دل میں توبہ کی۔ آئندہ ایسا نہ کرنے کا عہد
کیا تو خوف کم ہوا۔ خوف کم ہوا تو اسے شرم آئی اور وہ پانی پانی ہو گیا۔

یہ پہلا سبق تھا' جو اس کے ذہن نشین ہوا۔ اس دن کے بعد وہ نجمہ خالہ کے ہاں گیا
تو اس کی نظریں جھکی رہیں۔ اس کا دل غزالہ کو دیکھنے کے لئے تڑپتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ
اس کی یہ خواہش اور شدید ہو گئی تھی۔ نفس...... حکمرانی کا عادی نفس اپنے معزول ہونے
کے خلاف جنگ کر رہا تھا۔ لیکن یہ احساس کہ اللہ دیکھ رہا ہے اور جانتا ہے' عبداللہ پر
طاری تھا۔ نفس ہار گیا۔ اس کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ لیکن اب وہ اچانک اور چپکے سے
وار کرتا تھا۔ وہ نظریں جھکائے نجمہ خالہ سے بات کر رہا ہوتا اور اچانک غزالہ کو دیکھنے کی



خواہش ابھرتی۔ کبھی اس کی نظریں اٹھ بھی جاتیں۔ ایسے میں وہ خود کو باتھ روم میں بند
کر لیتا۔ وہاں وہ روتا' توبہ کرتا۔ یہاں تک کہ اس کے دل سے بوجھ ہٹ جاتا جو کہ توبہ
کی قبولیت کی نشانی ہے۔ پھر یوں ہوا کہ نفس بالکل ہی ہار گیا۔

ایک دن عبداللہ نوشاد کے ساتھ برہان صاحب کی محفل میں بیٹھا تھا کہ ایک بے
حد پریشان حال شخص وہاں آیا۔ برہان صاحب نے بڑی شفقت سے اس سے بات
کی۔ حال پوچھا۔ وہ شخص رونے لگا۔ ''میں برباد ہو رہا ہوں حضرت۔ چھوٹے چھوٹے
بچے ہیں اور میں بے روزگار ہوں۔ تباہی کے دہانے پر کھڑا ہوں۔ آپ میرے لئے
دعا کریں''۔

اس شخص کی حالت ایسی تھی کہ اسے دیکھ کر عبداللہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ برہان
صاحب نے کہا۔ ''ہر مسلمان کو اپنے تمام مسلمان بھائیوں کے لئے دعا کرنی چاہئے۔
میں بھی کرتا ہوں۔ اب آپ کے لئے خاص طور سے کروں گا۔ لیکن سب سے بہتر یہ ہے
کہ آپ خود بھی اپنے لئے دعا کریں۔''

''کرتا ہوں بہت کرتا ہوں تھک گیا دعا کر کے۔ لیکن بات نہیں بنتی۔''

''بری بات۔'' برہان صاحب نے بہت نرم دھیمے لہجے میں اسے ٹوکا ''دعا سے
تھک جانا بندگی کے خلاف ہے اور مایوسی کفر ہے۔ مایوسی کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اپنے
رب کے ہونے پر شک ہے۔ یہ تو تباہی کی بات ہے۔''

''تو وہ میری سنتا کیوں نہیں''۔ پریشان حال شخص کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

''وہ سنتا سب کی ہے۔ آگے اس کی مرضی وہ سب کچھ جانتا ہے۔ اور ہم اپنی
ضرورت سے آگے کچھ بھی نہیں جانتے۔ خیر یہ ایک آیتِ مبارکہ ہے۔ عشاء کے بعد دو
رکعات صلوٰۃ الحاجات پڑھیں۔ پھر اکیس مرتبہ یہ آیتِ مبارکہ پڑھ کر دعا کیجئے۔
انشاءاللہ اللہ کرم فرمائے گا۔''

وہ شخص ہچکچایا۔ چند لمحے گومگو کی کیفیت میں رہا۔ بالآخر بولا تو اس کے لہجے میں

شرمندگی تھی۔ ''بات یہ ہے حضرت کہ میں نماز نہیں پڑھتا۔''

برہان صاحب کا چہرہ تمتما اٹھا۔ ''بہت برا کرتے ہیں آپ''۔ ان کے لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ''اور یہ آپ نے اور برا کیا کہ مجھے اور ان تمام لوگوں کو اپنے خلاف گواہ کر لیا۔ بھئی مجھے بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ جانیں اور آپ کا رب جانے۔ ہم میں سے تو کسی کو نہیں معلوم تھا یہ اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ بھئی بندہ گناہ کرے تو شرمندہ تو ہو۔ معافی تو مانگے الٹا دوسروں کو گواہ کرے یہ تو ڈھٹائی کی' بے شرمی کی بات ہے۔ ایسا نہ کیا کریں خیر آپ نماز نہیں پڑھتے۔ نہ پڑھیں۔ مگر یہ گیارہ دن کا عمل ہے۔ عشاء نہ سہی' نماز حاجات پڑھیں اور دعا مانگیں۔ آپ کی غرض ہے نا۔''

وہ شخص بہت شرمندہ بہت کھسیایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد مہربان صاحب نے اچانک کہا۔ ''استغفراللہ...... استغفراللہ۔ یہ میں نے کیا بکواس کی کہ نمازِ حاجات آپ کی غرض کے لئے ہے۔ لیکن پانچ وقت کی فرض نماز بھی آپ کی غرض کے لئے ہی ہے۔ اللہ کو ضرورت نہیں آپ کے سجدے کی۔ آپ کی نماز کی۔ وہ تو بے نیاز ہے۔ سوائے انسانوں اور جنوں کے ہر مخلوق' کائنات کی ہر چیز اس کی تسبیح اس کی حمد و ثنا کرتی ہے۔ یہ تو اس کی رحمت ہے کہ اس نے ہمیں نماز عطا فرمائی۔ یہ تو اس کے دربار میں اس کے حضور حاضری کا موقع فراہم کرتی ہے جو کہ اعزاز ہے ہمارے لئے۔ اور اس اعزاز سے ہٹ کر وہ ہمیں اس کا اجر بھی عطا فرماتا ہے اور اس دوران اس کی نظر کرم بھی رہتی ہے ہم پر۔ ہم بدنصیب ہیں اگر اس موقعے کو گنواتے رہیں۔'' وہ کہتے کہتے رکے پھر بولے۔ ''اور ابھی ذرا دیر پہلے آپ فرما رہے تھے کہ آپ دعا کر کر کے تھک گئے۔ تو ذرا یہ تو بتایئے کہ دعا کیسے کرتے تھے آپ؟''

''وہ تو ہر جگہ موجود ہے۔ سب کچھ دیکھتا' سب کچھ سنتا ہے۔''



برہان صاحب کا چہرہ تمتما اٹھا۔ یہ ان کی بڑی خوبی تھی کہ وہ غصہ نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ انہیں غصہ آتا ہی نہیں تھا۔ اب ایسی بات پر غصہ تو آئے گا لیکن اللہ نے انہیں ضبط عطا فرمایا تھا۔ ''بے شک''۔ انہوں نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ کا جب جی چاہے جہاں چاہیں موجود ہوتے ہوئے دعا کرنے لگیں۔ یعنی آپ کوئی برا کام کر رہے ہوں کسی غلیظ مقام پر ہوں تو اچانک دعا شروع کر دیں۔ ایسے میں آپ اس سے کرم کی امید رکھ سکتے ہیں؟ دعا کے بھی آداب ہوتے ہیں میرے بھائی۔''

''اللہ نے خود فرمایا ہے حضرت کہ تم زور سے پکارو یا سرگوشی میں' میں سب سنتا ہوں۔ تمہاری شہرگ سے بھی قریب ہوں۔ اور یہ ہمارا ایمان ہے حضرت کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے۔'' حاضرین میں سے کسی نے کہا۔

''میں اس سے انکار کب کر رہا ہوں۔'' برہان صاحب نے جھنجلائے بغیر کہا۔ ''لیکن ہر بات کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا دانائی ہے۔ یہ بات ہمیں گناہ کرتے ہوئے اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے یاد رکھنی چاہئے مگر ہم ایسا نہیں کرتے۔ اور دعا کے باب میں ہم سارے آداب بھول کر اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے میں تو نقصان ہی ہوگا۔''

''دعا سے نقصان بھی ہو سکتا ہے۔'' کسی نے حیرت سے کہا۔

''کیوں نہیں نقصان تو عبادت سے' نماز سے بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ عبادت میں تکبر ہو تو انسان کو وہی نقصان ہوگا جو ابلیس کو ہوا تھا۔ عبادت سے پہلے بندگی ہے میرے بھائی۔''

''عبادت کے آداب کے بارے میں تو سمجھایئے۔'' کسی نے کہا۔

برہان صاحب نے گہری سانس لی۔ پھر بولے۔ ''کسی کے لئے دین کو دنیا سے سمجھنا آسان ہوتا ہے۔ میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔ فرض کریں آپ کو کسی بڑے سرکاری

افسر سے کوئی کام ہے...... جائز کام۔ اور آپ جانتے ہیں کہ وہ سرکاری افسر درحقیقت خادمِ عوام ہے۔ آپ اس سے ملنے کے لئے جاتے ہیں۔ پی اے بتاتا ہے کہ اس وقت صاحب کے پاس کوئی مہمان بیٹھا ہے۔ آپ گھنٹوں اس کا انتظار کرتے ہیں۔ پھر مہمان رخصت ہوتا ہے۔ پی اے اندر جاتا ہے۔ واپس آ کر آپ سے کہتا ہے...... ذرا خیال رکھیے گا۔ صاحب کا موڈ اچھا نہیں۔ آپ اندر جاتے ہیں اور صاحب کی سب سے پہلے مدح سرائی کرتے ہیں۔ تاکہ اس کا موڈ ٹھیک ہو جائے۔ پھر اس سے کام کی بات کرتے ہیں۔ اور صاحب کا موڈ تب بھی خراب ہو تو آپ کا جائز کام بھی رک جاتا ہے۔ یہ دنیا ہے۔ ایسا ہوتا ہے کہ نہیں۔ لیکن آپ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی حاجت بیان کرتے وقت آپ کو صاحب کی توجہ اور خوشنودی حاصل ہو۔ بعض اوقات اس کے باوجود آپ کا کام نہیں ہو پاتا۔ اب آپ فرض کریں کہ آپ کو گورنر صاحب سے کوئی کام آ پڑا ہے۔ گورنر یعنی صوبے کا بادشاہ۔ آپ سوچیں، اس سے ملاقات کا وقت لینا کتنا مشکل ہوگا۔ آپ مہینوں کوشش کریں، تب بھی شاید ہی آپ کو وقت ملے۔ ملک کے بادشاہ کی تو بات ہی اور ہے۔ پرانے زمانے کے بادشاہ پھر بھی بہتر تھے کہ دربار لگاتے تھے۔ آپ پرانے زمانے میں ہوتے تو بادشاہ کے دربار میں جاتے ہوئے نذر گزارنے کو بھی کچھ لے کر جاتے۔ بادشاہ حاجت مند نہیں ہوتا۔ آپ کی وہ نذر بس اس کے لئے ایک طرح کی سپاس گزاری ہوتی۔ پھر آپ بادشاہ کی خدمت میں تعظیم پیش کرتے...... کمر کے بل جھک کر۔ صرف اس لئے کہ آپ کو اس کی توجہ اور نظر کرم حاصل ہو۔ اور ضروری نہیں کہ مسئلہ تب بھی حل ہو۔

''اب آپ سوچیں اللہ کے بارے میں، جو بادشاہوں کا بادشاہ، کائنات کا مالک اور فقیر ہو یا بادشاہ، سب کا حاجت روا ہے۔ اور اس کے قبضۂ اختیار سے باہر کچھ ہے ہی نہیں۔ وہ چاہے تو فقیر کو غنی کر دے۔ چاہے تو شاہ کو گدا کر دے۔ اس کی رحمت دیکھئے۔ اس سے اپائنٹ مینٹ لینے کی ضرورت نہیں۔ اس کا دربار دن رات لگا رہتا ہے۔ اسے



اونگھ بھی نہیں آتی۔ اور آپ پکاریں...... یا اللہ...... تو وہ آپ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اب یہ آپ پر، آپ کی حالت پر آپ کے اہتمام پر اور اس کی رحمت پر منحصر ہے کہ آپ کو اس کی نظر کرم حاصل ہوتی ہے یا نہیں۔ اب یہ کیا کہ لیٹے لیٹے آپ کو اپنی کوئی ضرورت یاد آئی۔ آپ نے جماہی لیتے ہوئے اسے پکارا، پھر جماہی لی اور کہا کہ اے اللہ میرا یہ کام کر دے اور منہ لپیٹ کر سو گئے۔ یہ تو بدتمیزی ہے۔ ایسے تو آپ اپنے گھر میں ماں سے بھی کچھ مانگیں تو شاید ہی ملے۔ کیا اس طرح آپ کو اللہ کی نظر کرم حاصل ہو سکتی ہے۔ نہیں...... اللہ یہ کہ اس کی مرضی ہو۔ تھانے کے ایس ایچ او کے سامنے جاتے ہوئے تو آپ کی ٹانگیں کانپیں۔ اور کائنات کے بادشاہ، قادر مطلق، تقدیروں کا فیصلہ کرنے والے کے حضور یہ انداز۔ کیا یہ ایمان ہے؟ نہیں، آپ نے اس کی طاقت، اس کی صفات کو سمجھا ہی نہیں۔ اور ناسمجھ سے بڑا بے ادب ہوتا ہے۔

''تو بھائی، اس کے دربار میں جانے کے آداب سمجھ لیں۔ یہ اس کی رحمت ہے کہ آپ نے نماز کی نیت کی اور اس کے دربار میں پہنچ گئے۔ وہ آپ کی طرف متوجہ ہو گیا...... نظر کرم کے ساتھ۔ اب آپ اس کے دربار میں ہیں اور اس کی توجہ کا مرکز۔ کوئی خاص حاجت ہو تو کائنات کے، بادشاہوں کے بادشاہ کے حضور نذر گزاریں۔ دنیا کے بادشاہ کو آپ دنیا کی کوئی چیز پیش کرتے ہیں۔ اپنے رب کے لئے دو رکعت نماز حاجات پیش کریں۔ اسے اس کی ضرورت نہیں۔ اس کا فائدہ بھی آپ ہی کے لئے ہے۔ حاجت بھی آپ کی ہے۔ یہ نذر گزرانے کے بعد آپ اس کی حمد اور مناجات کریں...... عاجزی کے ساتھ، کیونکہ آپ اس کی حمد کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ آپ اس کے، اُس کی صفات کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں، جتنا اس نے انسانوں کو بتایا ہے۔ خوب حمد کرنے کے بعد آپ استغفار کریں۔ یاد دلائیں کہ اس نے توبہ کرنے والوں سے مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے۔ پھر اپنے گناہ یاد کر کے بیان کریں...... ندامت اور عاجزی کے ساتھ۔ توبہ کریں۔ توبہ کی قبولیت کی بھیک مانگیں ز۔ توبہ پر قائم رہنے کے لئے استقامت بھی اسی سے

مانگیں۔اس سے التجا کریں کہ وہ آپ کو دھو کر پاک کر دے۔اس کے بعد آپ اُس کی ان نعمتوں کو یاد کریں جو اس نے آپ کو عطا کیں۔ان عنایتوں کو یاد کریں‘ جو آپ پر ہوئیں۔کڑے وقتوں میں جو اس نے آپ کی مدد کی‘ اسے یاد کریں۔سوچیں کہ نجانے کتنی مصیبتوں‘ آفتوں‘ بلاؤں‘ خطرات‘ نقصانات‘ محرومیوں اور بیماریوں کو اس نے آپ تک پہنچنے ہی نہیں دیا۔اس کا تو آپ کو علم ہی نہیں ہے۔اب شکر ادا کریں‘ حیرت‘ بے بسی اور عاجزی کے ساتھ کہ درحقیقت شکر ادا کیا ہی نہیں جا سکتا۔یہ اعتراف کریں کہ یہ توفیق بھی اسی کی دی ہوئی ہے۔اس کے بعد اس کے محبوب پیغمبر کے لئے درود پڑھیں۔جتنا بھی پڑھیں‘ کم ہے۔اب دعا کریں۔یہ ہے دعا۔“

پریشان حال شخص کے چہرے پر اچانک عزم چمکنے لگا۔”ٹھیک ہے حضرت۔میں سمجھ گیا۔آپ اللہ سے میرے لیے دعا فرمائیں۔اب انشاءاللہ میں ایسے ہی دعا کروں گا اور انشاءاللہ نماز بھی قائم کروں گا۔“

برہان صاحب مسکرائے۔”اور یہ یاد رکھیے گا کہ بے نیاز رب کو آپ کی نماز کی ضرورت نہیں۔یہ تو اس کی رحمت ہے کہ اس نے ہمیں نماز کا تحفہ عطا فرمایا۔دیکھیے اس کی ہر عطا میں ان گنت حکمتیں ہوتی ہیں۔نماز کے بے شمار فائدے ہیں۔مگر مجھے ایک بڑا فائدہ یہ لگتا ہے کہ نماز ہمیں بندگی سکھاتی ہے۔ہم اللہ کے سامنے جھکتے ہیں۔گویا ہمیں غیر اللہ کے سامنے اس طرح نہیں جھکنا ہے۔رکوع و سجود صرف اللہ کے لیے ہے۔اور یہ ایمان کا عملی اعلان ہے۔گویا نماز کفر اور شرک کے خلاف ڈھال ہے۔اور اس دوران ہم اللہ کو اس کی صفات کے حوالے سے سمجھیں اور مانیں تو یہ ہمارے لیے طاقت ہے۔ ارے......میں تو رزاق کا بندہ ہوں‘ جو پتھر میں چھپے کیڑے کو بھی وہیں رزق بہم پہنچاتا ہے۔اور میں وہاب کا بندہ ہوں‘ جو بے حساب عطا کرنے والا ہے۔میرا آقا ودود ہے۔ ماں سے 70 گنے سے زیادہ بڑھ کر مجھ سے محبت فرماتا ہے۔میں گناہ کرتا ہوں‘ وہ بخشتا ہے۔اور اس کی پکڑ بہت سخت ہے۔اور اس کے سامنے پیش ہو کر اعمال کی جواب دہی



کرنی ہے۔اب اس سے ڈرو گے تو غیر اللہ کا خوف دل سے جاتا رہے گا۔ہو گئے نا آزاد۔بس پھر رحمت ہی رحمت ہے۔“

وہاں موجود بیشتر لوگوں کی زبان پر بے ساختہ سبحان اللہ کا ورد جاری ہو گیا۔

اس دن عبداللہ نے نماز شروع کر دی۔

برہان صاحب کہتے تھے کہ دو ہی چیزیں ہیں......شکر اور کفر۔دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔کفر کا مطلب ہے انکار......جھٹلانا۔اب ہم ایمان والے ہیں۔ ہم زبان سے......بلکہ دل سے بھی اللہ پر بن دیکھے ایمان لائے۔اس کے پیغمبروں پر‘ اس کی کتابوں پر‘ فرشتوں پر اور روز آخرت پر ایمان لائے۔لیکن دن میں سینکڑوں بار ہم کفر بھی کرتے ہیں اور شرک بھی۔اور ہمیں پتا نہیں چلتا۔دراصل شکر بہت مشکل ہے۔ خود اللہ نے قرآن مین انسان کو جلد باز اور ناشکرا قرار دیا ہے۔اب اس کی مثال دیکھو۔ مجھے کوئی ضرورت آ پڑی۔میں زید کو جانتا ہوں کہ وہ وسائل کے اعتبار سے میری مدد کر سکتا ہے۔مجھے اللہ کا خیال نہیں آیا۔میں زید کی طرف لپکا اور اس سے اپنا مدعا بیان کیا۔اللہ نے زید کے دل میں ڈالی اور اس نے میری ضرورت پوری کر دی۔اب انسان کی جلد بازی رنگ لاتی ہے۔میرا دل زید کے لیے تشکر سے بھر گیا۔میں نے بیوی سے کہا......یہ زید کتنا اچھا انسان ہے۔بلا چون و چرا میری مدد کر دی اس نے۔یہ جلد بازی ہے۔میں نے نہیں سوچا کہ اللہ جسے جس کے لیے چاہے مہربان کر دے اور جس کے لیے چاہے۔سخت کر دے۔یہ سب اس کی طرف سے ہے۔میں نے اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے زید کی تعریف کی۔یہ کفر بھی ہے اور شرک بھی۔اس کی رحمت سے انکار اور اس کے اختیار میں زید کو شریک کرنا۔ارے زید کی کیا طاقت‘ کیا مجال کہ وہ کسی کی ضرورت کو پورا کر لے۔وہ تو خود محتاج ہے ربِ غنی کا۔

”اور دوسری مثال یہ کہ میرا بیٹا گھر سے کسی کام سے نکلا۔دو گھنٹے ہو گئے۔لوٹ کر نہیں آیا۔میں اس کی تلاش میں نکلا۔تیز قدموں سے چل رہا ہوں۔چاروں طرف

کی تلاش میں نظر دوڑا رہا ہوں۔ وہ کہیں نہیں ملتا۔ میں دل میں کڑھ بھی رہا ہوں' ڈر بھی رہا ہوں اور بڑبڑا بھی رہا ہوں۔ میں یہ نہیں سوچتا کہ یہ جو ٹانگیں مجھے آگے لے جا رہی ہیں' اللہ کی عطا ہے۔ یہ بینائی جس سے میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں' رب کی عنایت ہے۔ اور دماغ جو میرے اعضا پر حکمرانی کر رہا ہے' اللہ کی نعمت ہے۔ اور یہ میں جس طاقت اور توانائی کے زور پر مارا مارا پھر رہا ہوں' یہ بھی اللہ کی دی ہوئی ہے۔ کتنے شکر واجب ہوئے مجھ پر۔ مگر مجھے خیال ہی نہیں۔ مجھے احساس ہی نہیں کہ کتنی نعمتیں میرے رب نے عطا کی ہیں مجھے۔ وجہ؟ انسان ایسا کہ جو میسر ہے' اس کی قدر نہیں کرتا۔ اور جو میسر نہیں' اس کے لیے تڑپتا ہے۔ ہاں' ٹانگیں ٹوٹ جائیں تو پتا چلے گا کہ وہ کتنی بڑی نعمت تھیں۔ یعنی نعمت چھنے بغیر اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ وہ نعمت تھی۔

''اب میں گھر آ گیا۔ بیٹا نہیں ملا۔ میں پریشان ہوں۔ جلتے کڑھتے ہوئے کہتا ہوں۔ ''پتا نہیں کیا گناہ کیا تھا میں نے کہ ایسی اولاد ملی۔'' یہ کیا ہے۔ کفر ہے۔ بیٹا اللہ کی نعمت ہے اور میں اسے عذاب کہہ رہا ہوں۔ یہ جلد بازی ہے نا۔ آدمی اپنی تکلیف میں بے تاب ہو جاتا ہے۔ پاگل ہو جاتا ہے۔ سب بھول جاتا ہے...... اللہ کو بھی۔

''اور آدھے گھنٹے کے بعد بیٹا گھر واپس آ گیا۔ میں اسے دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے۔ اس پر برس پڑتا ہوں۔ کہاں تھے تم؟ اسے بے حساب سناتا ہوں۔ وہ بتاتا ہے کہ کسی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ بڑی مشکل سے نکل کر بھاگا ہے۔ یہ سن کر بھی میں اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا کہ اس نے میرے بیٹے کی مشکل آسان کی' جو میری مشکل بھی تھی۔ میں حکومت کو برا بھلا کہتا ہوں۔ بیٹے پر چنگھاڑتا ہوں کہ اس ملک میں اس طرح کھلے پھرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں سب کچھ کرتا ہوں' مگر اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا۔

''اب سوچیے۔ اس معاملے میں ہر قدم پر مقام شکر تھا۔ لیکن میں نے نہ صرف یہ کہ شکر ادا نہیں کیا' بلکہ میں کفر کرتا رہا۔ بھئی شکر ادا نہ کرنا تو ویسے ہی کفر ہے۔ میں تو کھلم



ﻼ انکار کر کے کفر کرتا رہا۔ بے شک انسان بڑے خسارے میں ہے۔ سوائے ان کے ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تقین کرتے رہے۔ اور ہم ہیں کہ زبانی ایمان پر گھمنڈ کرتے ہیں اور بغیر احساس کے کفر یے جاتے ہیں۔''

ایک دن برہان صاحب سے کسی نے پوچھا۔ ''عبادت کیا ہے؟ نماز' روزہ' زکوٰۃ رحج؟''

''یہ سب تو ارکان ہیں۔ عبادت کا جزو ہیں۔ عبادت تو بہت وسیع ہے۔ لیکن بہت رکز اور محدود۔ زندگی...... آپ کی ہر سانس عبادت ہے' اگر آپ اللہ کی بندگی کرتے ں۔ اور بندگی اطاعت ہے۔ جس کام کا اللہ نے حکم دیا' وہ کریں اور جس سے منع فرمایا' نہ کریں۔ ایسا ہو جائے تو آپ کی زندگی ہر لمحہ مسلسل عبادت ہے۔ کتنا آسان کر دیا لہ نے۔ لیکن کتنا مشکل ہے...... صرف نفس کی وجہ سے۔ بس آپ کو ہر کام اللہ کی شنودی کے لیے کرنا ہے۔ پڑوسی سے حسنِ سلوک کیا۔ سب کے حقوق کا خیال رکھا۔ کرا کر ملے۔ راستے سے پتھر اور کانٹے ہٹا دیے۔ کسی بھوکے کو کھانا کھلا دیا۔ اللہ کے یے ہوئے مال میں سے ضرورت مند کی مدد کی۔ کسی قرض میں گرفتار کی گردن ھڑا دی...... صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے۔ دکھاوے کے لیے نہیں۔ اللہ کی خوشنودی ظر رہے تو آپ کا کھانا پینا' پہننا اوڑھنا' سونا جاگنا' چلنا پھرنا' بات کرنا...... سب بادت ہے۔ اور اس کا صلہ جنت ہے۔ وہ جنت' جس کی خوب صورتی' آسائشوں اور متوں کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کتنا آسان' کس قدر مشکل۔ مشکل ہے تو صرف اپنی جہ سے۔

''اور ہاں...... افضل ترین عبادت جہاد ہے۔''

اس پر عبداللہ کے کان کھڑے ہوئے۔ متوجہ تو وہ وہاں ہمہ وقت ہی رہتا تھا۔

''اور جہاد کیا ہے؟'' کسی نے پوچھا۔

اب عبداللہ کا ہر بُنِ مُو سماعت تھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

''اللہ کا راہ میں لڑنا۔ جو جہاد کرتا ہے' وہ اللہ سے اپنی جان کا سودا کرتا ہے۔ اب سوچو' اللہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے والا کوئی ہوسکتا ہے۔ پیغمبروں اور ولیوں کو چھوڑ کر عام انسانوں کے لیے شہادت بلند ترین مرتبہ ہے۔ اسے سمجھ سکے تو ہر مسلمان تڑپتا رہے شہادت کے لیے۔''

''اور جو ناتواں ہو؟''

''جہاد سب کے لیے ہے۔ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے ایسی نعمت سے کسی کو محروم نہیں رکھا۔'' برہان صاحب نے کہا اور گہری سانس لے کر چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر بولے۔ ''مگر اس کے لیے جہاد کو سمجھنا ضروری ہے۔ جہاد کا بھی بہت وسیع مفہوم ہے...... عبادت کی طرح۔ ایک تو جہاد ہے کافروں سے لڑنا۔ مار دینا یا شہادت پالینا۔ لیکن اس کا عام مفہوم ہے اللہ کی نافرمانی سے اور برائی سے دوسروں کو روکنا۔ اسی تعریف کے تحت تو ہم کفار سے جنگ کرتے ہیں۔ لیکن اس کا اطلاق مسلمانوں پر بھی ہوتا ہے۔ جہاد ہی اسلام کی' مسلمانوں کی طاقت ہے۔ مسلمان زبوں حال انہی ادوار میں ہوئے ہیں' جن میں وہ جہاد سے دور ہوگئے۔ یہ بھی ایسا ہی دور ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جذبہ جہاد معاشرے میں پروان چڑھتا ہے۔ مسلمان کے لیے اپنے آپ میں سمٹ جانا' گردو پیش سے لاتعلق ہوجانا قطعاً ناجائز ہے۔ یہ سوچ کہ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ نہ اڑائی جائے' درست ہے۔ لیکن بات اللہ کے حکم سے متصادم ہو تو یہ درست نہیں۔ ایسے میں یہ خودغرضی' اور آگے بڑھ کر بے حسی اور آخری مرحلے میں بے غیرتی کہلائے گی۔ ایک اسلامی ملک' ایک اسلامی معاشرے میں جہاد کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً مسجد سے اذان ہو رہی ہے۔ سینکڑوں لوگ وہاں سے گزر رہے ہیں۔ اور کوئی دکان دار ٹیپ ریکارڈر پر گانے بجا رہا ہے۔ کوئی اسے نہیں ٹوکتا۔ یہ بے غیرتی ہے۔ کوئی اسے روکے تو یہ جہاد ہے۔ کوئی سرِعام کسی لڑکی کو چھیڑتا ہے۔ لوگ نظریں چرا لیتے ہیں۔



یہ بے غیرتی ہے۔ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی ہے۔ برائی کو روکنا مسلمان پر فرض ہے۔''

''لوگ فساد کے ڈر سے بچتے ہیں۔ فساد کو تو اللہ نے منع فرمایا ہے۔'' کوئی بولا۔

برہان صاحب کا چہرہ تمتما اٹھا۔ ''یہ فساد نہیں' فساد کو روکنا ہوگا۔ یہ شر نہیں' رفعِ شر ہوگا۔ تاویل گناہ کی شدت کو بڑھا دیتی ہے۔''

''لیکن کوئی ناتواں ہو تو کیا کرے؟''

''بات کہاں نکل گئی۔ میں کہہ رہا تھا کہ جہاد کی نعمت سے اللہ نے کسی کو محروم نہیں رکھا۔ آدمی خود کو محروم کرلے تو یہ اس کی بدنصیبی ہے۔ جہاد کے بھی درجے ہیں میرے بھائی۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ برائی کو طاقت سے' بہ زور روکو۔ اگر تم میں اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے بہ آوازِ بلند اس کی مذمت کرو۔ یہ دوسرا درجہ ہے۔ اور اگر حالات اتنے خراب ہیں کہ اس میں بھی تمہاری جان کو خطرہ ہے تو دل میں اس کی مذمت کرو۔ یہ جہاد کا سب سے کم تر درجہ ہے۔ اور اگر یہ بھی نہیں کروگے تو قیامت کے دن تم سے اس کی بازپرس ہوگی۔

''اب آدمی خود اپنی طاقت دیکھے اور فیصلہ کرے۔ اور یہ بھی ہے کہ اللہ نے سب انسانوں کو مختلف بنایا ہے۔ سپاہی تلوار سے جہاد کرے گا۔ صاحبِ علم منبر پر بیٹھ کر وعظ سے جہاد کرسکتا ہے۔ اہلِ قلم' قلم سے جہاد کرسکتا ہے۔ عورت اولاد کی پرورش اور اچھی تربیت کے ذریعے جہاد کرسکتی ہے۔ اور ہر انسان کا پہلا جہاد تو اپنے نفس کے خلاف ہے۔ یہ سب ہوگا تو جہاد قومی مزاج کا حصہ بنے گا۔ ایسی ہی قومیں کفر کو للکارا کرتی ہیں۔ اور یاد رکھو' جذبہ جہاد سچا اور شدید ہوگا تو دل میں شوقِ شہادت پیدا ہوگا۔ دل میں جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت ہو تو کمزور آدمی بہت طاقت ور سے نہ صرف لڑ جاتا ہے۔ بلکہ اس پر غالب آجاتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کی تائید اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور سنو' دولت مند اپنی دولت سے جہاد کرسکتا ہے۔ کسی مجاہد کے لیے ایک تازہ دم گھوڑا فراہم کرنا بھی مکمل

جہاد ہے۔

"یاد رکھو، مسلمان موت سے نہیں ڈرتا۔ وہ جانتا ہے کہ موت برحق ہے۔ اس
ایک وقت مقرر ہے۔ نہ کوئی اس میں ایک لمحہ کم کرسکتا ہے اور نہ ایک لمحہ بڑھا سکتا ہے
ہاں، مومن ڈرتا ہے تو ذلت کی موت سے۔ اور شہادت سے بڑھ کر عزت کی کوئی مو
نہیں ہوئی۔ اللہ شہیدوں کے لئے فرماتا ہے کہ انھیں مردہ مت خیال کرو۔ وہ زندہ ہیں
اور اپنے رب کی جناب سے رزق پاتے ہیں۔ تو موت سے جو ڈرے، وہ سمجھ لے کہ ا
کے ایمان میں کمزوری ہے۔"

اس رات عبداللہ نوشاد کے ساتھ گھر آیا تو وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ برہا
صاحب کی ہر بات اس کے حافظے پر نقش ہوگئی تھی۔

❁ ............ ❁ ............ ❁

عبداللہ کی شخصیت میں بہت بڑا انقلاب آیا۔ وہ جہاد کے بارے میں ہر وق
سوچتا۔ اسے یاد آتا کہ مجذوب نے اس کے لیے شہادت کی پیش گوئی کی تھی۔ اسلام کے
عظیم مجاہدوں اور شہدا کے قصے وہ حمید صاحب سے سنتا رہا تھا۔ اب وہ کتابیں پڑھنے
لگا۔ اس کے نتیجے میں اس کے دل میں شوق شہادت پیدا ہونے لگا۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھ
کہ جذبۂ جہاد کے بغیر شوقِ شہادت بے کار ہے۔

موت کا خوف کم از کم سطحی طور پر اور بظاہر دور ہو چکا تھا۔ لیکن وہ لڑنے بھڑ
سے اب بھی ڈرتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ موت سے اب بھی ڈرتا ہے۔ لیکن خو
اس کے بہت اندر، گہرائی میں جا بیٹھا ہے۔ وہ شہادت کی آرزو کرتا تھا۔ مگر جہاد
ڈرتا تھا۔ اسکول میں، اسکول سے باہر وہ برائی دیکھتا، دوسروں کو غلطی پر دیکھتا۔ لیکن لڑا
کے ڈر سے انہیں ٹوکنے کی ہمت نہ کرپاتا۔ ہاں وہ دل میں ان کی مذمت کرتا اور خو
رہتا کہ بہرحال اس نے جہاد کیا ہے۔ کمترین درجے کا سہی، جہاد تو ہے۔

ایک دن اسے برہان صاحب کی بات یاد آئی۔ انہوں نے کہا تھا...... آدمی خود ا



طاقت دیکھے اور فیصلہ کرے۔ اس نے اپنے بارے میں سوچا۔ وہ جوان تھا۔ کسرتی جسم
کا مالک۔ لمبا تڑنگا۔ کیا یہ دل میں مذمت کرنے والا جہاد اس کے شایان شان ہے؟ ہر
گز نہیں۔ پھر بھی اسے ہمت نہیں ہوئی۔

اس نے میٹرک کیا اور کالج میں چلا گیا۔ وہاں یونین ہوتی تھی۔ اسے جہاد کے
دوسرے درجے میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ ایک اسلامی ذہن کی طلبا یونین تھی۔ وہ
اس میں شامل ہوگیا۔ وہیں اس کی سمجھ میں آیا کہ جہاد اجتماعی سطح پر نسبتاً آسان ہے۔
برائی کے خلاف لوگوں کے ساتھ مل کر آواز اٹھائی جاسکتی ہے۔ اور وہ بھی ایسا کرسکتا
ہے۔

لیکن انفرادی سطح پر وہ اب بھی پہلے جیسا تھا۔ کہیں کوئی زیادتی ہوتے دیکھتا تو بیچ
میں پڑنے کی، حق کا ساتھ دینے کی ہمت نہ ہوتی۔ کہیں بہت اندر وہی خوف ابھر آتا۔
چالاک لاشعور نے خوف کی نوعیت بدل دی تھی۔ بہرحال ایسے میں اس کے اندر کشمکش
ضرور ہوتی۔ اس کا ضمیر اسے برا بھلا کہتا، اس سے الجھتا۔ "کمزور کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے
اور تم تماشہ دیکھ رہے ہو؟" ضمیر تلملاتا۔

"میں اکیلا کیا کروں۔ اتنے لوگ تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ کوئی کچھ نہیں بولتا۔"

"اللہ کے سامنے تمہیں اپنا جواب دینا ہوگا۔ ان سب کا نہیں۔ اور کوئی وجہ بھی تو
ہوگی اس بے حسی کی۔"

"میں بولتا تو جھگڑا ہوتا۔"

"وہی موت کا خوف؟" ضمیر حقارت سے کہتا۔

"جی نہیں۔" عبداللہ اکڑ کر سینہ پھلاتے ہوئے کہتا۔ "میں صرف معذوری سے
ڈرتا ہوں۔ موت تو برحق ہے۔"

آئے دن ضمیر سے یہی مکالمے ہوتے تھے۔ اصل میں عبداللہ کو ایک تازیانے کی
ضرورت تھی۔ ایسا تازیانہ بھی اللہ کی رحمت ہوتا ہے۔ جب وہ تازیانہ عبداللہ کے لگا تو

اسے ہوش نہیں رہا۔ وہ ہر نقصان سے بے نیاز ہو گیا۔

اس روز وہ کالج سے گھر آ رہا تھا۔ گھر کی طرف آتے ہوئے اس نے آگے کچھ فاصلے پر ایک برقع پوش لڑکی کو دیکھا۔ چار لڑکے اس کے ساتھ چل رہے تھے۔ وہ اسے چھیڑ رہے تھے۔ جملے چست کر رہے تھے۔ اور ان کی گفتگو فحش تھی۔ لڑکی بے چاری گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ رفتار تیز کرتی تو ان لفنگوں کے قدم بھی تیز ہو جاتے عبداللہ نے یہ منظر دیکھا تو پہلے ایک لمحے کو اس کا خون کھول اٹھا۔ مگر فوراً اس کا خوف ابھر آیا۔ وہ چار لڑکے تھے۔ وہ اکیلا کیا کر سکتا تھا۔ ویسے یہ اس کی یہ دلیلِ محض تھی۔ دل کا بہلاوا تھا۔ وہ ایک لڑکا ہوتا' تب بھی وہ کچھ نہ کر پاتا۔

عبداللہ کو دور سے اس لڑکی کو دیکھ کر اپیا کا خیال آیا۔ لڑکی کا چہرہ تو اسکے سامنے نہیں تھا۔ اور برقعے میں ایک بڑی خوبی ہوتی ہے۔ صالح مرد برقعے میں کسی بھی عورت کو دیکھے' اسے وہ اپنی ماں' بہن یا بیٹی ہی لگتی ہے۔ اپیا کا خیال آنے کے بعد عبداللہ چند لمحوں کے لیے متوحش ہوا۔ مگر پھر اسے یاد آیا کہ اپیا کے باہر نکلنے کا تو سوال ہی نہیں۔ کالج کی چھٹیاں ہیں...... اور اب وہ امتحان دینے والی ہیں۔ وہ مطمئن ہو گیا۔

اس نے قدم ہلکے کر دیے۔ فاصلہ بڑھنے لگا۔ ضمیر کی چبھن سے پیچھا چھڑانے کی یہی ایک صورت تھی۔ اس نے سوچا' فاصلہ بڑھے گا تو اس کے ذمے داری کم ہو جائے گی۔ اور پھر وہ اپنے راستے پر' کسی اور گلی میں مڑ جائیں گے۔ وہ اپنی گلی میں چلا جائے گا۔

لیکن یہ دیکھ کر وہ وحشت زدہ ہو گیا کہ لڑکی اسی گلی میں مڑی تھی' جہاں اس کا گھر تھا۔ اور لڑکے اب بھی اس کے پیچھے تھے۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا اور اس کے قدم تیز ہو گئے۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اب وہ تقریباً بھاگ رہا تھا۔ وہ جلد از جلد گلی میں داخل ہو کر دیکھنا چاہتا تھا۔

وہ گلی میں داخل ہوا تو لڑکی ایک گھر کے دروازے میں گھس رہی تھی۔ او... اس کا



اپنا گھر تھا۔

ایک لمحے کو عبداللہ کو ایسا لگا کہ اس کا پورا جسم سرد ہو گیا ہے اس کے قدم آہستہ ہو گئے۔ اب جیسے وہ گھٹ رہا تھا۔ اسکا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ پورے وجود میں اندھیرا تھا۔ بس ایک خیال ہی گونج رہا تھا۔ تو یہ اپیا تھی!

جیسے تیسے وہ گھر کے دروازے تک پہنچا۔ اس نے چاروں لڑکوں کا جائزہ لیا۔ وہ عمر میں اس سے بڑے اور ہٹے کٹے تھے۔ وہ گھر میں داخل ہو رہا تھا کہ ان کے استہزائیہ قہقہوں نے اس کی سماعت میں زہر انڈیل دیا۔ وہ پوری جان سے کانپنے لگا۔

وہ گھر میں گیا۔ اماں کچن میں تھیں۔ اپیا کمرے میں بیڈ پر اوندھے منہ گری تھی۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔

''اپیا...... اٹھو اور مجھ سے بات کرو۔'' اپنی آواز اسے خود بھی اجنبی لگی۔

اور اپیا یوں اٹھ کر بیٹھ گئی' جیسے اسے کوئی بہت طاقت ور کرنٹ چھو گیا ہو۔ اسے دیکھا تو وہ رونا بھول گئی اور جلدی جلدی آنکھیں پونچھنے لگی۔

''کیا بات ہے اپیا' تم رو رہی ہو؟''

''کچھ نہیں بھائی۔ ایک سہیلی سے لڑائی ہو گئی ہے نا' اس لیے۔'' اپیا نے اٹک اٹک کر کہا۔

''اپیا...... میں اس وقت صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔ ان لڑکوں کو میں دور سے دیکھتا آ رہا تھا۔''

''تو پھر پوچھتے کیوں ہو؟''

''مجھے بتاؤ' یہ کب سے تمہیں تنگ کر رہے ہیں۔''

''چھوڑو نا اس بات کو۔ تمہیں اس سے کیا؟''

''میں تمہارا بھائی ہوں اپیا۔ تم میری ذمے داری ہو۔ اور اس وقت تو تم مجھے بڑا بھائی ہی سمجھو۔''

اُس کے لہجے میں کوئی بات تھی کہ آسرے کو ترسی ہوئی اپیا جیسے چھوٹی بچی بن گئی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہچکیوں کے درمیان اس نے سب کچھ بتا دیا۔ وہ کئی مہینوں سے اس کے پیچھے لگے تھے۔ روز تنگ کرتے تھے اسے۔ اٹھا کر لے جانے کی دھمکیاں دیتے تھے۔ ان کے ڈر سے وہ چھٹیاں بھی کرتی رہی۔ اب بھی کالج میں چھٹیوں کے باوجود کلاسیں ہو رہی تھیں۔ لیکچرار انہیں اہم سوالات نوٹ کراتی تھیں۔ لیکن وہ ڈر کے مارے ایک دن بھی کالج نہیں گئی۔ آج مجبوری تھی۔ ایڈمٹ کارڈ لینے جانا تھا۔

''اپیا...... تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' عبداللہ تڑپ کر بولا۔ اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

''بھیا...... میں نے سوچا یہ آخری سال ہے۔ پھر نجات مل ہی جائے گی۔'' اپیا نے کہا اور پھر بولی۔ ''اور ویسے بھی تم تو ابھی بچے ہو بھیا۔''

''اپیا...... تم نے کب سے مجھے غور سے نہیں دیکھا۔ ورنہ جان لیتیں کہ اب میں بچہ نہیں ہوں۔'' عبداللہ کے لہجے میں سمندر کی سی خاموشی تھی...... ڈرا دینے والی!

''دیکھو بھیا......''

''اپیا...... اب تم یہی بیٹھی رہنا۔ یہاں سے ہلنا مت۔ اور اماں کو کچھ نہ بتانا۔''

اپیا احتجاج کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے تیور دیکھ کر بیٹھی رہ گئی۔ وہ سہم گئی تھی۔

عبداللہ کمرے سے نکلا۔ صحن سے گزرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ ان میں سے ہر لڑکا اس پر بھاری ہے۔ اور پھر وہ چار ہیں۔ وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ مگر پھر پہلی بار وہ ایک مختلف انداز میں سوچنے لگا۔ بھائی تو بہنوں کے محافظ ہوتے ہیں۔ محافظ نہ بن سکیں تو بہنیں سہم جاتی ہیں۔ عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اور بھائی کچھ نہ کریں تو ان کی غیرت بھی مر جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ وہ اسے ماریں گے۔ کوئی بات نہیں۔ اس کی عزتِ نفس تو زندہ رہے گی۔



یہ سوچتے سوچتے وہ دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ اچانک اس کے قدم ٹھٹھک گئے۔ باہر موجود لڑکے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ گفتگو ایسی تھی کہ وہ سنے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ باہر نکلنا بھول گیا اور سننے لگا۔

''بھائی...... اب کیا یہیں بیٹھا رہے گا؟'' ایک آواز ابھری۔

''بستر لگا دیا ہے ترے گھر کے سامنے۔'' دوسری آواز بھونڈے پن سے گنگنائی۔ ''آج تو اٹھا کر لے ہی جاؤں گا سالی کو۔''

عبداللہ یہ سن کر ڈر گیا۔ اس کا دل چاہا کہ دروازہ بند کر لے۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہل سکا۔

''دیکھ بھائی'' پھڈا ہو جائے گا۔'' تیسری آواز نے کہا۔

''پھڈے سے کون ڈرتا ہے بے۔'' دوسری آواز نے کہا۔ پھر اس کے لہجے میں حقارت بھر گئی۔ ''اور یہاں پھڈا کون کرے گا۔ اس کا پوچھنے والا کون ہے۔ باپ دن بھر دکان پر بیٹھا رہتا ہے......''

''ایک بھائی بھی ہے اس کا۔'' یہ چوتھی آواز تھی اور لہجہ استہزائیہ تھا۔

''وہ بھائی ہے۔'' دوسری آواز کا لہجہ اب زہریلا تھا۔ ''ابے وہ تو بہن ہے بہن۔ پدا جیسا ہے۔ اور ڈرپوک ایسا کہ لڑکوں میں کبھی اٹھا بیٹھا بھی نہیں۔ اس کا ڈراوا دیتے ہو مجھے۔ کہو تو اسے بھی اغوا کر لوں۔ مگر وہ تو زنخا ہے سالا......''

وہ اور بھی بکواس کرتا رہا۔ مگر اتنا سن کر ہی عبداللہ کا وولٹیج بڑھ گیا تھا۔ بدن میں بجلیاں سی بھر گئی تھیں۔ اب کے وہ آندھی طوفان کی طرح بڑھا۔ وہ دھڑ سے دروازہ کھول کر نکلا اور سینہ تان کر اس لڑکے کے سامنے کھڑا ہو گیا' جس کی ہرزہ سرائی اسے دیکھ کر بند ہو گئی تھی۔

لڑکے نے خود کو سنبھالتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں عبداللہ سے کہا۔ ''کیا بات ہے پدے؟''

"میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اغوا کرلو۔" عبداللہ کے لہجے میں سکون تھا۔لیکن سینے میں بھپرا ہوا سمندر تھا۔"یا پھر مجھے اچھی طرح جانچ لو کہ مرد ہوں' زنخا نہیں۔"

لڑکے نے اسے بہت غور سے دیکھا۔"کیوں مرنے کو گھر سے نکل آیا ہے پڈے۔جا' ماں کی گود میں جا کر بیٹھ۔"

"مرنے کے لیے بھی انشاء اللہ ایک دن نکلوں گا۔مگر اس وقت مارنے کے لیے نکلا ہوں۔" عبداللہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔"مگر سوچتا ہوں' پہلے سمجھا دوں۔آج کے بعد میرے گھر کے قریب تو کیا' میری بہن کے بھی قریب نظر نہ آنا۔ورنہ میں تمہیں چلنے پھرنے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔"

لڑکے نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔"ڈائیلاگ تو اچھے بول لیتا ہے سالا۔چلو جانچ لیں کہ دم بھی ہے یا نہیں۔" یہ کہہ کر وہ عبداللہ کی طرف متوجہ ہوا۔"میں تیرا ہاتھ پکڑتا ہوں پڈے۔ذرا چھڑا کر تو دکھا۔"

لڑکے نے مضبوطی سے عبداللہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔عبداللہ چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔پھر بالکل اچانک اس نے جھٹکا دیا تو لڑکا اس کی طرف کھنچا چلا آیا۔عبداللہ نے دوسرا جھٹکا دیا۔اس بار ہاتھ چھوٹ گیا۔

لڑکے نے جھنجلا کر عبداللہ کو گھونسہ مارنے کی کوشش کی۔لیکن عبداللہ کو اس ردعمل کی توقع بھی تھی اور وہ اس کے لیے تیار بھی تھا۔اس نے کلائی پر گھونسہ روکا اور سیدھے ہاتھ سے اس کے منہ پر مکا رسید کیا۔

لڑکے کے تینوں ساتھی چند لمحے تو اس گمان میں رہے کہ عبداللہ کے لیے ان کا ساتھی ہی کافی ہے۔لیکن صرف دس سیکنڈ میں ان کا ساتھی لہولہان ہوگیا تو انہیں مداخلت کا خیال آیا۔لیکن عبداللہ ان کے لیے بھی تیار تھا۔اس وقت اس کی جیسے درجنوں آنکھیں تھیں۔ایک کک پیچھے کی طرف' ایک گھونسہ سامنے کی طرف اور فوراً ہی ایک گھونسہ اور ایک لات داہنی سمت سے آنے والے کے حصے میں۔سب لڑکے بوکھلا



گئے۔انہیں مدافعت بھی یاد نہیں رہی۔ذرا ہی دیر میں عبداللہ نے انہیں لٹا دیا۔ان کے چہرے خونا خون ہو رہے تھے۔

عبداللہ ان کے سر پر کھڑا خوں خوار نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔وہ چاروں زمین پر بے بس پڑے تھے۔"اگر تم نے ابھی میری بہن کو بہن کہہ کر نہ پکارا اور اس سے معافی نہیں مانگی تو میں خدا کی قسم تمہیں ختم کردوں گا۔" اس نے سفاک لہجے میں کہا۔پھر ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر دروازے پر جا کر آمنہ کو آواز دی۔"اپیا......اپیا یہاں آؤ۔"

سہمی ہوئی آمنہ دروازے کے قریب ہی کھڑی تھی۔وہ لمحے اس کے لیے بڑی آزمائش بن گئے تھے۔بھائی نے کہا تھا......اپیا......یہیں بیٹھی رہنا۔اور اماں کو کچھ نہ بتانا۔لیکن اکلوتے' منت مرادوں والے بھائی کو خطرہ لاحق تھا۔وہ بیٹھی نہ رہ سکی۔مگر اس نے اماں کو کچھ نہیں بتایا۔اور ان لڑکوں کے خوف سے اس میں یہ ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ دروازے پر جا کر دیکھتی۔اب بھائی نے پکارا تو وہ دروازے پر پہنچی۔"کیا بات ہے بھیا؟" اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر پوچھا۔

"یہاں باہر آؤ ذرا۔"

آمنہ نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔باہر کا منظر دیکھ کر وہ حیران ہوگئی۔چاروں مشٹنڈے زمین پر پڑے تھے۔ان سے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔آمنہ کی حیرت ایسی تھی کہ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔وہ کچھ بول بھی نہیں سکی۔

"ہاں بھئی' بولو اب۔" عبداللہ نے لڑکوں کو للکارا۔

مجرم کے تینوں ساتھی گھگھیا کر آمنہ سے بولے۔"تم ہماری بہن ہو۔ہم شرمندہ ہیں۔ہمیں معاف کردو۔"

لیکن اصل مجرم خاموش تھا۔عبداللہ اس کی طرف بڑھا اور گرج کر بولا۔"تم خاموش کیوں ہو۔بولتے کیوں نہیں۔"

وہ اب بھی خاموش تھا۔ بھپرے ہوئے عبداللہ نے اس کے سر پر ٹھوکر رسید کی۔ ''بولو...... ورنہ زبان گدی سے باہر نکال دوں گا۔''

مجرم چند لمحے تڑپتا رہا۔ مگر دوسری ٹھوکر پڑتے ہی اس کی لڑکھڑائی ہوئی زبان چل پڑی۔ ''مجھے معاف کردو۔ تم میری بہن جیسی ہو۔''

''بس اپیا' اب تم جاؤ۔'' عبداللہ نے بہن سے کہا۔ اس کے جانے کے بعد وہ لفنگوں کی طرف مڑا۔ ''میں نے آئندہ کے لیے جو کہا ہے' اسے یاد رکھنا۔ اور اگر اب بھی کوئی شک ہو تو آئندہ تعداد بڑھا کر آنا۔ سمجھے...... اب دفع ہو جاؤ۔''

وہ چاروں بڑی مشکل سے اٹھے...... اور گرتے پڑتے وہاں سے چلے گئے۔

❁......❁......❁

برہان صاحب کی باتوں نے عبداللہ کے اندر جو انقلاب پیدا کیا تھا' وہ ذہنی اور سطحی تھا۔ عملی مظاہرے کے بغیر اس کی کوئی حقیقی قدر و قیمت نہیں تھی۔ اور یہ واقعہ اللہ کی رحمت تھا۔ اس نے اس کے اندر کے خوف کو عملاً مٹا دیا۔

عبداللہ پر اس واقعے کا اثر کئی دن تک رہا۔ تنہائی میں اس نے وہ سب کچھ یاد کیا تو اس کا پہلا ردعمل حیرت کا تھا۔ چار ایسے لڑکے جو عمر میں بھی اس سے بڑے تھے اور طاقت میں بھی اس سے زیادہ تھا' اس نے کیسے انہیں زمین چٹادی۔ مگر فوراً ہی حیرت کے نیچے سے خوف ابھر آیا۔ وہی خوف جس نے برسوں اسے حق کے لیے آواز اٹھانے سے روکا تھا۔ لڑائی ہوگی۔ پھر دشمنی چلے گی۔ پھر لڑائی ہوتی رہے گی اور کسی دن...... اب بھی اس نے یہی سوچا۔ یہ لڑکے ضرور اسے کہیں گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ اور شاید اس بار وہ ان چاروں کو نہیں مار سکے گا۔

خوف تو تھا۔ مگر پہلے جیسا شدید نہیں تھا۔ ورنہ وہ گھر میں بند ہو کر بیٹھ جاتا۔ ہاں' یہ ضرور تھا کہ راستہ چلتے وقت وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا۔ اسے لگتا کہ کسی گوشے سے وہ چاروں نکل کر آئیں گے اور اسے ماریں گے۔ اور کون جانے' اس بار وہ



مسلح بھی ہوں۔

یہ بھی اللہ کی رحمت ہے۔ وہ حق سے باطل پر ضرب لگاتا ہے۔ حق کو غلبہ عطا فرماتا ہے۔ طاقت اور تعداد کی برتری رکھنے والے باطل کے دل میں حق کی دہشت بٹھا دیتا ہے۔ اس طرح حق کا اعتماد اور اس کی روحانی طاقت بڑھتی ہے۔ ان چاروں لڑکوں نے پہلے تو یہی سوچا کہ وہ اس ذلت کا بدلہ لیں گے۔ مگر انہیں یاد تھا کہ اس اکیلے نے کیسے ان کی مرمت کی تھی۔ اور انہیں یہ بھی یاد تھا کہ اس نے آخر میں ان سے کہا تھا کہ تعداد اور بڑھا کر آئیں۔ گویا وہ ایسا بے جگر تھا کہ آٹھ دس کے مقابلے میں بھی نہ جھجکتا۔

''نا بابا...... وہ تو جن ہے جن' ان میں سے ایک نے کہا۔

پھر انہیں پسپائی کے لیے ایک اور دلیل بھی مل گئی۔ ''اور یہ سوچو کہ ابھی تو بے عزتی نہیں ہوئی ہے۔ ہم پر جو گزری' وہ اس کے اور اس کی بہن کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ پردہ ہی پڑا رہنے دو اس بات پر۔'' دوسرے نے کہا۔

''اس کا کچھ پتا نہیں۔ اگلی بار اس سے بھی برا حشر کرے اور وہ بھی مجمع کے سامنے تو کیا عزت رہ جائے گی ہماری۔'' تیسرے نے کہا۔

اصل مجرم بھی خوف زدہ تھا۔ لیکن ڈھیٹ بھی تھا اور اپنا بھرم رکھنے کا خواہش مند بھی۔ ''اس دن بس ڈھیل چل گئی اس کی۔ مگر تم لوگ تو سچ مچ ڈر گئے ہو۔ چلو خیر...... جانے دو۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ ہمارا کچھ نہیں بگڑا ہے۔''

تین دن کے بعد عبداللہ کا خوف بالکل دور ہو گیا۔ لیکن وہ اب بھی اس لڑائی کے بارے میں سوچتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس نے انہیں کیسے مارا۔ عقلی طور پر تو اس کی کوئی توجیہہ نہیں تھی۔ بات شاید صرف اتنی تھی کہ حق پر ہونے کی وجہ سے اللہ نے اسے طاقت دی تھی اور غلط ہونے کی وجہ سے ان کے دلوں میں کمزوری ڈال دی تھی۔

یہ سمجھنے کے بعد وہ جہاد پر غور کرنے لگا۔ جہاد ہے اللہ کی راہ میں لڑنا۔ ابھی چند روز پہلے جو اس نے لڑائی کی تھی تو وہ اس کی ذاتی جنگ تھی۔ وہ اللہ کی راہ میں' اللہ کے لیے

نہیں، بلکہ اپنی غیرت کے لیے لڑ کا تھا' اپنی غرض سے لڑا تھا۔ اور اللہ نے اُسے ایسی طاقت اور ایسی نصرت عطا فرمائی۔ تو جہاد کرنے والوں' اپنی راہ میں' اپنی خاطر لڑنے والوں کو وہ کیسا نوازتا ہوگا۔ یہ تصور اُس کے لیے بے حد خوش کن تھا۔

کچھ بھی ہو' اس واقعے نے اسے روحانی طور پر بہت طاقت ور بنا دیا۔

کالج کی پڑھائی میں مصروفیات بڑھ گئی تھیں برہان صاحب کے ہاں اس کا جانا بھی کم ہوگیا تھا۔ پھر بھی ہفتے میں ایک بار وہ ضرور ان کے گھر جاتا تھا۔ وہاں اس کے سیکھنے کا عمل ویسے ہی جاری تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کے سامنے ایک روشن اور سیدھا راستہ ہے' جس پر اسے چلتے جانا ہے۔

برہان صاحب کہتے تھے...... دین کی سمجھ دین کی باتیں سننے اور پڑھنے سے آتی ہے۔ اور یہ ہر مسلمان پر فرض ہے۔ قیامت کے دن اللہ سے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ گناہ میں نے لاعلمی میں کیا۔ مجھے اس کا علم ہی نہیں تھا۔ یاد رکھو' ایسے لوگوں کو دُہری سزا ملے گی...... ایک بے خبری کی اور دوسری گناہ کی۔ اسی لیے جہالت کو برا کہا گیا ہے سو بے خبر رہ کر اپنا عذاب دگنا مت کرو۔ اللہ نے قرآن پاک نازل فرمایا...... روشنی کے لیے۔ اس میں تمہیں روشن آیات' واضح احکامات سے نوازا۔ سیدھا راستہ متعین فرما دیا۔ پھر حضورؐ کے ذریعے دین پر عمل کرنا سکھایا۔ آپؐ کی سیرتِ مبارکہ میں ہر عمل واضح ہے۔ اس کے بعد کوئی مسلمان یہ کہے کہ مجھے تو فلاں بات کا علم ہی نہیں تھا۔ تو وہ جان لے کہ اسے اللہ کے حضور اس بے خبری کی جواب دہی کرنی ہے۔ ارے یہی تو وہ علم ہے' جس کے حصول کی تاکید کی گئی ہے کہ اس کے لیے کہیں بھی جانا پڑے تو جاؤ۔

سو عبداللہ دین کی باتیں سنتا بھی تھا اور پڑھتا بھی تھا۔ وہ دین کو پوری طرح سمجھنا چاہتا تھا۔ اور جب بندہ سمجھنے کی کوشش کرے تو اللہ تعالیٰ خوش ہو کر اس کے لیے علم کے راستے اور ہدایت کے دروازے کھول دیتے ہیں۔

آمنہ کا رشتہ آیا اور تین ماہ بعد اس کی شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ بات خوشی کی



تھی۔ سب خوش بھی تھے۔ لیکن وہ خوشی اداسی میں لپٹی ہوئی تھی۔ نوشاد افسردہ تھا۔ اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ بیٹیاں گھر کی رونق ہوتی ہیں۔ اس کی ہر بیٹی وداع ہوتے وقت گھر کا ایک حصہ ویران کر گئی تھی۔ اور اب آمنہ کے بعد تو گھر خالی ہی ہو جاتا۔ عبداللہ کی سوچ بھی یہی تھی۔ اور تو اور آمنہ بھی اداس تھی۔ اِدھر سے اٹھتی' اُدھر بیٹھتی' جیسے کہیں دل ہی نہ لگتا ہو۔

ایک دن زلیخا اس کے پاس جا بیٹھی۔ ''کیا بات ہے؟ تو چپ چپ کیوں رہنے لگی ہے؟''

آمنہ نظریں چراتی رہی۔ زلیخا نے اس کی ٹھوڑی تھام کر چہرہ اوپر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر گھبرا گئی۔ ''کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟''

''اماں...... میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' آمنہ جیسے پھٹ پڑی۔

زلیخا کا دل بیٹھنے لگا۔ ''کیا بک رہی ہے۔ کہیں تُو......؟'' اس نے جملہ مکمل نہیں کیا۔ لیکن اس کے لہجے میں پھنکارتے خدشوں نے آمنہ کو سمجھا دیا کہ وہ کیا سمجھ رہی ہے۔

''نہیں اماں' ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔'' آمنہ نے ماں کا ہاتھ تھامتے ہوئے محبت سے کہا۔ ''تم میری طرح سے سوچ کر دیکھو اماں۔ ابھی سال بھر پہلے تو پڑھائی مکمل ہوئی میری...... اور سب لوگوں کے لیے مجھے وقت ملا۔ ابھی مجھے گھر سنبھالنا ہے۔ تمہارا ہاتھ بٹانا ہے۔ ابا کی خدمت کرنی ہے اور بھیا کا خیال رکھنا ہے۔ کبھی ڈھنگ سے کچھ کھلایا تک نہیں بے چارے کو۔ میرے دل میں بہت ارمان ہیں اماں۔ شادی میں جلدی نہ کرو۔''

''تو تو پگلی ہے۔ لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔'' ماں نے محبت سے ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب تو زندگی ہے اور چلتی رہتی ہے۔''

''پر اماں' میرا دل کٹتا ہے۔ اچھا انصاف سے کہو۔ میرے جانے سے گھر سونا نہیں ہو جائے گا؟''

زلیخا کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ ''ہو جائے گا بچی۔ مگر یہ قدرت کا قانون ہے۔'' اس نے آہ بھر کے کہا۔ ''بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔''

آمنہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ''اچھا...... میری ایک بات مان لو اماں۔ پہلے بھیا کی شادی کر دو۔ پھر بے شک مجھے نکال پھینکنا گھر سے۔''

''عبداللہ کی شادی'' زلیخا نے حیرت سے کہا۔ ''ارے...... اس کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔''

''بی اے میں ہے اماں۔ بیس سال کا ہونے والا ہے۔ اور پھر بات تو ضرورت کی ہے۔ میں چلی جاؤں گی تو بہول جائے گی تمہیں۔ گھر سجا بسا رہے گا۔''

زلیخا کے دل میں خوشیاں ناچ اٹھیں۔ ''تیرے ابا سے بات کرتی ہوں۔ مگر وہ مانیں گے نہیں۔'' اس نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''دیکھ لینا اماں۔ مان جائیں گے۔ وہ بہت عقل مند ہیں۔''

اسی رات زلیخا نے نوشاد سے بات کی۔ بیٹی نے جو باتیں کی تھیں، سب کہہ سنائیں۔

نوشاد کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''یہ بات ٹھیک ہے کہ گھر بالکل سونا ہو جائے گا۔ لیکن اتنی کم عمری میں بیٹے کی شادی ممکن نہیں...... اور میں جانتا ہوں کہ وہ ایم اے ضرور کرنے گا۔ اب میں اس کے ساتھ زبردستی تو نہیں کر سکتا۔''

زلیخا اس کا حل بھی سوچے بیٹھی تھی۔ ''تو ایسا کرو، آمنہ کی شادی سے پہلے منگنی کر دو اُس کی۔ شادی تین سال بعد ہو جائے گی۔ آمنہ بھی خوش ہو جائے گی۔ بہت اداس ہو رہی ہے۔''

نوشاد کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''یہ بہت اچھا آئیڈیا ہے۔''

''تو میں لڑکی دیکھوں اس کے لیے؟''

برہان صاحب سے سیکھی ہوئی دانش نوشاد کے کام آئی۔ ''تم لڑکیاں دیکھنی



ہوگی۔ اور کیا پتا، اسے کوئی پسند ہو۔ یہ سمجھ لو کہ اللہ کے حکم کے مطابق لڑکے اور لڑکی کو پسند کا حق حاصل ہے۔''

''تو پھر؟'' زلیخا کے لہجے میں تشویش تھی۔

''ایک کام کرو۔ اس سے بات میرے سامنے کرنا۔ پھر میں بھانپ لوں گا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔''

''تو کیا اس سے پوچھوں کہ وہ کسی سے محبت کرتا ہے۔'' زلیخا نے برا مانتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں۔ تم اس سے پوچھنا کہ ہم غزالہ سے اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اسے کوئی اعتراض تو نہیں۔''

زلیخا ہکا بکا رہ گئی۔ ''ارے واہ...... میرے ذہن میں بھی غزالہ ہی تھی۔''

نوشاد نے بلاوجہ غزالہ کا نام نہیں لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ عبداللہ غزالہ کو پسند کرتا ہے۔ اور وہ نیک اور صالح لڑکا تھا۔ اس نے کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ منع کیا گیا تو اس نے اس کے گھر جانا چھوڑ دیا۔ دکان کی مصروفیت نے اس کا راستہ بالکل ہی بند کر دیا۔ اور نوشاد جانتا تھا کہ وہ فرماں بردار ایسا ہے کہ کہیں بھی اس کی شادی کر دیں، وہ انکار نہیں کرے گا۔ ایسے میں اس کی خوشی کا خیال رکھنا ان کی ذمے داری تھی۔

''بس تم میرے سامنے اس سے پوچھنا۔''

زلیخا نے یہی کیا۔ نوشاد اس وقت بیٹے کے چہرے کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ ردِعمل کا ایک چھوٹا سا لمحہ تھا...... جگنو جیسا۔ نوشاد اگر چوکنا نہ ہوتا تو اسے کبھی پکڑ نہ پاتا۔ عبداللہ کی آنکھیں ایسے چمکیں، جیسے ان میں چاند اتر آیا ہو۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔ ''اماں، جو آپ کی اور ابا کی مرضی ہو۔'' اس نے بے حد سعادت مندی سے کہا۔ لیکن وہ اپنے لہجے کی خوشی نہیں چھپا سکا تھا۔ ''لیکن اماں، ابھی تو مجھے پڑھنا ہے۔''

"وہ ٹھیک ہے بیٹے۔ لیکن بات ضرورت کی بھی ہے۔ اب آمنہ کے جانے بعد گھر سائیں سائیں کرے گا۔ تم اور یہ تو گھر سے باہر رہو گے......" زلیخا نے نوشا طرف اشارہ کیا۔ "لیکن میں تو پاگل ہو جاؤں گی بیٹے۔"

عبداللہ جیسے کسی سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں خواب اترے ہو تھے۔ چند لمحے وہ یونہی بیٹھا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ "لیکن اماں، پڑھائی ادھوری نہیں چھوڑنا چاہتا۔"

زلیخا کچھ کہنے والی تھی کہ نوشاد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ وہ خوش تھا۔ بیٹے نے اسے نہال کر دیا تھا۔ وہ دانش مند تھا۔ ان چند لمحوں میں اس بہت کچھ دیکھ اور بھانپ لیا تھا۔ عبداللہ غزالہ کو پسند کرتا تھا۔ لیکن اس راستے میں اس اپنا فطری شرمیلا پن نہیں گنوایا تھا۔ اور اس کی فہرستِ ترجیحات حقیقت پسندانہ تھی۔ آ کو اکلوتے بیٹے سے اور کیا چاہیے۔ اس نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا اور عبداللہ مخاطب ہوا۔ "دیکھو بیٹے، میرے پاس اس کا معقول حل موجود ہے۔ ہم اگلے تمہاری منگنی کر دیتے ہیں۔ شادی پڑھائی مکمل ہونے پر۔"

"لیکن......" زلیخا کا دل اب بے ایمان ہو رہا تھا۔

نوشاد نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم اکیلی نہیں رہو گی۔ غزالہ اسی گلی میں ہے۔ تمہارے پاس آتی جاتی رہے گی۔"

"لیکن ابا، ضروری نہیں کہ نجمہ خالہ کی بھی یہی مرضی ہو۔" عبداللہ کے لہجے خوف تھا۔

"وہ تم ہم پر چھوڑ دو۔"

❁ ......... ❁ ......... ❁

نجمہ اور حمید کا تو برسوں سے وہی خواب تھا۔ انہیں تو تعبیر مل گئی۔ اگلے مہینے ع اور غزالہ کی منگنی ہو گئی۔



شاید اس منگنی سے سب سے زیادہ خوش عبداللہ تھا۔ وہ غزالہ کے بارے میں سوچتا وہ زبردستی اس کے تصور میں چلی آتی تھی۔ اور وہ شرم سار، اس سے لڑتا رہتا تھا کہ یہ ات ہے۔ مگر اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ اس کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ تصور ے دیکھ سکتا تھا، اس سے باتیں کر سکتا تھا۔ ایک بری بات اچھی ہو گئی تھی۔ یہ بہت کامیابی تھی۔

مگر آمنہ کی شادی کے چھ ماہ بعد واقعات بہت تیزی سے رونما ہوئے۔ سب سے بالکل اچانک حمید صاحب کا انتقال ہو گیا۔ وہ دفتر میں ہی تھے کہ ان پر دل کا دورہ ر اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی وہ ختم ہو گئے۔

محلے میں کہرام مچ گیا۔ حمید صاحب بے حد شریف، دردمند اور ہر ایک کا خیال والے انسان تھے۔ بہت اچھے پڑوسی تھے۔ اس لیے بہت ہر دل عزیز بھی تھے۔ گہانی موت تو ویسے بھی اجنبی لوگوں تک کو ہلا دیتی ہے۔

نجمہ کا تو یہ حال تھا کہ وہ جیسے پاگل ہو گئی تھی۔ غزالہ کا بھی بہت برا حال تھا۔ لیکن نے حیرت انگیز طور پر خود کو سنبھالا تھا۔

دن گزرتے گئے اور اللہ کی رحمت سے غم ہلکا ہوتا گیا۔ یہ قانونِ قدرت مرنے والوں کے ساتھ کوئی مرتا نہیں۔ بلکہ وہ کتنے ہی عزیز ہوں، وقت گزر جانے ن کی یاد بھی کم سے کم آتی ہے ایسا نہ ہو تو زندگی کا کاروبار رک جائے۔

نجمہ بھی سنبھل گئی۔ اگرچہ محرومی بہت بڑی تھی۔ اور وہ بیٹی کی منگنی کے بارے میں تی تو اللہ کا شکر ادا کرتی۔ اللہ نے غم پڑنے سے پہلے ہی اسے سہارا عطا فرما دیا تھا۔ وہ نی بیٹی کے ساتھ اکیلی نہیں تھی بیٹی کا محافظ بھی موجود تھا اور اسے سہارا دینے والے حمید صاحب کے واجبات کے سلسلے میں عبداللہ نے بہت بھاگ دوڑ کی۔ نجمہ تی کہ اگر یہ سب کچھ اسے کرنا پڑتا تو اس پر کیا گزرتی تو اس پر تھرتھری چڑھ جاتی۔ لیف واجبات ملے اور پنشن جاری ہوئی۔ معاش کے سلسلے میں بے فکری ہو گئی۔

تنہائی بھی ان ماں بیٹی کا صرف رات کا مسئلہ تھا۔ زلیخا بھی اکیلی ہوتی تھی۔ کبھی ان کے گھر آ جاتی اور کبھی انہیں اپنے گھر بلا لیتی۔ البتہ رات کی تنہائی ان کے لیے بہ مہیب تھی۔ وہ خوف زدہ رہتیں اور ایک دوسرے سے لپٹ کر سو جاتیں۔ نوشاد نے بار اصرار کیا کہ اب وہ دونوں اس کے گھر آ جائیں۔ اکیلے گھر میں ان کا رہنا ٹھ نہیں۔ اصولی طور پر یہی اس مسئلے کا حل تھا۔ لیکن معاشرتی نکتہ نگاہ سے یہ بہرحال معیو تھا۔ چنانچہ نجمہ نے اسے قبول نہیں کیا۔

اس عرصۂ بحران میں نجمہ نے عبداللہ کو بہت قریب سے...... بہت غور سے دیکھ محبت تو وہ اس سے اس وقت سے کرتی تھی، جب وہ پیدا ہوا تھا۔ مگر اب تو اسے اس عشق ہو گیا۔ اللہ نے اسے کسی نیکی کے صلے میں ایسا داماد دیا تھا، جو بیٹے سے بڑھ ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اس پر جان چھڑکتی تھی۔ اس کی خاطر وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔

محلہ بہت اچھا تھا۔ انہیں کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ لیکن قدرتی طور پر نجمہ شادی کے لیے اصرار کرنے لگی۔ وہ چاہتی تھی کہ جلد از جلد شادی کر کے بیٹی کو رخص کر دے۔ اس کے بعد اسے اپنی تنہائی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ یہ فیصلہ تو وہ کر چکی تھی ک اپنے ہی گھر میں رہے گی۔

عبداللہ نے بی اے کر لیا تو زلیخا اور نوشاد اس مسئلے پر سر جوڑ کر بیٹھے۔ دونوں ا پر متفق تھے کہ نجمہ کا مطالبہ برحق ہے۔ سامنے اور کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔ اور اب شادی ہو جانی چاہیے۔

ایک رات نوشاد نے اس سلسلے میں عبداللہ سے بات کی۔ ''اب کیا ارادہ بیٹے؟''

''ایم اے کرنا ہے ابا۔''

''یہ کچھ ضروری تو نہیں۔ تمہیں اپنی دکان ہی تو سنبھالنی ہے۔''

''ایک بات کہوں ابا۔ آپ خفا تو نہیں ہوں گے؟''



''بولو بیٹے۔ کھل کر بات کرو۔''

''میں اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے لاء کرنا چاہتا ہوں اس کے بعد میں شریعت رٹ جوائن کر سکتا ہوں اور ابا سچ یہ ہے کہ میں دکان میں نہیں الجھنا چاہتا۔''

''بیٹے، میں نے شروع ہی میں کہا تھا کہ تعلیم صرف ذہن کو روشن کرنے کے لیے ہے۔ باقی اپنا کاروبار موجود ہے۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں بیٹے۔ بہت تھکن ہو جاتی ہے۔ تم ہاتھ نہیں بٹاؤ گے تو کیا ہوگا۔ سچ پوچھو تو اب میں دکان سے نجات چاہتا ہوں۔ تم سنبھالو یہ سب۔ تمہاری ہی ذمے داری ہے۔''

''جی ابا'' سعادت مند عبداللہ نے سر جھکا کر کہا۔

''اور بیٹے...... پھر مسئلہ شادی کا یہ بھی ہے۔''

عبداللہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ مگر فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔ ''وہ تو ایم اے کے بعد ئی ہے ابا۔''

''بیٹا...... کوئی فیصلہ حتمی نہیں ہوتا ہم انسانوں کا۔ بعض اوقات حالات کے تحت مجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔ اب تم غور تو کرو۔ حمید صاحب کے انتقال نے صورت حال تبدیل کر دی ہے۔ ایک تنہا عورت اور ایک جوان لڑکی......'' نوشاد نے کہا۔ وہ اس معاملے کے ہر پہلو پر تفصیل سے بات کر رہا تھا۔

''بات تو ٹھیک ہے ابا۔ لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''آپ مجھے کچھ وقت دیں سوچنے کو۔ مجھے یہ دیکھنا ہے کہ شادی کے باوجود میں یم جاری رکھ سکتا ہوں یا نہیں۔''

''ٹھیک ہے بیٹے۔ سوچ لو۔ لیکن دوسروں کی مجبوریوں کا خیال ضرور رکھنا۔ بعض قات آدمی کو ایثار کرنا پڑتا ہے۔''

اس گفتگو میں نوشاد نے دیکھ لیا کہ فرماں بردار بیٹا خواب دیکھ رہا ہے...... شریعت

کورٹ کا جج بننے کا۔ لیکن اس کے لحاظ میں کھل کر یہ بات نہیں کہہ سکا ہے۔ اس نے خو
چند لمحوں کے لیے تصور کیا تو اس کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ یہ تو بہت بڑا اعزاز ہوگا۔ اس
نے فیصلہ کرلیا کہ دکان کو عبداللہ پر نہیں تھوپے گا۔ اُس کے خواب کی راہ میں رکاوٹ نہیں
بنے گا۔ البتہ فوری طور پر شادی پر اصرار ضرور کرے گا۔

اُدھر عبداللہ بھی اسی انداز میں سوچ رہا تھا۔ اگر ابا دکان پر بیٹھنے کی شرط بنالیں تو
شادی کی جاسکتی ہے اسے خود پر اعتماد تھا کہ شادی کے باوجود وہ اسی لگن سے پڑھے گا اور
تعلیم مکمل کرکے اپنا پسندیدہ کیریئر شروع کرسکے گا۔ شادی کے لئے اُس کے دل میں
رضامندی بہرحال موجود تھی۔

دونوں باپ بیٹے اپنے اپنے طور پر سوچ رہے تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ قدرت
کا فیصلہ کچھ اور ہے!

❁......❁......❁

عبداللہ کسی فیصلے پر پہنچنے ہی والا تھا کہ اُس نے وہ خواب دیکھ لیا۔

وہ جیتا جاگتا خواب تھا' جیسے حقیقت ہو۔ آنکھ کھلنے کے بعد بھی وہ کسی طرح یہ تسلیم
نہیں کرسکا کہ وہ خواب تھا۔ وہ ملاقات' وہ گفتگو' وہ پورا منظر اسے حقیقی لگتا تھا۔ اور اس
جوان آدمی کے چہرے کا ہر نقش' گفتگو کا ہر لفظ اور منظر کی تمام جزئیات اسے مرتے دم
تک یاد رہیں۔ وہ کبھی اُس خواب کا کچھ بھی نہیں بھولا۔ اسی لئے اسے ہمیشہ یہ خیال ہو
تھا کہ وہ خواب نہیں تھا۔ بلکہ کوئی اسے سچ مچ وہاں لے گیا تھا۔

اُس نے خواب میں ایسا خوب صورت باغ دیکھا کہ دنیا میں بالیقین ایسے باغ
وجود نہیں ہوسکتا۔ وہ بہت بڑا باغ تھا۔ اتنا بڑا کہ کئی تو اُس میں پہاڑیاں تھیں اور وہ بھی
نہایت سرسبز۔ ہر پہاڑی سے کئی چشمے جاری تھے۔ نیچے شفاف پانی کی ایک خوب
صورت نہر تھی۔ تمام چشمے اُس میں آکر گرتے تھے۔ ایسا مخملیں سبزہ تھا کہ جیسے دبیز قالین
ہو۔ عبداللہ ننگے پاؤں تھا اس لیے محسوس کرسکتا تھا کہ وہاں چلنے میں کتنی راحت



......اور اس مخملیں گھاس کے لمس میں کتنی راحت ہے۔ اور وہ دنیا کا باغ اس لیے نہیں
تا تھا کہ اس میں ہر طرح کے پھلوں کے درخت تھے' اور سب کے سب پھلوں سے
ے ہوئے تھے۔ ڈالیاں جھکی پڑ رہی تھیں' جیسے دعوت دے رہی ہوں۔ عبداللہ جانتا تھا
کچھ پھل پہاڑی علاقوں کے ہوتے ہیں' جو میدانی علاقوں میں نہیں لگتے۔ اور اسی
رح میدانی علاقوں کے پھل پہاڑی علاقوں میں نہیں لگتے۔ مگر وہاں ہر پھل کے
ت موجود تھے۔ خوبانی' آلو بخارے' انگور' انار' بادام' اخروٹ' نارنگیاں' شہتوت'
' پپیتے اور کیلے۔ وہ سب گنوا ہی نہیں سکتا تھا۔ بس اتنا کہہ سکتا تھا کہ دنیا کا کوئی پھل
ا نہیں ہوسکتا' جو وہاں شاخ پر موجود نہ ہو۔ اور اُس سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ
موسم کا پھل وہاں موجود تھا۔ دنیا میں کچھ پھلوں کا تو میل ہی نہیں ہوتا۔ مگر وہاں موسم
ا اور موسم گرما کے تمام پھل موجود تھے اور یہی حال پھولوں کا بھی تھا۔

اور وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ موسم کون سا ہے۔ وہاں نہ سردی تھی نہ گرمی۔ ہاں......
اں کا وہاں وجود نہیں تھا۔ بہار ہی بہار تھی۔ فضا میں ایسی خوش گوار خنکی تھی کہ اُس کا
د سرشار ہوگیا۔ خوشبو سے بوجھل ٹھنڈی ہوا کے جھونکے دل و دماغ پر سرور طاری
ر رہے تھے' پانی کو چھو کر آنے والی ہوا میں ایسی نمی تھی کہ جسم کو چھوتی تو ننھی منی پھوار
محسوس ہوتی۔ لیکن جسم بھیگتا بھی نہیں تھا۔

عبداللہ وہاں گھنٹوں گھومتا پھرا۔ لیکن اس باغ کا آخری سرا اسے نہیں ملا۔ آخر
ے پیاس لگنے لگی۔ وہ نہر کی طرف بڑھا۔ پانی اتنا شفاف تھا کہ نہر کے نیچے زمین پر
ھے خوب صورت رنگین کنکر صاف نظر آرہے تھے۔

وہ پانی پینے کے لئے جھکا ہی تھا کہ اندر ابھرنے والی ایک سوچ نے اسے ٹھٹکا دیا۔
کے اندر ایک ممانعت ابھری...... بغیر اجازت کے پانی بھی نہ پینا۔ یہ یقیناً کسی
اہ کا باغ ہے۔ کسی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔

مگر میں کس سے اجازت لوں؟ وہ بڑبڑایا۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔

''ڈرو نہیں دوست۔ پانی ہی نہیں، تم یہاں کی ہر چیز اپنے تصرف میں لے ۓ ہو۔ تم یہاں میرے مہمان ہو۔'' ایک دل نشیں مردانہ آواز ابھری۔

اُس نے آواز کی سمت دیکھا...... اور دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ ایک بہت خوب جوان تھا۔ چاند سا دمکتا ہوا چہرہ، شفاف گہری آنکھیں۔ وہ اُس کی طرف بڑھا آ رہا تھ اور اس نے بہت خوب صورت جھلملاتا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ جیسے چاند کی کرنوں ۔ بنایا ہوا کپڑا تھا۔ دیکھنے میں بہت باریک اور نازک لگتا تھا۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں تھ اگر لباس باریک ہوتا تو اس کا جسم نظر آ رہا ہوتا۔

عبداللہ کو بہت حیرت ہوئی۔ مردوں پر ایسے چمکیلے لباس اچھے نہیں لگتے۔ لیکن لباس اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ اسے ایسے لباس کی حسرت ہونے لگی۔

''السلام علیکم۔'' جوان آدمی نے قریب آ کر کہا۔

عبداللہ کو شرمندگی ہوئی کہ وہ سلام کرنا بھی بھول گیا۔ بہرحال اُس نے خفت ۔ سلام کا جواب دیا۔

''آپ پانی پئیں نا۔'' جوان آدمی نے کہا۔

لیکن اب عبداللہ نہر سے پانی پیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ حالانکہ چند لمحے پہلے وہ ا طرح پانی پینا چاہتا۔ اب اسے اس طرح پانی پینا معیوب لگ رہا تھا۔

''اوہ سمجھا۔'' جوان آدمی مسکرایا۔ ''ابھی جام کا بندوبست ہو جائے گا۔ ویسے مج یہاں ہاتھوں میں پانی لے کر پینا بہت اچھا لگتا ہے۔ ہاتھوں کو بھی فرحت ملتی ہے۔ آ ذرا پانی میں ہاتھ ڈال کر تو دیکھیں۔''

عبداللہ نے پانی میں ہاتھ ڈالا۔ واقعی اس پانی کا لمس بھی فرحت بخش تھا۔ وہ ۔ اختیار پانی پینے لگا۔ پہلا گھونٹ لیتے ہی اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ایسا پانی اُس ۔ کبھی نہیں پیا تھا۔ وہ بے حد شیریں پانی تھا۔ اور اسے پیتے ہی جسم میں طاقت اور توانائ کا احساس ہونے لگا۔



اُس نے سر اٹھا کر جوان آدمی کو دیکھا۔ ''یہ کیسا پانی ہے؟ ایسا پانی میں نے کبھی نہیں پیا۔''

''یہ سب میرے رب کی عنایت ہے۔ آیئے...... آپ کو یہاں کی سیر کراؤں۔''

عبداللہ اٹھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ سیر کر چکا ہے۔ کئی گھنٹوں سے وہ یہاں گھوم پھر رہا ہے۔ اسی حساب سے اُس نے سوچا تھا کہ تھکن ہوئی ہوگی۔ لیکن اُس نے غور کیا تو تھکن کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔

عبداللہ نے اُس کے ساتھ باغ کی سیر کی۔ وہ اُس سے بہت مرعوب ہو گیا تھا۔ اُس کے ذہن میں سوال ہی سوال تھے۔ لیکن پوچھنے کی ہمت نہیں تھی۔

کافی دیر ہو گئی۔ جوان آدمی اُس کو وہاں کے بارے میں بتائے جا رہا تھا۔ ذرا موقع ملا تو عبداللہ نے کہا۔ ''آپ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نجانے کیسے بھٹک کر یہاں چلا آیا ہوں۔ بلا اجازت!'' اُس کے لہجے میں معذرت تھی۔

''جی نہیں۔ یہاں بھٹک کر کوئی نہیں آتا۔'' جوان آدمی نے کہا۔ ''یہاں آدمی اللہ کے حکم سے، اللہ کی مرضی سے آتا ہے۔ ارے سنیں، اب آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی۔''

''جی نہیں۔'' عبداللہ نے کہا۔ مگر اسی لمحے اسے بھوک کا...... شدید بھوک کا احساس ہوا۔ وہ قسم کھا سکتا تھا کہ اس لمحے سے پہلے اسے بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ ''جی...... جی ہاں۔ بھوک لگ تو رہی ہے۔'' اُس نے خجالت سے کہا۔

''تو چلئے۔ بارہ دری میں چلتے ہیں۔''

عبداللہ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے ہی بارہ دری تھی۔ اور وہاں چہل پہل تھی۔ قریب پہنچے تو پتا چلا کہ دسترخوان بچھایا جا رہا ہے۔ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو دور تک آ رہی تھی۔ عبداللہ کی بھوک اور چمک اٹھی۔ قدم تیز ہو گئے۔ وہاں سب کام نہایت حسین اور کم عمر لڑکیاں کر رہی تھیں۔

دسترخوان دیکھ کر وہ حیران ہو گیا۔ وہاں اتنی نعمتیں تھیں کہ شمار ممکن نہ تھا۔ پرندوں

کا بھنا ہوا گوشت' کباب اور ہر طرح کے پھل۔ اور ذائقہ ایسا کہ جس کا بیان ممکن نہیں۔ اُس نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ اسے اُس پر بھی حیرانی تھی کہ اُس نے اتنا زیادہ کیسے کھا لیا۔

''اب پھل بھی تو لیجئے۔'' جوان آدمی نے کہا۔

''اب تو بالکل گنجائش نہیں۔'' عبداللہ نے سچائی سے کہا

''یہ تو کفرانِ نعمت ہوگا۔''

اچانک عبداللہ کو احساس ہوا کہ تھوڑی سی گنجائش ہے۔ اس تھوڑی سی گنجائش پر بھی اُس نے خوب ڈٹ کر پھل کھائے۔ آم تو اسے ویسے ہی بہت مرغوب تھے۔ لیکن آموں کے ایسے ذائقے کا اُس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

لڑکیاں آئیں اور انہوں نے دستر خوان سمیٹ لیا۔ جوان آدمی عبداللہ کو ایک بہت گھنے درخت کے نیچے بچھے ایک وسیع و عریض تخت پر لے گیا۔

''اب یہاں کچھ دیر پاؤں پھیلا لیں۔'' اُس نے کہا۔

تخت پر بچھا گدا اور چادر بے حد نرم و ملائم تھے۔ گاؤ تکیے ایسے حسین کپڑے کے بنے تھے کہ آدمی دیکھتا رہ جائے۔ عبداللہ اب تک پوری طرح مرعوب ہو چکا تھا۔ اُس نے کہا۔ ''میں یونہی ٹھیک ہوں جناب۔''

''تکلف نہ کیجئے۔ اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ بہت کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ بلا جھجک پوچھ لیجئے۔''

نجانے کیسے عبداللہ کی جھجک دور ہو گئی۔ اُس نے پوچھا۔ ''آپ یقیناً کوئی بادشاہ ہیں۔''

''یہ اندازہ کیسے لگایا آپ نے؟''

''یہ وسیع و عریض باغ' یہ کنیزیں' یہ شاہانہ کرّ و فر۔ کھلی ہوئی بات ہے۔''

جوان آدمی یکلخت سنجیدہ ہو گیا۔ ''جی نہیں۔ یہ سب میرے رب کا فضل ہے۔ اُس کی عطا ہے۔ میں اس کا عام سا بندہ ہوں' جسے اُس نے عزت عطا فرمائی اور اپنے فضل



سے نوازا ہے۔ اور بادشاہ کوئی نہیں ہوتا۔ یہ سب تو دنیا کے جھوٹ ہیں۔ جسے اقتدار مل جائے' دولت مل جائے' وہ اپنے تئیں خود کو بادشاہ سمجھ بیٹھتا ہے۔ اور دولت اور اقتدار کی عزت کرنے والے اسے بادشاہ سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن بادشاہ تو میرے دوست ایک ہی ہے...... سب کا بادشاہ۔ ہم سب کا اللہ۔ یہ سب جھوٹی شان اور عزت بس اس دنیا میں ہی چلتی ہے۔''

''تو یہ دنیا نہیں ہے...... دنیا میں نہیں ہے؟'' عبداللہ نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں' یہ تمہاری دنیا نہیں ہے۔ وہ دنیا نہیں ہے' جس میں کبھی میں رہتا تھا۔''

عبداللہ کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ ''تو...... تو کیا آپ زندہ نہیں ہیں؟'' اُس نے گھبرا کر پوچھا۔ ''آپ مر چکے ہیں؟''

''نہیں۔ میں مرا نہیں' زندہ ہوں۔ البتہ دنیا کے لئے' اپنے لوگوں کے لئے میں مر چکا ہوں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''اپنے رب کی راہ میں لڑتے ہوئے میں شہید ہوا تھا۔ سو یہاں اپنے رب کی رحمت کے سائے میں ہوں اور اُس سے رزق پاتا ہوں۔ اُس کا وعدہ سچا ہے۔''

عبداللہ کے دل سے خوف مٹ گیا اور اُس کی جگہ اشتیاق نے لے لی۔ تو وہ شہید تھا اور یہ جگہ...... ''تو کیا یہ جنت ہے؟'' اس نے پوچھا

''نہیں میرے دوست۔ جنت کی خوب صورتی کا تو تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

عبداللہ کو ایک اور بات یاد آئی۔ ''یہاں ہر موسم کے پھل موجود ہیں۔ آم اور انگور' خوبانی اور آلوچے ایک ہی وقت میں۔ ایسا تو جنت میں ہی ہوتا ہے۔''

''یہ جگہ جنت نہیں۔ اور یہ تمہاری دنیا بھی نہیں۔ اس لئے یہاں دنیا کے قانون نہیں چلتے۔ یہاں ہر چیز ملتی ہے۔'' جوان آدمی نے کہا۔

''یہ جنت نہیں' تو جنت کیسی ہوگی؟'' عبداللہ کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

''مجھے بھی یہ اشتیاق ہے۔ اور میں اُس دن کا انتظار کرتا ہوں۔ خوب صورتی اور حسن جس کی ہم دنیا میں بات کرتے ہیں' اُس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ وہ تو بس حسنِ ازل کا استعارہ ہے اور وہ بھی فانی۔ حسن صرف اور صرف اللہ کا ہے' اللہ سے ہے' اللہ کے لئے ہے اور اللہ تک ہے۔ اور اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ یومِ حساب اپنے نیک بندوں کو اپنا جلوہ دکھائیں گے۔ بس میں اسی کا منتظر ہوں' اللہ کی اسی رحمت کا امیدوار ہوں۔ اس کے دیدار کا تمنائی ہوں۔ بہت پہلے سے تھا۔''

عبداللہ کا برسوں پرانا' بہت نیچے دبا خوف ابھر آیا۔ ''شہید ہوتے وقت تمہیں بہت زخم لگے ہوں گے۔ بہت تکلیف ہوئی ہوگی؟'' اُس نے پوچھا۔

''پہلے میں بھی یہی سوچتا تھا۔ ڈرتا بھی تھا۔ مگر بس اللہ نے اپنے دیدار کی آرزو دل میں ڈال دی تھی۔ اور میں سوچتا کہ اعمال میرے بہت خراب ہیں گناہ گار بھی ہوں۔ مجھے اللہ کا دیدار کیسے نصیب ہوگا۔ میرے اعمال تو مجھے ان بندوں میں شامل کرا دیں گے' جنہیں دیکھ کر اللہ منہ پھیر لیں گے۔ ایسا کیا کروں۔ پھر مجھے پتا چلا کہ شہادت ایسا شارٹ کٹ ہے' جس میں سب کچھ دُھل جاتا ہے۔ بندہ پاک ہو جاتا ہے۔ بس پھر میرے دل میں شوقِ شہادت پیدا ہوگیا۔ سارا ڈر نکل گیا۔ اور دوست' جب میں شہید ہوا تو مجھ پر یہ راز کھلا کہ جو جہاد کے لئے نکلا' اُس نے اللہ سے اپنی جان کا سودا کر لیا' اور اُس سے بہتر قیمت کون دے سکتا ہے' جو کائنات کے تمام خزانوں کا مالک ہے۔ تو ارادۂ جہاد کرتے ہی میری جان' میرا وجود اللہ کا ہوگیا۔ بس اب ایک ہی شرط ہے۔ پیٹھ نہیں دکھانی' اپنی جان کو اپنا نہیں سمجھنا۔ سو جب مجھے پہلا زخم لگا تو یقین جانو' مجھے سوئی چبھنے' چیونٹی کے کاٹے جتنی تکلیف بھی نہیں ہوئی۔ پھر تو میں شیر ہوگیا۔ میں اور جی جان سے لڑا۔ زخم پر زخم لگتے رہے۔ تکلیف نہیں ہوئی۔ اللہ کی ملکیت تھے نا جسم و جان۔ ایسا کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ کہتے ہیں' پیغمبروں اور ولیوں کے بعد عام انسانوں میں صرف شہدا ہی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی روح بہت آسانی اور شفقت بھری نرمی سے



ے علیحدہ کی جاتی ہے۔''

''اور یہ سب...... یہ باغ' یہ کنیزیں' یہ سب کچھ......؟''

''یہی نہیں۔ آگے میرا ایک محل بھی ہے۔ یہ سب صلہ ہے اللہ کی طرف سے۔ یہ نہ ہے میرا جو قیامت تک جاری رہے گا۔''

''یہ سب کچھ ہر شہید کو ملتا ہے؟'' عبداللہ کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

''جی ہاں۔ کسی کو اس سے بھی بڑھ کر ملتا ہے۔''

عبداللہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اب میں چلوں گا۔'' پھر اسے کچھ خیال آیا۔ ''آپ نے بی اتنی شان دار مہمان نوازی کی۔ اللہ آپ کو اس کا صلہ دے۔ میں تو نہیں دے ا۔''

جوان آدمی مسکرایا۔ ''کیوں نہیں۔ کون جانے' آپ کو بھی مرتبۂ شہادت ملے اللہ اس سے بہتر صلہ آپ کو عطا فرمائیں۔ پھر آپ میری دعوت کیجئے گا۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' عبداللہ نے اداسی سے کہا۔ ''میں موت سے ڈرتا ہوں۔ یری ماں بھی میرے مرنے سے ڈرتی ہے۔''

''مجھے معاف کرنا دوست۔ یہ تو جہالت ہے۔'' جوان آدمی نے حلیمی سے کہا۔ بت تو ایک دن آنی ہے۔ کسی طرح بھی آئے۔ اپنے رب کے مقرر کردہ وقت پر ئے گی۔ موت سے وہ لوگ ڈرتے ہیں' جو جانتے ہیں کہ رب سے ملاقات برحق ہے۔ ا کے باوجود وہ ایمان نہیں لاتے۔ نیک عمل نہیں کرتے۔ وہ اُس کے حضور پیشی سے تے ہیں۔ اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ یہ یہودی' نصرانی اور مشرک' ان میں سے الم چاہتا ہے کہ اسے ہزار برس کی عمر ملے۔ حالانکہ اتنی عمر بھی انہیں نہیں بچا سکتی۔ تو ا ہم مسلمانوں کو تو ہر وقت اس ملاقات کو اور موت کو یاد رکھنا چاہیئے۔ رسماً نہیں' فی نیت۔ اور دوست' جو اللہ سے ڈرتے ہیں' اس پر بن دیکھے ایمان لاتے ہیں' نماز قائم تے ہیں' زکوٰۃ ادا کرتے ہیں' اللہ کے پیغمبروں' اُس کے فرشتوں' اُس کی [illegible] پر

ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں' وہ تو اس دنیا سے' اس زندگی سے محبت نہیں کرتے کہ یہ تو ان کے اور ان کے رب کے درمیان رکاوٹ ہے۔ موت اس لئے اچھی لگتی ہے انہیں کہ اس رکاوٹ کو دور کرتی ہے وہ اللہ کی رضا کے لئے جیتے اور اسی کے لئے مرتے ہیں۔ وہ خوش نصیب ہیں۔ اور موت سے تو کوئی نہیں بچتا۔ اللہ ہر مسلمان کو ذلت کی موت سے بچائے اور عزت کی موت عطا فرمائے۔''

''آمین۔ میرے لئے دعا کرنا دوست۔'' عبداللہ نے بڑے خلوص سے کہا۔

''ضرور کروں گا۔ اب تم جاؤ۔ نماز کا وقت ہو رہا ہے۔''

عبداللہ اسے سلام کر کے چلا ہی تھا کہ اُس کے کانوں میں اذان کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ اپنے بستر پر تھا اور فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ تو یہ خواب تھا۔ اُس نے سوچا' لیکن نہیں۔ ان تمام نعمتوں کا ذائقہ اب بھی اُس کی زبان پر تھا۔ اس پانی کی فرحت اسے اب بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس کا پیٹ بھرا ہوا تھا۔ ورنہ فجر کے لئے اٹھتے وقت ہمیشہ اسے بھوک کا احساس ہوتا تھا۔

فجر کے لئے تیاری کرتے ہوئے وہ اس خواب کو یاد کرتا' دہراتا رہا۔ اسے سب کچھ یاد تھا۔ اس خواب کا ایک لمحہ بھی اس کے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔ خواب ایسے تو نہیں ہوتے۔ اس نے وضو کیا اور مسجد چلا گیا۔

فجر کی نماز کے بعد بغیر کسی ارادے کے' خود کار انداز میں اس نے صرف ایک دعا مانگی۔ اس کے لہجے میں رقت' آنکھوں میں آنسو اور دل میں اصرار تھا۔

''اے اللہ' مجھے جذبۂ جہاد عطا فرمائیے۔ مجھے شوقِ شہادت نصیب فرمائیے۔ میرے لئے یہ سعادت لکھ دیجئے میرے رب۔''

انقلاب مکمل ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی بدل گئی تھی!

عبداللہ کو پہلی بار پتا چلا کہ اللہ کے راستے پر آدمی کتنا بے تاب' کتنا سرشار ہوتا ہے۔ دنیا' دنیا کی ہر چیز بری لگتی ہے۔ بھوک پیاس اڑ جاتی ہے۔ ہر چیز کشش کھو بیٹھتی ہے...... جہاد کے سوا' شہادت کی آرزو کے سوا۔ اس کے تمام حواس اسی ایک نکتے پر مرکوز ہو گئے تھے۔

اس روز کالج میں خالی پیریڈ کے دوران اس نے اپنے دوست معاذ سے بات کی۔ معاذ کا تعلق بھی طلباء کی اس تنظیم سے تھا۔ دینی رجحان رکھنے والی وہ تنظیم ان معاملات میں بے حد فعال تھی۔ معاذ اس تنظیم کا سرگرم کارکن تھا۔ جبکہ عبداللہ محض حامیوں میں سے تھا۔ اپنے خوف کی وجہ سے۔

''بھائی معاذ' ایک بات بتاؤ۔'' عبداللہ نے کالج کے لان میں پاؤں پھیلا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی جہاد کرنا چاہے تو کیا کرے؟''

''بھئی جہاد کرے' اور کیا کرے گا۔'' معاذ نے یونہی کہا۔ ''مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''میں...... میں جہاد کرنا چاہتا ہوں۔''

''جہالت کے خلاف' ظلم کے خلاف' بدعنوانیوں کے خلاف' غیر اسلامی ثقافت کے خلاف۔'' معاذ نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ ''دل میں کرو گے یا زبان سے؟''

عبداللہ شرمندہ ہو گیا۔ اپنے عمل کے اعتبار سے وہ اسی جواب کا مستحق تھا۔ ''نہیں بھائی...... میں عملاً جہاد کرنا چاہتا ہوں...... اسلام کے دشمنوں کے خلاف۔''

معاذ نے اسے یوں دیکھا' جیسے اس کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔ ''بھائی' تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس کے لہجے میں اب بھی تمسخر تھا۔

اب کے عبداللہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''معاذ...... میں سنجیدہ ہوں۔''

اُس کے آنسو دیکھ کر معاذ کو بھی احساس ہو گیا۔ اُس نے کہا۔ ''سوری بھائی۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ میں تنظیم جہاد کے دفتر تمہیں لے چلوں گا۔ وہاں تمہیں فارم بھرنا ہوگا

تمہارا رجسٹریشن ہو جائے گا۔''

''پھر میں جہاد پر جا سکوں گا؟''

''نہیں بھائی۔ یہ تلوار کا دور تو ہے نہیں۔ آتشیں اسلحے کا دور ہے۔ ایسے کیسے جہاد پر جاؤ گے۔ پہلے تربیتی کیمپ میں جا کر تربیت لینی ہوگی۔ اس کے بعد کہیں تم جہاد کے قابل ہو گے۔''

''اچھا...... اتنا لمبا عرصہ......؟''

''یونہی محاذ پر بھیجنا تو قتل کہلائے گا...... اور یونہی جانا خودکشی۔'' معاذ نے کہا۔

''میں کسی دن تمہیں لے چلوں گا۔''

''آج کیوں نہیں؟''

''تم تو بے تاب ہو رہے ہو...... کسی کھلونے کے لئے تڑپتے بچوں کی طرح۔ چلو آج ہی سہی۔'' معاذ نے یوں کہا' جیسے اسے بہلا رہا ہو۔ اس کا خیال تھا کہ اتنا زیادہ جوش دیرپا نہیں ہوتا۔ دو چار دن میں عبداللہ کا شوق سرد پڑ جائے گا۔

لیکن عبداللہ تو معاذ سے چپک کر رہ گیا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے بھی اسے اکیلا نہیں چھوڑا۔ اور آخری پیریڈ کے بعد اس نے معاذ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''بس اب مجھے لے چلو۔''

''بھائی تمہیں سچ مچ کچھ ہو گیا ہے۔'' معاذ نے بے چارگی سے کہا۔

وہ دونوں جہادی تنظیم کے دفتر چلے گئے۔ وہاں جن صاحب سے بات ہوئی' وہ بہت سمجھے ہوئے آدمی تھے۔ انہوں نے عبداللہ سے اس کی عمر پوچھی۔ پھر بولے۔ ''بیٹے...... پہلے اپنی تعلیم تو مکمل کر لو۔ جہاد کے اور بھی روپ ہیں۔ کوئی کسی مجاہد کے لئے ایک گولی خرید کر دے تو وہ بھی جہاد میں شریک ہوا۔ جہاد جان سے بھی ہے۔ اور مال سے بھی۔''

''میرے پاس مال نہیں' صرف جان ہے۔'' عبداللہ نے خشک لہجے میں کہا۔



''میں جانتا ہوں۔ طالب علموں کے پاس مال نہیں ہوتا۔ لیکن وہ فرصت کے اوقات میں پیسے والوں کو یہ یاد دلائیں کہ وہ اپنی دولت کے زور پر بھی جہاد کر سکتے ہیں۔ یہ بھی ایک جہاد ہے بیٹے۔''

''میں اصل جہاد چاہتا ہوں۔''

''اچھا۔ تو یہ فارم بھر دو۔''

عبداللہ نے فوراً ہی فارم بھر کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔ ''اب میں ٹریننگ کے لئے کب جا سکوں گا؟''

''ابھی تو آپ کو اپنے والد سے نو آبجیکشن سرٹیفکیٹ لانا ہوگا۔''

''نو آبجیکشن'' عبداللہ گھبرا گیا۔ ''اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''ضرورت ہے۔ جہاد انفرادی اور اجتماعی دینی فرض ہے۔ اور والدین کی اطاعت کا بھی اللہ نے حکم دیا ہے۔'' ان صاحب نے عبداللہ کی طرف ایک فارم بڑھا دیا۔ اس کے بغیر ہم لوگوں کے لئے بھی قانونی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ آپ یہ فارم بھر کر اس پر اپنے والد کے دستخط کرا لائیں۔''

عبداللہ گھر آیا۔ اُس روز اس سے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ ''کیا بات ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تیری؟'' زلیخا نے تشویش سے پوچھا۔ ''صبح تو نے ٹھیک سے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔''

''طبیعت ٹھیک ہے اماں۔ بس پڑھائی کے کچھ معاملات کی الجھن ہے۔''

اس روز اُس نے کچھ نہیں کہا۔ بس اسی مسئلے پر سوچتا رہا۔ سب کچھ اسے یاد تھا۔ اور اماں کو بھی یاد ہوگا۔ مجذوب کا آنا' کھانا مانگنا' پھر شہادت کی بشارت دینا۔ اماں اُس وقت کیسے بھڑک گئی تھی۔ اماں تو اسے کبھی اجازت نہیں دیں گی۔ ابا کو شاید وہ قائل کر سکتا ہے۔ لیکن اماں کا مسئلہ پھر بھی ہوگا۔ اس مسئلے کا کوئی حل ہے بھی یا نہیں۔ اگر نو آبجیکشن کی شرط نہ ہوتی تو وہ ابا کو ایک خط لکھتا اور چپکے سے نکل جاتا۔

اچانک اسے خیال آیا کہ ایک صورت ہے۔ وہ کسی سے بات نہ کرے۔ نو آبجیکشن پر ابا کی جگہ خود دستخط کردے یا کسی سے بھی کرالے۔ کسی کو کیا پتا چلے گا۔ مگر فوراً ہی اُس کے اندر ملامت ابھری۔ جہاد جیسا عظیم کام اور اُس کے لئے آدمی جھوٹ سے آغاز کرے۔ جھوٹ جو گناہِ کبیرہ ہے۔ اللہ نے سختی سے منع فرمایا ہے۔ یہ تو نیکی کے پودے کو بدی کی زمین میں لگانا ہوا۔ اور پھر اُس کا تجربہ تھا کہ جلد یا بہ دیر جھوٹ کُھلتا ہے اور بہت رسوا کراتا ہے۔ نہیں...... یہ ممکن نہیں۔

وہ سوچتا رہا۔ مگر حامل۔ آخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ ابا سے بات کی جائے اور دستخط کرالئے جائیں۔ جو ممکن ہے' وہ تو کرے۔ آگے اللہ راستہ کھولنے والا ہے۔ اماں کو سمجھانا ابا کا کام ہے' اس کا نہیں۔

اس نتیجے پر پہنچ کر وہ قدرے مطمئن ہوگیا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر وہ دکان پر چلا گیا۔ نو آبجیکشن والا فارم اُس کی جیب میں تھا۔

وہ کئی دن بعد دکان پر گیا تھا۔ نوشاد اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے سمجھ لیا کہ بیٹا کوئی فیصلہ کر چکا ہے۔ اور وہ خود بھی فیصلہ کر چکا تھا کہ بیٹے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔ وہ دکان پر نہیں بیٹھنا چاہتا تو نہ بیٹھے۔ کچھ عزت ہی کمائے گا اس کے لئے۔ اور یہ اسے یقین تھا کہ وہ شادی کے لئے تیار ہو چکا ہوگا۔ اور شاید یہی بتانے کے لئے آیا ہے۔

عبداللہ آتو گیا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔

پھر نوشاد نے ہی اس کا یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ ''کہو بیٹے' کوئی فیصلہ کرلیا؟'' اُس نے پوچھا۔

''جی ابا''۔ عبداللہ نے کہا اور جیب سے فارم نکال کر اسے دے دیا۔ ''اس پر دستخط کردیں ابا۔''



نوشاد نے حیرت سے اسے دیکھا۔ یہ کیسا فیصلہ ہے۔ اس کا دل تشویش سے بھر گیا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''دیکھیں نا ابا۔''

نوشاد نے فارم پڑھا اور گھبرا گیا۔ ''اس پر دستخط کردوں! کس لئے؟''

''ابا' مجھے جہاد پر جانا ہے۔ اور اس کے بغیر میں نہیں جا سکتا۔''

نوشاد کی دانش بدحواسی میں بھی اُس کے ساتھ تھی۔ اس نے بیٹے کو بہت آگے تک دیکھا' اس کی بات کو بہت آگے تک سنا اور سمجھ بھی لیا۔ فرمانبردار بیٹے نے یہ نہیں کہا کہ وہ جہاد پر جانا چاہتا ہے۔ اس نے کہا کہ اسے جانا ہے۔ اس کے لہجے میں مضبوطی تھی' قطعیت تھی۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

''لیکن بیٹے' بوڑھے ماں باپ کا تمہارے سوا کوئی نہیں۔''

''ایسی بات نہ کریں ابا۔ اللہ ہے آپ کا۔ وہی پروردگار ہے۔ یہ صورت حال مجھے جہاد سے نہیں روکتی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن......''

''ابا...... اگر میں آپ کے گھر پیدا نہ ہوا ہوتا...... اللہ کی مہربانی سے...... تو کیا ہوتا۔ تب بھی آپ اس وقت اکیلے ہوتے۔''

''وہ اور بات ہوتی بیٹے۔'' نوشاد نے کہا۔ لیکن اُس نے بات سمجھ لی۔ اب وہ بات آگے بڑھائے گا تو عبداللہ اسے حوالہ دے گا کہ والدین کی اطاعت اُس وقت تک فرض ہے' جب تک کہ ان کا حکم اللہ کے کسی حکم سے متصادم نہ ہو۔ اور وہ ہار جائے گا۔ اس نے پینترہ بدلا۔ ''ٹھیک ہے عبداللہ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں ابھی دستخط کردوں گا۔ مجھے یہ بتادو کہ تم اپنی ماں سے اجازت لے آئے ہو۔''

جوش میں بھرا ہوا عبداللہ ہکا بکا رہ گیا۔ ''نہیں ابا۔ میں نے اماں سے تو بات نہیں کی۔''

"تو پھر ان سے اجازت لے کر مجھے بتا دینا۔ میں دستخط کر دوں گا۔"

"آپ جانتے ہیں ابا' میں انہیں قائل نہیں کر سکتا۔ وہ کبھی نہیں مانیں گی۔"

"تو پھر؟"

"آپ ہی انہیں سمجھائیں۔"

"تم جانتے ہو کہ وہ مجھ سے بھی نہیں مانیں گی۔"

"آپ ہی کچھ کریں ابا۔ دیکھیں' آپ کو بھی بہت بڑا اجر ملے گا انشاء اللہ۔"

نوشاد کا دل پگھل گیا۔ آنکھیں جلنے لگیں۔ بیٹے نے سچ کہا تھا۔ وہ بڑے اجر کا کام تھا۔ مگر اس کے لئے دل بھی بہت بڑا چاہیئے تھا۔ اکلوتے بیٹے کو اس بڑھاپے میں کھونا' اسے محاذِ جنگ پر بھیجنا' یہ تو بڑے دل گردے کا کام تھا۔ لیکن اُس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ اکلوتا بیٹا تو اب بہرحال ہاتھ سے گیا۔ وہ جہاد کی اجازت دے تو وہ گھر چھوڑ جائے گا اور شاید کبھی لوٹ کر نہ آئے۔ جہاد کی اجازت دینے میں اجر بھی ہے اور امکان بھی ہے کہ اُس کی اور زلیخا کی دعاؤں کے نتیجے میں وہ غازی بن کر لوٹ آئے۔ فائدہ بہرحال اجازت دینے میں ہی تھا۔ "ٹھیک ہے بیٹے۔ میں تمہاری اماں سے بات کروں گا۔"

"جلدی کیجئے گا ابا۔" نوشاد کے لہجے میں بے تابی تھی۔

❁ ........ ❁ ........ ❁

زلیخا نے یہ سنتے ہی سر پیٹ لیا۔ اور دل تھام کر بیٹھ گئی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ وہ افغانستان جائے گا! ہرگز نہیں۔"

نوشاد نے جو کچھ سمجھانا تھا' وہ بڑی مشکل سے اسے سمجھایا۔ "وہ بے تاب ہو رہا ہے جہاد کے لئے۔ اجازت نہیں دی تو بھاگ جائے گا گھر سے۔ اور خدانخواستہ ہم عمر بھر روتے رہیں گے۔"

"کیسے بھاگ جائے گا۔ میں باندھ کر رکھوں گی اسے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ زبردستی تو جانور کو نہیں روکا جا سکتا۔ وہ تو انسان ہے۔ ہمارا



بیٹا ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"اجازت دے دو۔ اللہ بھی خوش ہوگا۔ پھر دعا کرتی رہنا اُس کی زندگی کی۔ اللہ قبول کرنے والا ہے۔"

"میں اسے موت کے منہ میں بھیجوں ہی کیوں؟"

"موت کے منہ میں تو کوئی کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ موت تو کسی کو کہیں بھی آ سکتی ہے۔ کسی کو نہیں معلوم۔" نوشاد نے سخت لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آدمی جا کر ریل کی پٹری پر لیٹ جائے۔"

"رہیں جاہل کی جاہل۔" نوشاد کو غصہ آ گیا۔ "سچ ہے' جہالت کبھی نہیں جاتی۔ تمہارے نزدیک شہادت اور خودکشی برابر ہے۔ استغفراللہ۔ اور تم کہتی ہو کہ ایمان والی ہو۔ مسلمان ہو۔"

زلیخا ایک دم شرمندہ ہو گئی۔ "اللہ مجھے معاف کرے۔ تم بھی معاف کر دو مجھے۔ شاید میری جہالت ایمان کو کمزور کر دیتی ہے۔"

نوشاد ٹھنڈا پڑ گیا۔ لیکن لوہا گرم تھا۔ ضرب لگانا بھی ضروری تھا۔ "تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اسلام میں عورت کا کتنا بڑا مقام ہے...... اور کیوں ہے۔ اس لئے کہ وہ مومنوں کو جنم دیتی ہے۔ ان کی پرورش کرتی ہے۔ انہیں سیدھا راستہ دکھاتی ہے۔ تم نے تاریخ پڑھی ہو تو جانو کہ ماں کیا ہے۔ وہ تو بیٹے کو جہاد پر اکساتی ہے۔ اسے شوقِ شہادت دلاتی ہے۔ بیوہ ماں اکلوتے بیٹے کو جہاد پر بھیجنے کے لئے آراستہ کرتی ہے۔ اس کے جسم پر ہتھیار سجاتی ہے اور رخصت کرتے ہوئے کہتی ہے...... میدانِ جنگ میں پیٹھ نہ دکھانا میرے بیٹے۔ پشت پر زخم نہ کھانا۔ ورنہ میں تمہیں دودھ معاف نہیں کروں گی۔ ایسی ہوتی ہے ماں۔ وہ سعادت اور لعنت کے درمیان خود بھی تمیز کرتی ہے اور بیٹے کو بھی کراتی ہے۔"

اس دوران زلیخا روتی رہی تھی۔ اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اُس کے وجود میں دھیرے دھیرے ایک انقلاب کروٹ لے رہا تھا۔ مسلمان ماں بالآخر مسلمان ہو کر سوچ رہی تھی۔ سچ تو ہے۔ یہ دل تو اللہ نے عورت کو' ماں کو ہی دیا ہے کہ ساتواں بیٹا شہید ہونے پر روئے...... یہ سوچ کر نہیں کہ اب وہ اکیلی رہ گئی۔ بلکہ اس بات پر کہ اب اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے اُس کے پاس کوئی بیٹا نہیں بچا۔ میں کیسی ماں ہوں؟ کیا میں مسلمان ہوں؟

اچانک اُس نے جھرجھری لی اور آنکھیں پونچھ لیں۔ ''ٹھیک ہے جی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں بخوشی اسے اجازت دیتی ہوں جہاد پر جانے کی۔''

نوشاد نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ''شکریہ زلیخا' اندر سے تم بہت اچھی ہو۔''

''لیکن میری ایک شرط ہے۔ پہلے عبداللہ کو شادی کرنی ہوگی اور اُس کے بعد تین ماہ یہاں رہنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ خود ہی بیٹے سے بات کرلو۔'' نوشاد نے کہا۔ اس کے دل پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔

❁ ........ ❁ ........ ❁

عبداللہ کو شرط کی شادی والی شق پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ البتہ تین مہینے رکنا اُس کے لئے بہت بھاری پتھر تھا۔ اس کی بے تابی کا تو یہ عالم تھا کہ وہ ایک پل میں محاذِ جنگ پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اسے تو تربیت بھی راہ کی رکاوٹ لگ رہی تھی۔

لیکن زلیخا شرط سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں تھی۔ اُس نے بہت سوچ سمجھ کر شرط لگائی تھی۔ بہو آئے گی تو تنہائی دور ہوگی۔ عبداللہ کے بارے میں تو وہ تب بھی سوچے گی' یاد کرے گی۔ لیکن ہر وقت نہیں۔ بہو میں بھی تو دھیان لگا رہے گا۔ اور کون جانے' اللہ کی عنایت ہو اور کوئی کھلونا آ جائے۔ تب تو وقت ہی نہیں ملے گا۔ پوتے کی



ورش کا تو اپنا ہی مزہ ہے۔

آخر عبداللہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔

انسان کتنا ہی اچھا ہو' اپنی پریشانی میں' اپنے بحران میں خود غرض ہو جاتا ہے۔ زلیخا ر نوشاد کو اس مسئلے میں یہ خیال آیا ہی نہیں کہ اس معاملے میں دو فریق اور بھی ہیں۔ نجمہ ر غزالہ۔ ان کے خیال میں بیٹے کے لئے ماں باپ سے بڑھ کر کوئی ہوتا ہی نہیں۔

زلیخا بڑے اطمینان سے رشتے کی بات کرنے نجمہ کے پاس چلی گئی۔ ''نجمہ...... ب میں باقاعدہ تاریخ لینے کے لئے آنا چاہتی ہوں۔''

نجمہ تو خوش ہوگئی۔ ''سر آنکھوں پر آپا۔''

''چھوٹی سی تقریب کر لیں گے۔ دیکھو نا' عبداللہ کی بہنیں تو آئیں گی ہی۔''

''کیوں نہیں۔ کب چاہتی ہیں آپ۔''

''اس جمعہ کو آجاتے ہیں۔ اور ایک ماہ بعد کی تاریخ رکھ لیں گے۔''

''اتنی جلدی آپا۔''

''جلدی کیسی۔ تمہیں کوئی تیاری کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''ارے آپا' اکلوتی بیٹی ہے میری اور وہ بھی بن باپ کی۔ سب کچھ کروں گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن نجمہ' عبداللہ بے صبرا ہو رہا ہے۔ ہاتھ سے ہی نہ نکل جائے۔''

زلیخا کا اشارہ عبداللہ کے شوقِ جہاد کی طرف تھا۔ اور ہاتھ سے نکلنے کا مطلب یہ تھا کہ کہیں وہ بغیر شادی کے جہاد پر نہ نکل کھڑا ہو۔ مگر نجمہ بیٹی کی ماں تھی۔ اُس نے اور ہی مطلب نکالا۔ ''ایسی باتیں نہ کریں آپا۔''

''بھئی دیکھو' وہ تو آج ہی چلا جانا چاہتا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے شادی' اور اُس کے بعد تین مہینے رکنے کی شرط لگائی ہے۔ دیر ہوگی تو وہ رسی تڑا کر نکل بھاگے گا۔'' زلیخا نے کہا۔

نجمہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ ''کہیں جا رہا ہے عبداللہ۔ آپ نے پہلے کبھی نہیں بتایا آپا۔''

''تو مجھے ہی کون سا معلوم تھا۔'' زلیخا نے سادگی سے کہا۔

''اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر بھیج رہے ہیں عبداللہ کو۔'' نجمہ کے لہجے میں اندیشے پھنکار رہے تھے۔

''ارے نہیں۔ اچانک جہاد کا شوق ہو گیا ہے اسے۔ بہت سمجھایا۔ لیکن آخر میں ہمیں ہی ماننا پڑا۔ وہ جہاد پر جا کر رہے گا۔ میں نے بھی کہا کہ چلو' اللہ کا حکم ہے' ہم اپنی عاقبت کیوں خراب کریں۔''

نجمہ پوری طرح اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''آپا...... یہ تو ٹھیک نہیں۔ اسے ہر قیمت پر روکنا ہوگا۔''

''بھئی...... ہم تو پوری کوشش کر چکے' ہار چکے۔ اب چاہو تو تم اور غزالہ کوشش کر لو۔ آخر غزالہ اُس کی منگیتر ہے۔''

''جی...... جی ہاں۔ کچھ تو کرنا ہوگا۔''

زلیخا اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''تو پھر جمعہ کو ہم لوگ آ جائیں نا۔''

''نہیں آپا۔ جب تک یہ معاملہ نہیں رک جاتا' یہ بات آگے نہیں بڑھ سکتی' نجمہ نے خشک لہجے میں کہا۔ ''آپ ذرا عبداللہ کو میرے پاس بھیج دیں۔''

❁..........❁..........❁

''آؤ بیٹھو بیٹے۔'' نجمہ نے عبداللہ کے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔ ''تم تو نظر ہی نہیں آتے آج کل۔''

''بس خالہ' مصروفیت بہت ہے۔''

''ماشاءاللہ بہت خوش نظر آ رہے ہو۔''

''جی خالہ۔ زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہونے والی ہے نا۔ میں بہت خوش ہوں۔''



''شادی کی؟'' نجمہ نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے' چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

عبداللہ بری طرح گڑبڑا گیا۔ ''وہ بھی ہے خالہ۔ لیکن اماں نے آپ کو بتایا ہوگا کہ میں جہاد پر جانیوالا ہوں۔''

''اوہ۔ لیکن بیٹے' یہ دونوں آرزوئیں تھیں تمہیں ایک ساتھ نہیں کرنی چاہئیں۔''

''میں سمجھا نہیں خالہ۔''

''دیکھو نا۔ محاذ جنگ پر کچھ پتا نہیں ہوتا۔ زندگی کا کیا بھروسہ......''

''تو خالہ' مجھے تو شہادت کی آرزو ہے۔ میں موت سے کیا ڈروں گا۔'' مجھے موت کی کوئی پروا نہیں۔''

''لیکن تمہاری اماں' ابا اور بہنوں کو ہوگی۔ اور انہیں نہ بھی ہو تو مجھے اور غزالہ کو تو ہے ہی۔''

عبداللہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ ہونقوں کی طرح منہ کھولے نجمہ کو دیکھتا رہا۔

''دیکھو عبداللہ'' تم جانتے ہو کہ تم مجھے بیٹے ہی کی طرح عزیز ہو۔ یہ داماد کا قائم ہونے والا رشتہ تو کچھ بھی نہیں۔ تم میرے لئے بیٹے ہو اور ہمیشہ رہو گے۔ اور کوئی ماں اپنے بیٹے کو کھونا نہیں چاہتی۔ اور اب غزالہ کا سوچو۔ تم سے شادی ہو گئی۔ تم محاذ پر چلے گئے اور خدانخواستہ وہاں مارے گئے تو غزالہ کا کیا ہوگا۔ اس کی تو زندگی برباد ہو جائے گی نا۔ کیا بنے گا اس کا۔''

عبداللہ کو اس کی' خدانخواستہ مارے گئے' والی بات بہت بری لگی' کیسی عجیب بات ہے۔ جس چیز کی اسے آرزو ہے' دوسرے اسے بھیانک خدشہ سمجھ رہے ہیں۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے' خدانخواستہ' کا ٹکڑا لگا رہے ہیں۔ لیکن نجمہ کی آخری بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ بالکل ٹھیک بات تھی غزالہ کی تو پوری زندگی برباد ہو جائے گی۔ اُس نے نرمی سے کہا۔ ''یہ اماں کی ضد ہے خالہ۔ ورنہ یہ تو مجھے بھی زیادتی لگتی

ہے۔"

"تم بے فکر رہو۔ میں یہ زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔" نجمہ نے خشک لہجے میں کہا۔ "میں نے تمہیں یہی سمجھانے کے لئے بلایا ہے۔ جہاد کا خیال دل سے نکال دو۔"

"یہ تو ممکن نہیں ہے خالہ۔" عبداللہ نے جوش سے کہا۔

"تمہیں غزالہ سے محبت نہیں ہے؟"

"ہے۔ بہت ہے۔" عبداللہ نے بلا جھجک کہا۔ "لیکن اللہ کے حکم کے سامنے کسی محبت کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔"

"تم تین دن سوچ لو۔ تم اپنا ارادہ بدلو گے، تبھی غزالہ سے تمہاری شادی ہو سکے گی۔"

"یہ تو سوچنے کی بات ہی نہیں خالہ۔ میں ارادہ نہیں بدلوں گا۔" عبداللہ نے اٹھتے ہوئے کہا اور سلام کر کے گھر سے نکل آیا۔

✿......✿......✿

دروازے سے ٹک کر کھڑی غزالہ نے وہ پوری گفتگو سنی۔ اُس کے ہونٹ آپ ہی آپ مسکرانے لگے۔ اس پوری گفتگو میں اس کے کام کی ایک ہی بات تھی اور وہ ہر بات پر بھاری تھی۔ عبداللہ نے کہا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ "بہت محبت کرتا ہے۔" شرمیلے عبداللہ نے یہ بات کہی تھی۔

وہ عبداللہ کو بچپن سے جانتی تھی۔ وہ اظہار کرنے والا تھا ہی نہیں۔ اس نے کبھی اشارے کنائے میں بھی اُس سے محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ بہت گہرا لڑکا تھا۔ اور غزالہ خود اُس سے زیادہ شرمیلی تھی۔ اس نے تو برسوں یہ بات خود سے بھی چھپائی تھی۔ مگر منگنی ہوئی تو اس نے کم از کم اپنے روبرو یہ اعتراف کر لیا کہ وہ عبداللہ سے محبت کرتی ہے۔ مگر اسے یہ یقین نہیں تھا کہ عبداللہ بھی اس سے محبت کرتا ہے۔ اور اسے یہ یقین بھی تھا کہ شادی سے پہلے اسے یہ بات کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی۔



لیکن آج اسے معلوم ہو گیا تھا کہ عبداللہ اُس سے محبت کرتا ہے۔ اور اس اظہار نہ رنے والے نے اس بات کا اعلان صرف اس لئے کر دیا تھا کہ اس وقت وہ جذبہ جہاد ے سرشار تھا۔ سوا اپنی غرض کے حوالے سے غزالہ نے مان لیا کہ وہ بڑا سچا اور طاقت ور ذبہ ہے۔ آدمی کی فطرت بھی تبدیل کر سکتا ہے۔ اور اس جذبہ جہاد نے اس پر احسان لیا تھا تو وہ کیسے اس کی عزت نہ کرتی، کیسے اسے محترم نہ جانتی۔

وہ وہیں کھڑی تھی...... سرشار، بے خود، کہ امی کمرے میں آ گئیں۔ انہوں نے ے نظر بھر کر دیکھا اور بولیں۔ "تو تم نے سب کچھ سن لیا؟"

"جی امی" اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

"چلو اچھا ہوا۔ اب تمہی کچھ کر سکتی ہو۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں امی؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"تم اسے قائل کر سکتی ہو۔ روک سکتی ہو۔"

"مگر کیوں؟ اس میں میرا کیا نقصان ہے؟"

"پاگل لڑکی۔ کچھ سمجھتی ہی نہیں۔" امی نے جھنجلا کر کہا۔ "اچھا، ادھر آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔" انہوں نے اسے اپنے ساتھ بیڈ پر بٹھا لیا۔ "پہلے مجھے ایک بات بتاؤ۔ تم اُس سے محبت کرتی ہو؟"

وہ شرم سے دہری ہو گئی۔ "جو آپ جانتی ہیں، وہ مجھ سے کیوں کہلوانا چاہتی ہیں۔" اُس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"تو پھر تم اپنے نقصان کو کیوں نہیں سمجھتیں۔"

"آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں امی؟"

"تم اسے روکو۔ تم اسے روک سکتی ہو۔ محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"وہ اس کم عمری میں، جوانی میں مر جائے، یہ تم گوارا کر سکتی ہو۔"

بات سادہ تھی۔ لیکن جس لہجے میں، جن الفاظ میں ادا کی گئی تھی، اس نے غزالہ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ رونے لگی۔

''میں تمہیں اکیلے میں اس سے بات کرنے کا موقع دوں گی۔ تم اسے سمجھاؤ۔'' نجمہ نے کہا۔

غزالہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ عبداللہ کی موت کے خیال نے اسے دہلا دیا تھا۔ اب اسے امی سے عبداللہ کی دوسری باتیں یاد بھی آ رہی تھیں اور سمجھ میں بھی آ رہی تھیں۔

❀......❀......❀

عبداللہ کالج سے آیا ہی تھا کہ زلیخا نے کہا۔ ''ہاتھ منہ دھو کر ذرا نجمہ کے ہاں چلا جا۔ واپس آ کر کھانا کھا لینا۔''

عبداللہ کے خیال میں گزشتہ روز نجمہ سے اس کی فیصلہ کن گفتگو ہو چکی تھی۔ وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن انکار بھی نہیں کر سکا۔

وہ نجمہ خالہ کے گھر گیا۔ مگر وہ موجود نہیں تھیں۔ وہ واپس آنے کے لئے پلٹ رہا تھا کہ غزالہ نے اسے پکارا۔ ''سنیں...... مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

عبداللہ پلٹا۔ ''کیا بات ہے غزالہ؟'' غزالہ کے روبرو اس کا نام لینا اسے عجیب لگا۔ کب سے ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

''آپ تھوڑی دیر بیٹھیں۔''

''لیکن خالہ تو نہیں ہیں۔''

''گھبرائیں نہیں۔ میں آپ کو کھا تو نہیں جاؤں گی۔ میری اور آپ کی بات ہے۔''

عبداللہ وہیں صحن میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اب تک اس نے نظر اٹھا کر غزالہ کو نہیں دیکھا تھا۔

''یہ آپ کا جہاد کا کیا سلسلہ ہے؟'' غزالہ نے بات شروع کی۔



''اتنی سی بات ہے کہ مجھے جہاد پر جانا ہے۔''

''جلدی کیا ہے۔ ایک عمر پڑی ہے جہاد کے لئے۔ بعد میں چلے جایئے گا۔''

''فرض کو کبھی موخر نہیں کرنا چاہیئے۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''کیا تم یا کوئی اور...... کوئی ی مجھے ایک دن کی زندگی کی بھی ضمانت دے سکتا ہے۔ تم تو ایک عمر کی بات کر رہی ہو۔ ہاں کسی کو ایک پل کا پتا نہیں ہوتا۔''

غزالہ لاجواب ہو گئی۔ لیکن اسے ماں کی بات بھی رکھنی تھی۔ حجت پر اتر آئی۔ بولی ''فرائض تو بے شمار ہیں۔ ماں باپ کے، دوسرے لوگوں کے حقوق بھی ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ تمام فرض ادا کرتے ہیں۔''

''یہ بہت بری اور گمراہ کن دلیل ہے غزالہ۔ کوئی روزہ رکھے اور آپ اسے کہیں کہ تم نماز تو پڑھتے نہیں۔ پھر روزہ کیوں رکھتے ہو۔ تو میرے خیال میں یہ اسے اللہ کی راہ سے روکنا ہوا۔ بس اسے اتنا احساس دلا دیا جائے کہ نماز بھی فرض ہے۔ اللہ کی مہربانی ہوئی اور توفیق ہوئی تو وہ نماز بھی پڑھنے لگے گا۔ یہ تو بہت بری تلقین ہوئی کہ جب تک آدمی نماز نہ پڑھے، کسی اچھے کام کا ارادہ بھی نہ کرے۔ گویا خود کو شیطان کے سپرد کر دے۔''

حالانکہ عبداللہ کا لہجہ بہت نرم تھا۔ لیکن غزالہ کھسیا گئی۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں نے کہا نا کہ آپ پر آپ کے والدین کے اور دوسرے لوگوں کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ آپ انہیں کیسے نظرانداز کر سکتے ہیں۔''

''اس کی بھی ترجیحات ہوتی ہیں۔ ماں کسی ضرورت کے لئے پکارے تو نماز کی نیت توڑ دی جائے۔ کوئی زخمی سڑک پر نظر آئے، جسے اسپتال لے جانے والا کوئی نہ ہو تو جماعت چھوڑ کر اسے اسپتال لے جانا ہے۔ لیکن جہاد کے لئے کوئی عذر نہیں۔ یعنی جہاد افضل ترین عبادت ہے۔ اس سے منہ نہیں موڑا جا سکتا۔ اور میں اپنے والدین سے اجازت بھی لے چکا ہوں۔ اور تم کن لوگوں کی بات کر رہی ہو؟''

غزالہ اداس ہوگئی۔ "اور کوئی نہیں ہے آپ کے خیال میں؟"

"تم ہو۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تم مجھے نہیں روکو گی۔"

"میں روکنا نہیں چاہتی۔ لیکن میں آپ کو کھونا بھی نہیں چاہتی۔" غزالہ نے نجانے کیسے اتنی مشکل بات اتنی آسانی سے کہہ دی۔

"جو نصیب میں نہ ہو' وہ مل ہی نہیں سکتا۔ اور جو چیز جتنی دیر کے لئے بھی مل جائے' اس پر اللہ کا شکر واجب ہے۔"

"یہ میں سمجھتی ہوں۔ لیکن امی نہیں سمجھتیں۔"

"انہیں سمجھاؤ۔ دیکھو غزالہ' تمہیں یاد ہے' خالو مجھے اور تمہیں مجاہدین کی' شہداء کی کہانیاں سناتے تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ کیا تم نے نہیں سیکھا۔ دیکھو' عورت کی عظمت اسی ایثار میں تو ہے۔"

اس یاد دہانی نے غزالہ کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں آپ کی خوشی میں خوش ہوں۔ آپ شوق سے جائیں۔ اللہ آپ کو جو مرتبہ چاہے عطا فرمائے۔ میرے لئے فخر کی بات ہوگی۔ لیکن میں امی سے نہیں لڑ سکتی۔ وہ منگنی توڑ دیں گی اور میں مزاحمت نہیں کروں گی۔"

"میں تمہیں اس کے لئے کہوں گا بھی نہیں۔"

"اب آخری بات سن لیں۔ شاید میں دوبارہ کبھی نہ کہوں۔ مگر یہ بتانا ضروری ہے آپ کو۔ ہماری منگنی رہے نہ رہے' میں آپ کی ہوں' آپ کی رہوں گی۔ آپ کا انتظار کروں گی۔ آپ کے لئے ہمیشہ دعا کروں گی۔ یہ بڑی بات صرف یہ سوچ کر منہ سے نکالی ہے کہ شاید آپ کے لئے طاقت بن جائے۔"

"بہت شکریہ غزالہ۔ یہ طاقت ہمیشہ میرے ساتھ رہے گی۔ تم نے مجھے بہت بڑی نعمت دی ہے۔" عبداللہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا غزالہ...... فی امان اللہ۔"

"فی امان اللہ۔"



عبداللہ نجمہ کے گھر سے نکلا تو ہواؤں کی طرح ہلکا پھلکا اور آزاد تھا۔

❁......❁......❁

نجمہ نے بیٹی سے کہا۔ "مجھے مختصر لفظوں میں صرف اتنا بتاؤ کہ فیصلہ کیا ہوا ہے۔"

"امی' وہ اللہ کے حکم سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ ان کے پاس کوئی عذر نہیں ہے۔" زالہ نے یوں کہا' جیسے عبداللہ کی وکالت کر رہی ہو۔ حالانکہ وہ ماں کو ایسا کوئی تاثر نہیں ینا چاہتی تھی۔ ورنہ وہ یہ اضافہ بھی کرتی کہ...... انہیں ایسا کرنا بھی نہیں چاہیئے۔ اور یہ س کے دل کی آواز بھی ہوتی۔

مگر نجمہ یہ بات سمجھ نہیں سکی۔ اس کی سوئی تو بس وہیں اٹکی ہوئی تھی کہ عبداللہ کو نہیں انا چاہیئے۔

"افسوس' صد افسوس۔" نجمہ نے آہ بھر کے کہا۔ "لیکن عمر بھر کے رونے سے ایک ار کا رو لینا بہتر ہے۔"

غزالہ کا دل ڈوبنے لگا۔ لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔

"منگنی کی انگوٹھی اتار کر مجھے دے دو بیٹی۔"

غزالہ نے خاموشی سے انگوٹھی اتار کر اسے دے دی۔

"تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے امی۔"

نجمہ نے انگوٹھی لی اور سیدھی عبداللہ کے گھر چلی گئی۔ عبداللہ صحن میں بیٹھا تھا۔ زلیخا کچن میں تھی۔ نجمہ کو دیکھ کر باہر نکل آئی۔ "آؤ نجمہ' بیٹھو۔"

"نہیں آپا۔ میں بیٹھنے کے لئے نہیں آئی۔ اور شاید آج کے بعد آپ میرا یہاں آنا برداشت بھی نہ کریں۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" زلیخا نے بے حد یقین سے کہا۔

"جلد بازی میں اتنی بڑی بات نہ کہیں۔ پہلے میری سن لیں آپا۔ میں یہ انگوٹھی

لوٹانے آئی ہوں۔ باقی چیزیں کل واپس کر دوں گی۔ اب منگنی ختم سمجھیں۔"

زلیخا پہلے تو ہکا بکا رہ گئی۔ پھر نجمہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے میں لے گئی۔ "نجمہ...... یہاں سکون سے بیٹھ کر بات کرو۔ جلد بازی تو تم کر رہی ہو۔"

کمرے میں جا کر نجمہ رونے لگی۔ زلیخا نے کہا۔ "لو خود ہی منگنی توڑ دی اور خود ہی رو بھی رہی ہو۔"

"اپنے نقصان پر آدمی روئے بھی نہیں۔"

"تو نقصان ہی کیوں کرے۔"

"مجبوری ہے آپا۔ آپ خود کو میری جگہ رکھ کر تو دیکھیں۔"

"دیکھا ہے۔ سمجھتی ہوں۔ تم بھی تو عبداللہ کو بیٹا ہی سمجھتی ہو۔ اور میں بھی عبداللہ کی ماں ہوں۔"

"نہیں آپا۔ آپ نے نہیں دیکھا۔ نہیں سمجھا۔ میری محرومیوں سے اللہ آپ کو ہمیشہ محفوظ رکھے۔ دیکھیں، میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ یہ الگ بات کہ عبداللہ کو میں نے اس رشتے سے پہلے بھی بیٹا ہی سمجھا۔ اور آپا، اب میں بیوہ ہوں۔ شوہر سے محروم، بے آسرا۔ کیسی تنہائی ہے، کیسا عدم تحفظ ہے، کیا بتاؤں۔ اور آپا، میں شوہر سے بیس سال کی رفاقت کے بعد محروم ہوئی ہوں۔ کیا میں بیٹی کو اتنی کم عمری میں بیوگی کا تحفہ دے دوں۔ کون سی ماں ایسی ہے، جو ایسا کر سکتی ہے۔ آپ دل پر ہاتھ رکھ کر کہیں آپا، آپ ایسا کر سکتی ہیں۔"

زلیخا دم بخود رہ گئی۔ اسے یہ بات بہت بری لگی کہ نجمہ نے ایسے کہا، جیسے عبداللہ کو ابھی چند مہینوں میں مر جانا ہے۔ اللہ اسے سو برس کی عمر دے۔ جہاد سے لوگ صحیح و سلامت بھی تو لوٹتے ہیں...... غازی کہلاتے ہیں۔ مگر فوراً ہی اسے یہ احساس ہو گیا کہ نجمہ کی بات سخت اور تلخ سہی، لیکن ہے سچی۔ وہ اگر نجمہ کی جگہ ہوتی تو اس سے زیادہ درشتی کے ساتھ رشتہ توڑتی۔



"تم ٹھیک کہہ رہی ہو نجمہ۔" اس نے نجمہ کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "میں بھی یہی کرتی۔ ٹھیک ہے، منگنی ختم۔ مگر ایک بات یاد رکھنا۔ تمہارے لئے اور غزالہ کے یہ گھر اور ہم سب ویسے ہی رہیں گے۔ اور کون جانے، بعد میں کبھی......"

"بس اللہ سے دعا کرتی رہیں آپا۔ میں بھی کروں گی۔"

نوشاد کو پتا چلا تو اس نے صرف اتنا کہا کہ نجمہ کی بات سولہ آنے درست ہے۔ اور یہ کہا کہ اس کے باوجود ہمیں اپنا ہی سمجھے۔

زلیخا نے آخری بار عبداللہ کو جھنجوڑنے کی کوشش کی۔ اس نے عبداللہ کو انگوٹھی دی۔ "لے بیٹے، تیری غزالہ سے نسبت ختم ہو گئی۔ اب تو بھی ان کی انگوٹھی واپس دے۔"

"جی اماں۔" عبداللہ نے نہایت فرمانبرداری سے، ہنسی خوشی منگنی کی انگوٹھی اتار کر لوٹا دی اور غزالہ کی انگوٹھی کے لئے بولا۔ "اسے آپ ہی سنبھال کر رکھیں اماں۔ کبھی کام آ جائے۔" اس کے لہجے میں افسردگی کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

اسے مسکراتے دیکھ کر زلیخا کے دل پر گھونسہ سا لگا۔ "بیٹے، یہ انگوٹھی اتارتے ہوئے کوئی دکھ نہیں ہوا!"

"کیوں ہو اماں۔ جو رشتے انگوٹھی کے محتاج ہوں اور اللہ کے راستے پر بڑھنے سے روکتے ہوں، ان کا ٹوٹ جانا ہی بہتر ہے۔ رشتے تو وہی اچھے ہوتے ہیں، جو کبھی نہ ٹوٹنے والے ہوں۔"

زلیخا اس کی بات کو نہ سمجھ سکی۔ اور عبداللہ نے اس سے دل کی بات نہیں کہی۔ دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے جہاد پر جانے کے لئے چار مہینے انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

تربیت پر جانے سے پہلے عبداللہ نے نوشاد سے کہا۔ "ابا...... آپ جہاد میں حصہ کیوں نہیں لیتے۔"

"میں بوڑھا آدمی کیا جہاد کروں گا بیٹے۔"

''کیوں نہیں کر سکتے۔ آپ کو بابا کی بات یاد نہیں۔'' عبداللہ برہان صاحب کو بابا کہتا تھا۔ ''تازہ دم گھوڑوں کا اب زمانہ نہیں ہی۔ اب آپ یہ سمجھ لیں کہ کسی مجاہد کے لئے آپ کوئی گن خرید کر دیدیں۔ اتنی حیثیت نہیں تو میگزین خرید دیں۔ یہ بھی نہیں تو ایک گولی خرید دیں۔ پیٹ سے پتھر باندھ کر کسی جہاد کرنے والے کو ایک وقت کا کھانا دے دیں۔ برفانی علاقے میں موسم کی شدت اور کافروں سے بیک وقت لڑنے والے کسی مجاہد کو ایک کمبل' ایک جیکٹ' ایک سویٹر' کچھ نہ سہی ایک چادر کی امداد دے دیں۔ یہ بھی جہاد ہے ابا۔ اللہ نے آپ کو بہت کچھ دیا ہے۔ آپ تو جہاد کرتے رہیئے۔ اب تو ہر چیز دو بھیجئے گا۔ ایک اپنے بیٹے کے لئے اور دوسری کسی مجاہد کے لئے۔''

نوشاد نے بیٹے کو لپٹا لیا اور اتنا رویا کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ ''میرے بیٹے' تم تو اللہ کی بہت بڑی نعمت ہو میرے لئے۔ میں کیسا بدنصیب تھا کہ وسائل ہوتے ہوئے بھی بے حس اور بے ضمیر بنا رہا۔ خود کو جہاد کی نعمت سے محروم رکھا میں نے۔ اللہ مجھے معاف کرے بیٹے۔ تمہارا دیا ہوا یہ سبق میں کبھی نہیں بھولوں گا۔''

اگلے روز عبداللہ تربیتی کیمپ کے لئے روانہ ہوگیا!

❁..........❁..........❁

تربیتی کیمپ پہاڑی علاقے میں تھا۔ عبداللہ کے لئے تو وہ کہیں بھی ہوتا' نئی دنیا ہی ہوتی۔ پہلی بار اس نے اپنے شہر سے باہر قدم رکھا تھا۔ اسے وہ سب بہت اچھا' بہت خوب صورت لگا۔ ایسی خوب صورتی کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اونچے اونچے سرسبز پہاڑ' درختوں پر لدے ہوئے وہ پھل جو شہروں میں ٹھیلوں پر بھی بہت مہنگے ملتے تھے۔ ہوا تازہ تھی۔ فضا نتھری ہوئی اور آسمان ایسا شفاف کہ کم از کم اسے بالکل نیا لگتا تھا۔ اور بادلوں کے اتنے رنگ بھی ہو سکتے ہیں' یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

وہ تو مسحور ہو کر رہ گیا۔ یہ پاکستان ہے...... اتنا خوب صورت! وہ تو کراچی کو ہی پاکستان سمجھتا تھا۔ یہ سب دیکھ کر اسے لگا کہ اس کا وجود پھیل گیا ہے۔ وہ بڑا ہو گیا ہے۔



دنیا بھی بڑی ہوگئی تھی۔

ایک دن کے آرام کے بعد اگلے روز تربیت شروع ہوگئی۔ ان کا ساٹھ لڑکوں کا ایک گروپ تھا۔ اس میں ہر جگہ' ہر علاقے کے لڑکے تھے۔ سب ایک ہی جذبے کے تحت' ایک ہی شوق کے حصول کے لئے نکلے تھے۔

تربیت بہت سخت تھی اور تربیت دینے والے اس سے بھی سخت۔ وہ بالکل فوجی انداز کی تربیت تھی۔ لیکن درحقیقت اس سے بھی زیادہ سخت تھی۔ کیونکہ یہاں نہ صرف جسم بنایا جا رہا تھا بلکہ کم سے کم وقت میں وہ سب کچھ سکھایا جا رہا تھا' جو ایک فوجی کو برسوں میں سکھایا جاتا ہے۔

تین دن میں عبداللہ کی تمام دبی ہوئی صلاحیتیں ابھر آئیں۔ جسم کا لچکیلا پن' جسے اس نے سلا دیا تھا' بیدار ہوگیا۔ بچپن سے وہ درختوں' دیواروں پر چڑھتا' کودتا پھاندتا آیا تھا۔ اب اسے رسّے کے ذریعے چڑھنا ہوتا تھا۔

مصروفیت اتنی ہوتی تھی کہ گرد و پیش کو دیکھنے اور سراہنے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ اس ٹریننگ کے دو حصے تھے۔ ایک میں جدید اسلحے کا استعمال سکھایا جاتا تھا۔ اور دوسرے میں پہاڑوں پر چڑھنا۔ تربیت پانے والے سب جوان تھے۔ پہلا حصہ تو انہیں بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ اور پرجوش ہو جاتے تھے۔ لیکن دوسرے حصے سے سب گھبراتے تھے۔

پندرہ دن ہوئے تو لڑکے انسٹرکٹرز سے الجھنے لگے۔ انہیں اس کی سخت زبان کی شکایت تھی۔ ''ہم رضا کار ہیں' مجاہد ہیں۔ کوئی تنخواہ دار ملازم نہیں ہیں۔'' ایک لڑکے نے بڑے غصے سے کہا۔

''تو بچے' میں بھی رضا کار ہی ہوں۔ تم سے تنخواہ نہیں لے رہا ہوں۔'' انسٹرکٹر نے ترکی بہ ترکی کہا۔

''ہم سے نہ سہی' کسی سے تو تنخواہ لیتے ہو گے۔'' دوسرا لڑکا بولا۔

''میں کسی سے تنخواہ نہیں لیتا۔ جہاد کر رہا ہوں میں۔''

"بڑا آسان جہاد ہے۔محاذ چھوڑ کر یہاں بیٹھے ہو۔" تیسرے نے کہا۔

انسٹرکٹر کا چہرہ تمتما اٹھا۔"تم جہاد کا مطلب ہی نہیں سمجھتے۔اسی لئے تو تربیت لے رہے ہو۔"

"کیا ہوتا ہے جہاد کا مطلب؟ یہ جو آپ کر رہے ہیں!"

"آدمی اللہ کی راہ میں لڑنے کے لئے نکلا ہوا ہو تو سانس لینا بھی جہاد ہے، کھانا پینا بھی جہاد ہے اور سونا بھی۔اس لئے کہ اس راہ میں کوئی کام بھی آدمی بلاضرورت نہیں کرتا۔زندگی قائم رکھنا بھی جہاد ہے بچو۔گھوڑے کی مالش کر کے اسے تازہ دم کرنا بھی جہاد ہے۔میں تو تمہیں جہاد کے لئے تیار کر رہا ہوں۔"

"مگر میں تربیت لے کر یہ کام کبھی نہیں کروں گا۔میں محاذ پر بہادروں کی طرح لڑتے ہوئے شہید ہونا چاہتا ہوں۔" ایک پرجوش لڑکے نے کہا۔

"سنو لڑکو۔ہم نے بہت باتیں کر لیں۔" انسٹرکٹر کے لہجے میں قطعیت تھی۔"میں یہاں بہت بااختیار ہوں۔میرے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ تمہیں گھر واپس بھیج سکتا ہے۔تم نئے نئے ہو۔اس لئے میں نے اتنی باتیں سن لیں۔اب کوئی ایک لفظ نہ کہے۔جہاد کے لئے ہر طرح کی جسمانی اور تیکنیکی تربیت کے ساتھ ڈسپلن بھی ضروری ہوتا ہے۔محاذ جنگ پر کماندار کے پاس بس حکم صادر کرنے کی مہلت ہوتی ہے۔وہاں مباحثے نہیں ہوتے۔وضاحتیں نہیں ہوتیں۔صرف تعمیل ہوتی ہے۔حکم ہے کہ پہاڑ سے کود جاؤ تو بس کود جاؤ۔اب کوئی بات نہیں کرے گا۔"

اس کے باوجود اگلے روز ایک لڑکے نے پھر بحث چھیڑی۔انسٹرکٹر نے اسی وقت اسے رخصت کر دیا۔اوپر تک اُس لڑکے کی شنوائی نہیں ہوئی اور اسے واپس جانا پڑا۔اس واقعے نے سب کو الرٹ کر دیا۔مباحثے ختم ہو گئے۔

دن گزرتے گئے اور تربیت سخت تر ہوتی گئی۔اب تربیت رات میں بھی ہو رہی تھی۔



میدانی علاقوں کے لڑکے پہاڑ پر چڑھنے سے بہت گھبراتے تھے۔ان کے نزدیک یہ غیر ضروری بھی تھا۔لیکن اب انسٹرکٹر سے بات نہیں کی جا سکتی تھی۔چنانچہ ایک رات وہ کیمپ کمانڈر کے پاس پہنچ گئے۔

کیمپ کمانڈر نے انہیں دل کھول کر وقت دیا اور اُن کی ہر بات بڑے تحمل سے سُنی۔

"سر، ہم یہاں بہت خوش ہیں کہ جنگ کرنا سیکھ رہے ہیں۔ہمیں اسلحہ کا استعمال اور دو بدو لڑائی کے طریقے سیکھتے ہوئے بڑی خوشی ہوتی ہے۔" ایک لڑکے نے سب کی نمائندگی کرتے ہوئے بات کی۔"لیکن بوجھ اٹھا کر عمودی پہاڑ پر چڑھنا اترنا ہمیں بہت برا لگتا ہے، یہ تو زیادتی ہے۔"

"کیوں؟ کیسے؟" کمانڈر کم سے کم لفظوں میں بات کرنے کا عادی تھا۔

"سر......ایک ذرا سی لغزش ہمیں موت کے منہ میں پہنچا سکتی ہے۔"

"جو موت سے ڈرتا ہو، وہ گھر میں بیٹھے۔جہاد میں تو سر سے کفن باندھ کر نکلا جاتا ہے۔"

"ہم موت سے نہیں ڈرتے سر۔موت کی آرزو میں گھر چھوڑ کر آئے ہیں۔مگر ہمیں شہادت کی آرزو ہے، حرام موت کی نہیں۔"

"اور یہ تمہارے خیال میں حرام موت ہو گی؟"

"اور کیا سر۔ہم تو دشمن کو مار کر مرنا چاہتے ہیں۔"

کمانڈر مسکرایا۔اس مسکراہٹ میں بڑی تفہیم تھی، درگزر تھا۔"بات یہ ہے کہ تم ابھی بچے ہو۔" اُس نے نرم لہجے میں کہا۔"شہادت اور خودکشی کا فرق نہیں سمجھتے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تازہ دم گھوڑے جہاد کے لئے تیار رکھو۔اور بچو، اللہ کی ایک ایک بات کی ہزاروں حکمتیں ہیں۔اللہ کی ہر بات کو صرف سطح پر نہیں، گہرائی میں سمجھنے کی کوشش کرو۔وسیع تناظر اور مفہوم میں۔سو۔میں سمجھتا ہوں کہ یہاں بات صرف تازہ دم

گھوڑوں کی نہیں۔ اللہ نے حکم فرمایا ہے کہ کفار سے مقابلے کے لئے ہر طرح سے تیار رہو۔ تمام ممکنہ وسائل اکٹھے کرو۔ جان تمہارے پاس ہے۔ اسلحے کا بندوبست کرو۔ ذرائع نقل وحمل کی فکر کرو۔ جذبہ جہاد کو شوقِ شہادت سے مہمیز کرو۔ اور میدانِ جنگ میں اترو تو دشمن سے زیادہ تیار نظر آؤ۔ یعنی پہلے سے ہوم ورک کر کے رکھو۔ تو یہ تیاری ہے میرے بچو۔ تم سوچو، تمہیں خاص طور پر یہاں تربیت کیوں دی جا رہی ہے۔ کراچی میں بھی دی جا سکتی تھی۔ کہیں بھی دی جا سکتی تھی۔ یہ تیاری ہے میرے بچو۔ افغانستان پہاڑی علاقہ ہے۔ سنگلاخ پہاڑی علاقہ، تم وہاں چل بھی نہ سکو تو جہاد کیا کرو گے۔ دشمن تعداد میں تم سے زیادہ ہے۔ طاقت میں تم سے بڑھ کر ہے۔ اس سے لڑنے کے لئے تمہیں ایسے پہاڑی راستوں پر شارٹ کٹ لگانا ہوگا، جہاں اس کا دھیان بھی نہ جائے۔ ایسے پہاڑی راستے، جن پر ایک غلط قدم سیدھا موت کے منہ میں لے جائے گا۔ لیکن جب تم خلافِ توقع اس راستے سے دشمن کے سر پر پہنچ کر وار کرو گے تو وہ حواس باختہ ہو جائے گا۔ وہ تمہیں برتر اور خود کو کمتر تسلیم کرے گا۔ تبھی تم فتح یاب ہو گے۔

''اب تم شہادت اور خودکشی کا فرق سمجھو۔ فیصلہ تو صرف اللہ کا ہے۔ وہ جسے جو چاہے عطا فرما دے۔ میں اپنی ناقص فہم کے مطابق بات کر رہا ہوں۔ شاید اس کی منطق تمہاری سمجھ میں آ جائے۔ تمہیں علم ہے کہ دشمن کے پاس توپیں ہیں، میزائل ہیں، راکٹ ہیں، طاقت ور گنیں ہیں۔ اب اگر تم اسلحہ ہوتے ہوئے خالی ہاتھ اس سے لڑنے کے لئے نکل جاؤ اور مارے جاؤ تو میرے نزدیک یہ خودکشی ہوگی۔ ہاں اگر اسلحے سے محروم ہو اور تب ایسا کرو تو یہ شہادت کا اعلیٰ ترین درجہ ہوگا۔ تم اگر پہاڑوں پر چڑھنا اترنا سیکھ سکتے ہو۔ لیکن سیکھے بغیر جہاد کے لئے افغانستان چلے جاؤ تو یہ خودکشی ہوگی۔ تیاری کا حکم اللہ نے اسی لئے دیا ہے۔

''ایک بات اور سن لو۔ تم نے جہاد کا ارادہ کر لیا۔ روانگی تین دن بعد ہے۔ مگر اسی لمحے سے تم حالتِ جہاد میں ہو۔ اب کسی بھی طرح تمہیں موت آ جائے، چاہے تم محاذ پر



ہنچ بھی نہیں ہو، تو تم انشاء اللہ شہید ہو گے۔ کیونکہ تم اللہ کی راہ میں آ چکے۔ لڑائی شروع ر چکے۔ اللہ ایسا ہی مہربان ہے۔ نیکی کا ارادہ کرو اور مر جاؤ تو اس عمل کی جزا ملے گی، جو ر بھی نہیں سکے۔ اور گناہ کا ارادہ کیا اور مر گئے تو اس کی سزا نہیں ملے گی۔ کیونکہ وہ تم نے کیا ہی نہیں۔ یہ مہربان رب کی رحمت ہے۔ سو اب اگر تم یہاں تربیت کے دوران انخواستہ بخار سے بھی مر جاؤ تو انشاء اللہ شہید کا رتبہ پاؤ گے۔ اور یہاں جان کی فاظت کی خاطر تیاری سے بچو۔ اور تیاری پوری نہ ہونے کی وجہ سے محاذ پر کافروں کے تھ، یا پاؤں پھسلنے سے مر جاؤ تو اللہ بخشنے والا ہے۔ لیکن سوچو تو، وہ تم سے باز پرس کر سکتا ہے اس پر۔

''اور ایک بات۔ شوقِ شہادت یہ نہیں کہ محاذ پر جاتے ہی موت کی، آرزو کرو اور لی فرصت میں مر جاؤ۔ شوقِ شہادت زیادہ سے زیادہ کافروں کو قتل کرنے سے مشروط ہے۔ میدانِ جنگ میں موت کی نہیں، ایسی زیادہ سے زیادہ زندگی کی آرزو کرو، جس میں یادہ سے زیادہ کافروں کو قتل کر سکو۔ یہ نازک فرق ہمیشہ یاد رکھنا۔ ورنہ جذباتی ہو کر جلد ے جلد مرنے کی آرزو کرو گے اور بہت خسارے میں رہو گے۔

''اور اب میری آخری بات سن لو۔ میں اور یہاں کا ہر انسٹرکٹر اس میں خوش نہیں ہ ہم محاذ سے دور اور محفوظ یہاں تمہیں تربیت دے رہے ہیں۔ ہمیں قلق ہوتا ہے اس محرومی کا احساس ہوتا ہے۔ ہر سپاہی میدانِ جنگ میں جا کر زیادہ سے زیادہ کافروں ہلاک کرنے کا شوق رکھتا ہے۔ ہم یہاں تمہیں تیار کر رہے ہیں تو یہ ایثار ہے ہمارا۔ راس لئے ہے کہ یہ بڑا کام ہے۔ ہم سو کافروں کو قتل کرنے کے بجائے سو مجاہد تیار ر رہے ہیں، جو انشاء اللہ ہزاروں کافروں کو قتل کریں گے۔ یہ کبھی نہ سمجھنا کہ ہم یہاں ٹی ہیں۔''

لڑکوں پر سناٹا طاری تھا۔ عبداللہ کا خیال تھا کہ آج تربیت مکمل ہو گئی۔ ذہن میں ب کچھ صاف ہو گیا تھا...... جہاد کا، شہادت کا تصور۔ کہیں کوئی ابہام نہیں تھا۔ کم از کم

وہ کہہ سکتا تھا کہ وہ شوقِ شہادت کا غلط مفہوم لے کر یہاں آیا تھا۔ وہ مرنا چاہتا تھا مگر اب اس کا تصور درست ہو گیا تھا۔

"کسی کو اور کچھ کہنا ہے؟" کمانڈر نے پوچھا۔

لڑکے ایک دم جوش سے بھر گئے۔ "جی نہیں سر۔" سب نے بیک آواز کہا۔ "اور سر، ہم شرمندہ ہیں۔ ہم غلطی پر تھے۔"

اس دن کے بعد تربیت میں جیسے جان پڑ گئی۔ انسٹرکٹر کے ایک اشارے پر مجاہد کھائی میں کودنے کو تیار رہتے تھے۔ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ شہادت انہیں یہاں بھی مل سکتی ہے۔ بس ہوم ورک میں کمی نہیں رہنی چاہیئے۔

❁.............❁.............❁

نوشاد کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ ایک رات میں معزز ہو گیا ہے!

عبداللہ کی روانگی کے اگلے روز ہی اس کی حیرت کا آغاز ہو گیا تھا۔ گاہکوں کے لہجے میں اس کے لئے عزت اور احترام آ گیا۔ اور حوالہ عبداللہ تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنی عمر کے مطابق پوچھتا...... عبداللہ بھائی چلے گئے...... عبداللہ چلا گیا۔

چند روز گزرے تو لہجوں کا تپاک اور احترام بڑھ گیا۔ کوئی خیر خبر عبداللہ کی؟ کوئی خط بھی آیا؟ تربیت کے دوران وقت کہاں ملتا ہوگا؟ جو راہِ خدا میں نکل گیا جی، وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو گیا۔

اور نوشاد بے بسی سے ہر ایک سے کہتا۔ "بھائی...... آپا...... بیٹا...... ابھی پانچ دن ہوئے ہیں۔ عبداللہ کو گئے۔ خط انشاء اللہ آئے گا۔"

نوشاد کو حیرت ہوتی۔ دکان پر ہر وقت عبداللہ کا نام گونجتا رہتا۔ ہر چھوٹا بڑا، بچہ جوان بوڑھا، ہر مرد عورت عبداللہ کو پوچھتا۔ اور لہجوں میں ایسی محبت اور اپنائیت ہوتی کہ جیسے عبداللہ ان کا بہت اپنا ہو...... بہت اپنا۔ اس سے بھی بڑھ کر۔

وہ سوچتا، یہ بات کیا ہے۔ یہ عبداللہ اچانک اتنا مقبول کیسے ہو گیا۔ پہلے تو کوئی



اسے نہیں پوچھتا تھا۔ ایک دن ایک عورت سے راز کھلا۔ "عبداللہ اس بستی کا بیٹا ہے...... فرزند ہے۔"

"جی ہاں۔ بستی کا نام روشن کر دیا عبداللہ نے۔" ایک ادھیڑ عمر گاہک نے کہا۔

"سب کے سر فخر سے اونچے کر دیئے۔ پوری بستی پر احسان ہے عبداللہ بھائی کا۔" ایک لڑکا بولا۔

عبداللہ کے جانے کے بعد نوشاد نے سوچا تھا کہ اس کے لئے مسئلہ صرف رات ہوگی۔ دن بھر وہ دکان داری میں الجھا رہے گا۔ اسے عبداللہ کا خیال بھی نہیں آئے گا۔ اسی لئے اسے زلیخا پر ترس آتا تھا۔ وہ بے چاری گھر میں اکیلی ہوگی۔ عبداللہ کو یاد کرنے کے سوا اسے کوئی کام نہیں ہوگا۔ مگر یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ دکان داری کی مصروفیت میں بھی ہر لمحہ عبداللہ کو یاد کرے گا۔ ہر لمحے عبداللہ کا تذکرہ رہے گا۔ یہ الگ بات کہ وہ دکھی کبھی نہیں ہوا۔ اللہ کا شکر ادا کرتا رہا کہ اسے اور عبداللہ کو اتنی عزت، اتنی محبت ملی۔ وہ فخر کرتا کہ اللہ نے اسے ایسا بیٹا عطا فرمایا۔

ایک رات وہ برہان صاحب کے ہاں جاتے جاتے ٹھٹک گیا۔ اسے خیال آیا کہ اُس نے اب بھی یہی معمول رکھا ہے۔ بلکہ اس کے سارے معمولات وہی ہیں۔ اور یہ خودغرضی ہے۔ اسے زلیخا کی تنہائی کی فکر بھی کرنی چاہیئے۔ اس بے چاری پر تنہائی میں بیٹے کی جدائی کیسے شاق گزرتی ہوگی۔

یہ سوچ کر وہ گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں اس نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ دن میں بھی دو تین بار وہ آدھے گھنٹے کے لئے، چائے پینے کے بہانے گھر چلا جایا کرے گا۔ زلیخا کی دل جوئی ہی ہو جائے گی۔

وہ گھر پہنچا تو ایک بے حد خوش گوار حیرت اس کی منتظر تھی۔ زلیخا نماز پڑھ رہی تھی۔ ٹھیک تو ہے۔ نوشاد نے سوچا۔ دل پریشان ہو تو اپنے رب کی بارگاہ میں ہی سکون ملتا ہے۔

زلیخا نے سلام پھیر کر اسے دیکھا اور حیرت سے بولی۔ ''تم آج جلدی آگئے؟''

''ہاں۔ سوچا کچھ دیر ساتھ بیٹھیں گے۔ بات کریں گے۔'' نوشاد نے کہا۔ اور یہ سچ تھا۔ عبداللہ کے جانے کے بعد وہ برہان صاحب کے ہاں زیادہ دیر بیٹھنے لگا تھا۔ گیارہ بجے وہاں سے آتا۔ کھانا کھاتے کھاتے ساڑھے گیارہ بج جاتے۔ چہل قدمی کے بعد وہ بستر پر گرتا تو بے سدھ ہو کر سو جاتا۔ فجر کے وقت اٹھنا جو ہوتا تھا۔ اب تک اسے زلیخا سے بات کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ وہ بات کرنے سے بچ بھی رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ زلیخا کی کمزوری اسے بھی کمزور کر دے گی۔

''کھانا لے آؤں؟''

''نہیں۔ بعد میں کھاؤں گا۔ ابھی میرے پاس بیٹھو۔ بات کرو۔''

زلیخا اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ ''کیا بات ہے۔ پریشان ہو؟''

''نہیں۔ لیکن یہ سوچ رہا تھا کہ تم پر دن میں کیا گزرتی ہوگی۔ اکیلی ہوتی ہو۔''

''میں اور اکیلی''۔ زلیخا نے حیرت سے کہا۔ ''پہلے ہوتی تھی' اب نہیں۔ پتا ہے' کیسی عجیب بات ہے۔ جب سے عبداللہ گیا ہے' لگتا ہے پوری بستی میری ہو گئی ہے۔ کوئی نہ کوئی آتا رہتا ہے۔ ایک آتا ہے۔ ایک جاتا ہے۔ ایک پل اکیلی نہیں رہ پاتی میں۔''

نوشاد حیران رہ گیا۔ ''کون آتا ہے یہاں؟''

''ارے دور دور سے عورتیں اور بچیاں آتی ہیں۔ میں تو جانتی بھی نہیں کسی کو۔ اور اپنی گلی سے بھی آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''مجھے دیکھنے آتی ہیں...... عبداللہ کی ماں کو۔ اس کا مزاج' اس کی خیریت پوچھنے کو۔ اور پتا ہے۔ کب سے میں نے گھر کا کوئی کام نہیں کیا ہے۔ کوئی لڑکی آتی ہے' برتن دھو دیتی ہے۔ کوئی جھاڑو لگا دیتی ہے۔ کوئی کھانا پکا دیتی ہے۔ اتنی محبت' اتنی عقیدت ہوتی ہے ان کی نظروں میں۔ سنو جی' میں نے تو کبھی اتنی عزت اور محبت کا سوچا بھی نہیں



تھا'' زلیخا کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''میں اس قابل تو نہیں تھی جی۔''

''تم بھی نہیں تھیں اور میں بھی نہیں تھا۔'' نوشاد کی آواز رندھ گئی۔ ''لیکن عبداللہ کے ماں باپ کے لئے اللہ کے پاس یہ سب کچھ تھا۔''

''سچ کہتے ہو جی۔ یہ سب عبداللہ کے نام پر ہے۔ اور پتا ہے' میں نے سوچا تھا کہ عبداللہ کے جانے کے بعد اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچوں گی۔ دھیان بٹاؤں گی اپنا۔ ورنہ شاید رو رو کر مر جاؤں۔ مگر یقین کرو' دن بھر عبداللہ کی باتیں سنتی ہوں' اسی کی باتیں کرتی ہوں۔ کبھی رونا نہیں آتا۔ بس' شکر ادا کرتی رہتی ہوں۔ ہر عورت مجھ پر رشک کرتی ہے۔ وہ کہتی ہیں' میں بڑی ہمت والی ہوں کہ اکلوتے بیٹے کو جہاد پر بھیج دیا۔ سنو جی' مجھ میں ہمت تو بالکل نہیں تھی۔ لیکن ان کی باتیں سن سن کر آ گئی ہے۔ اور سنو۔ کچھ لڑکے بھی آتے ہیں۔ کہتے ہیں...... اماں' کچھ منگانا ہو تو بتا دو۔ یہ نہ سمجھنا کہ عبداللہ بھائی چلے گئے تو کوئی محتاج ہو گئی۔ ہم بھی بیٹے ہیں تمہارے۔''

''اللہ کا شکر ہے زلیخا۔ میں مطمئن ہو گیا۔'' نوشاد نے کہا۔ پھر اس نے دکان کا حال کہہ سنایا۔

وہ ان دونوں کے لیے بڑی طمانیت کی رات تھی۔

معمول تھا کہ صبح سویرے نجمہ غزالہ کو لے کر ان کے ہاں آتی تھی۔ نجمہ زلیخا سے بیٹھ کر باتیں کرتی اور غزالہ ناشتہ بنانے میں لگ جاتی۔ وہی نوشاد کے سامنے ناشتہ رکھتی۔

''تایا جی' ناشتہ کر لیجئے۔''

اس روز نجمہ نے زلیخا سے پوچھا۔ ''آپا...... کوئی خط بھی آیا عبداللہ کا؟''

''تمہیں کیا؟ تم نے تو اس سے رشتہ توڑ ہی لیا۔'' زلیخا نے تلخی سے کہا۔

''آپا' اس سے جو رشتہ تھا' وہ تھوڑا ہی ٹوٹا ہے۔'' نجمہ کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

''بس دل میں ایک ضد بیٹھ گئی ہے۔ کون جانے' شیطان نے بٹھا دی ہو۔''

"دل چھوٹا نہ کرو۔" زلیخا نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔ "اس کا خط اب تک نہیں آیا۔ آ جائے گا۔"

وہ دونوں ہی محسوس کرتے تھے کہ زندگی بڑی ہو گئی ہے...... پھیل گئی ہے۔ پہلے ان کی دنیا محدود تھی۔ اب اس کی وسعت ناقابل بیان تھی۔ صرف ان کا حلقہ ہی وسیع نہیں ہوا تھا۔ کاروبار بھی بڑھ گیا تھا۔

ایک ہفتے بعد تنظیم جہاد کا وہ لڑکا آیا' جسے عبداللہ نے نوشاد سے ملوایا تھا اور جسے نوشاد نے پہلی بار عطیہ دیا تھا۔ عبداللہ نے اسے دیکھتے ہی گلے میں ہاتھ ڈالا تو لڑکے نے شرمندگی سے کہا۔ "میں اس کے لیے نہیں آیا ہوں چاچا۔ میں تو یہ پوچھنے آیا تھا کہ آپ کو اور چاچی کو کوئی تکلیف تو نہیں۔ ہم ہر طرح سے حاضر ہیں چاچا۔"

"شکریہ بیٹا۔ اللہ کا فضل ہے۔ اور یہ رکھ لو۔ یہاں سے انشاء اللہ کبھی خالی ہاتھ نہیں جاؤ گے۔ مجھے تو خوشی ہے کہ میں بھی جہاد کر سکتا ہوں۔" نوشاد نے کچھ رقم اس کی طرف بڑھائی۔ "اور ہاں...... عبداللہ کا خط نہیں آیا ابھی تک۔"

"آ جائے گا چاچا۔ تربیت سخت ہوتی ہے۔ وقت نہیں ملتا ہوگا۔"

پھر ایک دن خط آ گیا۔ عبداللہ نے لکھا تھا کہ وہ خیریت سے اور خوش و خرم ہے۔ تربیت جاری ہے۔ اس کے انسٹرکٹر اس سے بہت خوش ہیں۔ بس اسے ان دونوں کی فکر رہتی ہے۔ لیکن فرصت کم ہی ملتی ہے۔

عبداللہ نے خط لکھتے وقت سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وہ اتنے بہت سے لوگوں کو خط لکھ رہا ہے۔ اس نے تو اماں اور ابا کو خط لکھا تھا۔ اور ان ڈائریکٹ نجمہ خالہ اور غزالہ کو' جن کے لیے اس نے بطور خاص سلام لکھا تھا۔ باقی اس نے لکھا تھا...... اور سب لوگوں کو میرا سلام اور چھوٹوں کو درجہ بدرجہ پیار اور دعا۔

وہ خط پوری بستی کا خط بن گیا۔ گھر آنے والی تمام عورتوں نے اسے پڑھا۔ دکان پر نوشاد نے ہر پوچھنے والے کو عبداللہ کا سلام دعا اور پیار دیا۔ کتنے لوگوں نے اس کے



سلام کا جواب دیا' کتنوں نے جواب میں اسے دعا دی اور کتنے دلوں میں اس کا پیار جاگا' یہ عبداللہ کو معلوم ہو جاتا تو اس کا سینہ چھلک اٹھتا۔

اللہ قطرے کو سمندر بنا رہا تھا!

❁......❁......❁

تربیت اگست میں شروع ہوئی تھی۔ ختم ہوتے ہوتے نومبر گزرا اور دسمبر شروع ہو گیا۔ عبداللہ کو پہلی بار پتا چلا کہ سردی کیا ہوتی ہے۔ کراچی میں اسے سردی کبھی لگتی ہی نہیں تھی۔ اب اسے پتا چلا کہ وہاں سردی ہوتی ہی نہیں تھی۔ سردی تو یہ تھی کہ ہاتھ پاؤں ٹھٹھر جاتے تھے۔ گن پر گرفت قائم رکھنا مذاق نہیں تھا۔

تربیت مکمل ہونے پر کمانڈر نے مختصر سا خطاب کیا۔ "میرے بچو' آپ کو مبارک ہو۔ اب آپ عملاً محاذ جنگ پر جا سکتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "ہم نے کوشش کی ہے کہ جو کچھ برسوں میں نہیں سکھایا جا سکتا' آپ لوگوں کو چند ہفتوں میں سکھا دیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ تربیت مکمل ہے۔ نہیں' اس میں کمی ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ آپ کا جذبۂ جہاد اور بعد میں میدانِ جنگ کا عملی تجربہ اس کمی کو پورا کر دے گا۔

"اب آپ لوگ گھر جائیں۔ آپ کے پاس پندرہ دن ہیں۔ اپنے لوگوں کے ساتھ وقت گزاریں۔ نہیں...... میں جانتا ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں' یہ ضروری ہے۔ آپ فوری طور پر محاذ پر نہیں جا سکتے۔ میری تیاری والی بات بھول گئے؟ ان پندرہ دنوں میں اپنے لیے گرم کپڑوں کا' ہر ضروری چیز کا بندوبست کیجیے۔ جو سردی آپ یہاں دیکھ رہے ہیں' محاذ کی سردی اس سے کہیں بڑھ کر ہوگی۔ اللہ آپ کی رہنمائی' آپ کی مدد فرمائے۔"

عبداللہ نے گھر اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ اماں اور ابا کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ خود اس کے لیے بہت بڑی سرپرائز ہوگی وہ دوپہر بارہ بجے کے قریب گھر پہنچا تو دروازے پر ٹھٹھک گیا۔ گھر آوازوں سے بھرا ہوا تھا...... نسوانی

آوازوں سے۔ اور اسے یقین تھا کہ وہ اس کی بہنوں کی آواز میں نہیں ہیں۔ وہ گھبرا گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے بچپن کا وہ دن یاد آ گیا......تو کیا......؟

اندر گھسنے کی اس میں ہمت بھی نہیں تھی اور وہ جھجک بھی رہا تھا۔ اس نے کنڈی بجادی۔

چند لمحے بعد پندرہ سولہ سال کی ایک لڑکی آئی' اس نے دروازہ ذرا سا کھول کر اسے دیکھا۔ ''جی فرمایئے۔ آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

عبداللہ کے لیے وہ ایک بہت پھیلا ہوا لمحہ تھا۔ خوف سے بے حال آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ نظریں نہ اٹھانے والے عبداللہ نے لڑکی کو بہت غور سے دیکھا۔ اور جو کچھ دیکھا' اس نے اس کے ایک اندیشے کو مٹا دیا۔ اندر سے بھی ہنسنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اور دروازے پر آنے والی لڑکی بھی خوش و خرم لگ رہی تھی۔ لیکن یہ اجنبیت......اپنے ہی گھر کے دروازے پر......جی فرمایئے......آپ کو کس سے ملنا ہے۔ اس نے ایک اور خوف جگا دیا۔ کوئی اور تو نہیں آ بسا اس مکان میں۔

اس نے گھبرا کر نجمہ خالہ کے مکان کی طرف دیکھا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ اور گلی سنسان تھی۔ اس نے دروازے پر کھڑی لڑکی کو پھر ایک بار دیکھا۔ وہ اس کے لیے یکسر اجنبی تھی۔ وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس نے پہلے کبھی اسے نہیں دیکھا ہے۔ اور لڑکی کے انداز میں ایسا اعتماد تھا' جیسے وہ اپنے گھر میں کھڑی ہے۔

عبداللہ گڑبڑا گیا۔ ''جی وہ......میں......عبداللہ......''

''عبداللہ بھائی تو جہاد پر گئے ہیں۔'' لڑکی نے کہا۔ ''آپ کو نہیں پتا۔ کسی دوسرے شہر سے آئے ہیں کیا؟''

عبداللہ حیران تھا۔ لڑکی اسے پہچانتی نہیں تھی۔ اور کس اپنائیت سے عبداللہ بھائی کا تذکرہ کر رہی تھی۔



''کون ہے بیٹی روبینہ؟'' اندر سے اماں کی جانی پہچانی آواز سنائی دی تو عبداللہ کی جان میں جان آئی۔ اس نے پکارا۔ ''یہ میں ہوں اماں۔''

اندر زلیخا یہ آواز سن کر بے تاب ہو گئی۔ لیکن یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی اس نے کہا......ارے یہ تو میرے عبداللہ کی آواز ہے......اور دروازے کی طرف لپکی۔ عبداللہ کی صورت دیکھتے ہی وہ اس کے گلے میں جھول گئی۔ ''میرے بچے......تو آ گیا۔ شکر ہے اللہ کا۔'' وہ اس کے چہرے کو دیوانہ وار چوم رہی تھی۔ اسے یہ ہوش بھی نہیں تھا کہ وہ گلی میں کھڑی ہے۔ عبداللہ ہی اسے گھر میں لے گیا۔

گھر میں ہنگامہ ہو گیا۔ عبداللہ آ گیا......عبداللہ بھائی آ گئے۔ جس انداز میں یہ صدا ابھر رہی تھی' عبداللہ نے جان لیا کہ ذرا دیر میں پوری بستی کو پتا چل جائے گا۔ اور ابا خود آ گئے تو یہ ان کی توہین ہو گی۔ اس نے اماں کو ایک طرف ہٹایا۔ ''اماں......میں ابا سے مل آؤں۔''

✿......✿......✿

وہ پورا دن ان عام لوگوں کا تھا' جنہوں نے اس کے ماں باپ کو تنہا نہیں رہنے دیا تھا۔ عبداللہ حیران تھا کہ اس کے غیاب میں کتنی بے لوث اور بے پایاں محبتیں اس کی ہو گئی تھیں۔ پورے دن وہ ان لوگوں میں گھرا رہا۔ رات کو اماں اور ابا میسر آئے۔ آدھی رات باتوں میں گزر گئی۔ چار ساڑھے چار مہینے کی جدائی کے بعد وہ ملے تھے۔ نیند آ ہی نہیں رہی تھی۔

صبح ہو گئی۔ انہوں نے فجر پڑھی۔ اب عبداللہ کو نیند آ رہی تھی۔ ''کیسے سوئے گا یہ؟'' زلیخا نے تشویش سے کہا۔ ''ابھی اس کے پرستاروں کا تانتا بندھ جائے گا۔ آر جار لگی رہے گی۔''

نوشاد دکان پر چلا گیا۔ زلیخا عبداللہ کے سرہانے پہرے دار بنی بیٹھی رہی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ سب سے معذرت کر لے گی۔ وہ دستکوں کی منتظر تھی۔ مگر گلی میں تو اس

روز کوئی چاپ بھی نہیں تھی۔ وہ نیند سے لڑتے لڑتے وہیں سمٹ کر سوگئی۔

وہ اسی وقت اٹھی' جب عبداللہ جاگا۔ عبداللہ نے گھڑی دیکھیں اور چونک کر بولا۔

''ارے......ظہر کا وقت ہوگیا۔''

عبداللہ وضو کر کے مسجد چلا گیا۔ زلیخا کو اب یہ فکر تھی کہ کھانے کا بندوبست کرے۔ ابھی وہ ارادہ ہی کر رہی تھی کہ نجمہ کھانا لے کر آ گئی۔ ''میں نے سوچا' آپ لوگ رات بھر جاگے ہوں گے۔ پھر بھوک لگے گی۔ غزالہ نے صبح اٹھتے ہی کھانے کی تیاری شروع کر دی تھی۔''

عبداللہ اور نوشاد نماز پڑھ کر ساتھ ہی گھر آئے۔ تینوں نے ساتھ کھانا کھایا۔ زلیخا نجمہ کی عقل مندی کے گن گاتی رہی۔ ''اس وقت تو بہت بڑا احسان کیا ہے نجمہ نے۔''

''اور آج وہ لوگ نہیں آئے' جو روز آتے تھے؟'' نوشاد نے پوچھا۔

''نہیں۔ کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا تو میری آنکھ ضرور کھلتی۔''

''اب سوچو کہ لوگ کتنے سمجھ دار' کتنے اچھے ہیں۔'' نوشاد نے کہا۔ ''تمہاری تنہائی دور کرنے آتے تھے۔ اب انہوں نے جان لیا کہ تمہیں تنہائی کی ضرورت ہے۔''

زلیخا کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''سچ کہتے ہو۔''

اور یہ سچ ہی تھا۔ تمام آنے والے اس روز بھی آئے۔ مگر صرف دو منٹ کے لیے۔ اور سبھی کچھ نہ کچھ لے کر آئے۔ یہ گھر میں کھیر بنی تھی۔ میں عبداللہ کے لیے لے آئی۔ ابا ٹھٹھہ سے ربڑی لائے تھے۔ امی نے کہا' عبداللہ بھائی کے لیے لے جاؤ۔ یہ کوفتے خاص طور پر بنائے ہیں عبداللہ بھائی کے لیے۔

اور زلیخا ہر ایک سے کہتی......آپا' بیٹھو تو۔ آؤ نا' بیٹی۔ اور یہی جواب ملتا۔ نہیں باجی' نہیں خالہ' گھر میں بہت کام ہے۔ پھر آؤں گی۔

زلیخا سوچتی' یہ عام لوگ ہیں۔ اتنی وضع داری ان میں کہاں سے آ گئی۔ یہ مخل ہونے سے احتراز کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان کی محبت اور عقیدت کا تقاضہ تو یہی ہے کہ یہ ہر وقت عبداللہ کو دیکھتے رہیں۔ اس سے باتیں کریں۔ لیکن نہیں' محبت اور عقیدت خود وضع داری سکھاتی ہے۔



عبداللہ نے باپ سے کہا۔ ''ابا......اب آپ سو جائیں۔ دکان میں سنبھال لوں گا۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔''

''ضرورت تو ہے ابا۔ آپ سوئے ہی نہیں ہیں۔ اور میں نیند پوری کر چکا ہوں۔''

عبداللہ دکان پر بیٹھا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ہر شخص اس کو جانتا ہے۔ اور ان میں بیشتر ایسے تھے' جن سے وہ واقف نہیں تھا۔ اس کا دل بڑا ہوگیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس معاشرے میں نیکی کی اس طرح پزیرائی بھی ہوسکتی ہے۔

❀ ............ ❀ ............ ❀

تمام بہنیں عبداللہ سے ملنے آئیں۔ رشتے دار اور ملنے والے بھی آتے رہے۔ ادھر زلیخا کے پاس ہر روز آنے والیاں کچھ نہ کچھ لے کر آتی تھیں۔ سب کو ہر بات کا علم تھا۔ سب جانتے تھے کہ اب عبداللہ محاذ پر جانے والا ہے۔

ایک دن میں عبداللہ نے خریداری مکمل کر لی۔ ضرورت کی ہر چیز خرید لی۔

زلیخا کی تنہائی دور کرنے کے لیے آنے والوں نے پہلے دن کے بعد کبھی اپنا حق نہیں جتایا۔ ہاں' آخری دن سب کا تھا۔ سب جانتے تھے کہ اگلے روز عبداللہ چلا جائے گا۔ جدائی کی رات عبداللہ نے زلیخا سے کہا۔ ''اماں......کل مجھے رخصت کرتے وقت رونا نہیں۔''

زلیخا تڑپ گئی۔ ''مجھے تو ابھی سے رونا آ رہا ہے۔ یہ میرے بس کی بات نہیں۔''

''تربیتی کیمپ میں ایک انسٹرکٹر نے ایک واقعہ سنایا تھا ہمیں۔ آپ بھی سن لیں۔'' عبداللہ نے کہا۔ ''ایک لڑکا تھا' جو جہاد کے لیے نکلا تھا۔ اس کی ماں اسے رخصت کرتے وقت اتنا روئی کہ بے ہوش ہوگئی۔ لڑکا ماں سے بہت محبت کرتا تھا۔ اللہ

نے جذبۂ جہاد دل میں نہ ڈالا ہوتا تو وہ ماں کو اس عالم میں چھوڑ کر کبھی نہ جاتا۔ وہ چلا تو گیا۔ لیکن روتی ہوئی ماں کی تصویر اس کی آنکھوں میں بس گئی۔ اس کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا اسے۔

''پھر پتا ہے' کیا ہوا اماں۔ وہ محاذ تک پہنچ ہی نہیں سکا۔ دشمن کا سامنا کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ محاذ پر جاتے ہوئے وہ بے دھیانی میں پہاڑ پر چڑھ رہا تھا کہ پاؤں پھسلا اور وہ کھائی میں گر کر ختم ہو گیا۔ اس کی ماں عمر بھر اس کے لیے روتی رہی۔ پھر ایک دن اس نے خواب میں دیکھا کہ بیٹا اس سے کہہ رہا ہے...... اماں...... دشمن سے پہلے ہی تمہارے آنسوؤں نے مجھے مار دیا۔ مجھے شہادت بھی نہیں ملی اماں۔ تم نے مجھے محروم کر دیا۔

''کہتے ہیں' اس کے بعد وہ ماں کبھی نہیں روئی۔ وہ پاگل ہو گئی تھی۔''

زلیخا کا پورا جسم تھرتھرا رہا تھا۔ ''انشاء اللہ تیرے ساتھ ایسا نہیں ہو گا بیٹے۔''

''شکریہ اماں۔''

اور اگلے روز لگتا تھا کہ بستی میں کوئی بہت بڑی تقریب ہو رہی ہے۔ تقریباً سبھی لوگ عبداللہ کو رخصت کرنے آئے تھے۔ عورتوں کے علاوہ مردوں کا بڑا ہجوم تھا۔ عبداللہ ان میں ان لڑکوں کو دیکھ کر حیران ہوا' جنہوں نے کبھی اپیا کو چھیڑا تھا اور اس کے ہاتھوں پٹے تھے۔

وہ چاروں عبداللہ سے بڑے تپاک سے گلے ملے۔ ''تم ہمارے چھوٹے بھائی ہو عبداللہ۔ ہمیں معاف کر دینا۔''

''معاف کرنا کیسا۔ آپ لوگوں کا تو احسان ہے مجھ پر۔'' عبداللہ نے بڑے خلوص سے کہا۔ ''اللہ کی عنایت کے بعد آج میں جو کچھ بھی ہوں' آپ ہی کی وجہ سے ہوں۔''

''ہم صرف تمہیں رخصت کرنے نہیں آئے۔ یہ وعدہ بھی کر رہے ہیں کہ انشاء اللہ محاذ پر ملیں گے۔ ہم نے بھی نام لکھوا دیے ہیں۔''



عبداللہ نے ایک بار اور انہیں گلے سے لگا لیا۔

عبداللہ کو رخصت کرنے والے بے شمار تھے۔ اور کسی آنکھ میں آنسو نہیں تھے۔ اس وجہ زلیخا کی خشک آنکھیں تھیں۔ رونے کا اس سے زیادہ حق تو کسی کو بھی نہیں تھا۔

✿............✿............✿

عبداللہ جوش اور جذبے سے بھرا ہوا افغانستان پہنچا تھا۔ لیکن وہاں اس نے جو کچھ ا اس نے تو اسے چھلکا ہی دیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ جہاد کتنی بڑی چیز ہے۔ کیسی نعمت ۔ اور ملت کا تصور پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا۔ وہ جہاد اقبال کے...... تو اے شرمندہ ا اچھل کر بے کراں ہو جا...... کی عملی تفسیر تھا۔ یہ شعر اس نے پڑھا تھا اور اسے یاد بھی یکن سمجھ میں اب آیا۔

وہ مسلمانوں کی جنگ تھی...... اللہ کے نام لیوا' کلمہ گو مسلمانوں کی جنگ! مجاہدین بہت خوب صورت اور رنگا رنگ گل دستے کی طرح تھے۔ دنیا کی ہر زبان بولنے والا ن وہاں موجود تھا۔ رنگ' نسل' قوم' ہر چیز' ہر فرق بھلا دیا گیا تھا۔ وہاں عرب بھی ایرانی بھی اور ہندوستانی بھی۔ مشرق بعید کے مسلمان بھی وہاں موجود تھے اور ، اور امریکا کے بھی۔ اس کے علاوہ نومسلموں کی بھی بڑی تعداد تھی۔

عبداللہ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں مقبول ہو گیا۔ اس کی ساکھ بن گئی۔ وہ کبھی کسی کام کو ں کرتا تھا۔ خواہ وہ کسی کا ذاتی کام ہو۔ اور ہر خطرناک مہم پر وہ کوشش کرتا تھا کہ ے آگے ہو۔ وہ عملاً موت کے منہ میں کودنے کو تیار رہتا تھا۔

زندگی بہت سخت تھی۔ موسم اتنا سخت تھا کہ عبداللہ نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ سردی ہ رگوں میں خون جم جائے۔ اور وہاں بے سروسامانی کا عالم تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا دن میں صرف ایک بار تھوڑا سا گوشت اور ڈبل روٹی کے دو سلائس کھانے کے ملتے پانی کا بھی زیادہ تر راشن ہی رہتا تھا۔ لیکن اتنی سردی میں پیاس بھی کم ہی لگتی ہے۔ اتنی سختی میں بھی گل دستے کے تمام پھول مسکراتے ہی رہتے تھے۔ جذبۂ جہاد سے

بھرے ہوئے وہ سادہ دل مجاہد اپنے گھروں کو اپنے لوگوں کو بھول کر صرف اللہ کے نام پر جسم پر ایک کمبل لپیٹے' کندھے پر کبھی کوئی راکٹ لانچر' کبھی کوئی گن رکھے ایک ایسی جنگ لڑ رہے تھے' جس کے انجام کی نہ انہیں خبر تھی نہ پروا۔ انہیں تو یہ احساس بھی نہیں تھا کہ اس بے سروسامانی میں انہوں نے دنیا کی دوسری بڑی ایٹمی طاقت کو للکارا ہے۔ کبھی وہ یہ سوچتے اور اس پر بات بھی کرتے تو خوف کے بغیر...... وہ کہتے ...... ہم اللہ کے سپاہی ہیں اور وہ ہمارے ساتھ ہے۔ ہمیں اس سے کیا غرض کہ مقابل کون ہے...... اور کتنا طاقت ور ہے۔ ہم بس اتنا جانتے ہیں کہ وہ اللہ کا دشمن ہے۔ اور فتح و شکست تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

عبداللہ کو پہلا زخم لگا تو اسے جہاد پر آئے صرف ایک ماہ ہوا تھا اس کی ٹولی نے سامانِ رسد لے جانے والے ایک کارواں کو للکارا تھا۔ روسیوں کو یہ جنگ لڑتے ہوئے کئی برس ہو گئے تھے۔ اور ان برسوں میں انہوں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ انہوں نے جتنی جانیں گنوائی تھیں' ان میں سے بیشتر انہی سے چھینے گئے ہتھیاروں سے مارے گئے تھے۔ پہاڑی علاقوں میں مجاہدین چپکے سے کہیں نمودار ہوتے اور اسلحہ اور خوراک چھین لیتے۔ پھر کسی مورچے پر وہ اسی اسلحے سے ان کی لاشیں بچھا دیتے۔ سو اب ہر کارواں کے ساتھ محافظوں کی بھاری تعداد بھی ہوتی تھی۔

لیکن مجاہدین کو اس کی پروا نہیں تھی۔ کارواں پر حملہ کرنا کئی زاویوں سے منفعت بخش تھا۔ وہ اسلحہ انہیں ملتا' جو انہی کے خلاف استعمال ہونا تھا۔ یعنی ایک طرف تو روسی اسلحے سے محروم ہوتے۔ دوسرے وہی اسلحہ روسیوں کے خلاف استعمال ہوتا۔ پھر کارواں سے خوراک کا ذخیرہ بھی ملتا جس کی قلت سے وہ ہمیشہ ہی دوچار رہتے تھے۔ یعنی آم کے آم' گٹھلیوں کے دام والا معاملہ تھا۔

وہ لوگ بلندی پر تھے۔ انہوں نے کارواں پر ہلکے اسلحے سے فائرنگ کی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ روسیوں کا اسلحہ تباہ ہو۔ فوراً ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ کارواں کے محافظ



دستے پہاڑوں میں دو جانب چھپے ہوئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بہت تیزی سے نئی صف بندی کر کے ان دونوں سمتوں میں فائرنگ کرتے ہوئے پیش قدمی کی۔

دونوں دستوں سے نمٹ کر وہ کارواں کی طرف لپکے۔ اسی لمحے تیسری سمت سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ مجاہدین اب کھلے میں تھے۔ انہوں نے اب بھی خود کار انداز میں خود کو دو گروہوں میں تقسیم کیا۔ ایک گروہ نیچے کارواں کی طرف جھپٹتا رہا۔ دوسرے گروہ نے اس طرف ہلّہ بول دیا' جس طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ محافظ دستے والے خود اعتمادی میں باہر نکل آئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اب ایک مجاہد بھی نہیں بچ سکے گا۔ انہیں یہ توقع بھی نہیں تھی کہ مجاہد گھبرانے کے بجائے الٹا ان پر جھپٹ پڑیں گے۔ وہ گھبراہٹ میں اندھا دھند فائرنگ کرتے رہے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ مجاہد قریب آ گئے ہیں تو انہوں نے گھبرا کر بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن ان میں سے ایک بھی نہیں بچ سکا۔

جنگ کا ہنگامہ فرو ہوا اور مالِ غنیمت سمیٹنے سے فرصت ملی تو انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ''ارے...... عبداللہ' یہ خون کیسا ہے؟'' ایک مجاہد نے کہا۔

''کہاں ہے خون؟'' عبداللہ نے کہا۔

خون نہ صرف تھا۔ بلکہ مسلسل بہہ رہا تھا۔ گولی عبداللہ کے سینے پر گوشت کو پھاڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اندر گھستی تو دل تک ہی پہنچتی۔ ساتھیوں نے زخم دھویا' پٹی باندھی۔ کمانڈر نے کہا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہیں پتا نہیں چلا ہو۔''

''خدا کی قسم' مجھے احساس بھی نہیں ہوا۔'' عبداللہ نے پوری سچائی سے کہا۔ ''اور ویسے بھی معمولی زخم ہے۔''

''کیا بات کرتے ہو۔'' ایک ساتھی نے بگڑ کر کہا۔ ''گہرا زخم ہے اب تمہیں چند روز آرام کرنا ہو گا۔''

''میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔''

اس دن عبداللہ دو باتوں پر غور کرتا رہا۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے تین سو سے زیادہ

روسی ہلاک کیے تھے جبکہ چار مجاہد شہید اور گیارہ زخمی ہوئے تھے۔ عبداللہ ٹکڑی میں تھا' جو تیسری سمت جھپٹا تھا۔ اسے یاد تھا کہ گولیوں کی بارش ہو رہی تھی اور مجاہدین کے سامنے کوئی آڑ نہیں تھی۔ ایسے میں صرف چار مجاہدین کا شہید اور گیارہ کا زخمی ہونا ایک معجزہ ہی تھا۔ ان میں سے کوئی بچ ہی نہیں سکتا تھا۔ گویا یہ تھی اللہ کی تائید اور نصرت جو اُن کے ساتھ تھی۔

دوسرے اتنے گہرے زخم کا اسے احساس ہی نہیں ہوا۔ اب بھی تکلیف اتنی نہیں تھی۔ یعنی یہ ثابت ہو گیا کہ شہید کو شہادت کے وقت چیونٹی کے کاٹنے جتنی تکلیف بھی نہیں ہوتی ہوگی۔

ڈر تو اس کا پہلے ہی نکل چکا تھا۔ مگر اس واقعے نے ایمان پختہ کر دیا۔ اللہ کی راہ میں کوئی بڑی سے بڑی تکلیف بھی اذیت نہیں دیتی۔ اور اذیت ہو تو سمجھ لو کہ اجر بھی بے حساب ملے گا۔

❁.........❁.........❁

ریہرسل اور حقیقت کا فرق اب کھل رہا تھا۔ پچھلی بار بیٹا تربیت پر گیا تھا اور اس بار محاذ پر۔ پچھلی بار یہ معلوم تھا کہ تربیت مکمل ہونے پر وہ واپس آئے گا۔ اب کے کچھ پتا نہیں تھا۔

سو اس بار وقت زلیخا کے لیے سخت ہو گیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے ایک ہوک سی اٹھتی۔ بیٹے کا خیال آتا۔ وہ دل تھام لیتی۔ نجانے وہ کس حال میں ہوگا۔ اس سے آگے وہ سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ تصور تو آدمی کے گمانِ علم کی انتہا کا نام ہے۔
اللہ کی رحمت تھی کہ پچھلی بار وہ گیا تو اس کے لیے نماز کا درِ عافیت کھل گیا۔ بیٹے کی تربیت کے دوران اللہ نے اس کی تربیت بھی شروع کر دی تھی۔ وہ سوچتی کہ اگر نماز اسے نہ ملی ہوتی تو اس بار وہ پاگل ہو گئی ہوتی۔ وقت کٹتا ہی نہیں۔ جتنی دیر وہ نماز پڑھتی' اسے کوئی فکر' کوئی پریشانی نہیں رہتی' اس احساس کے بعد اس کی نماز میں خشوع و خضوع



آتا گیا اور نمازیں طویل ہوتی گئیں۔ ذرا دل گھبراتا تو وہ نوافل کے لیے کھڑی ہو جاتی۔

مگر اللہ کی ایک خاص عنایت کا زلیخا کو پتا نہیں چلا۔ کسی کو بھی پتا نہیں چلتا۔ اللہ بے خبری کے ذریعے بھی اپنے بندوں کو اذیت سے بچاتا ہے۔ وہ کتنی کوشش کرتی' میدان جنگ کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ تصور میں اسے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ وہ تصور میں میدان جنگ کو دیکھتی اور پریشان ہو جاتی۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ میدان جنگ اس کے تصور سے کروڑوں گنا خوفناک ہے۔ وہ اس سردی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی' جس میں مجاہدین لڑ رہے تھے۔ وہ ان کی بھوک پیاس کا بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ یہ سب کچھ' جنگ کا سچ مچ کا منظر وہ صرف چند سیکنڈ کے لیے بھی دیکھ لیتی تو شاید دہشت سے مر ہی جاتی۔

تنہائی اس بار بھی مسئلہ نہیں تھی۔ لیکن اس بار پہلے جیسا ہجوم بھی نہیں تھا۔ باقاعدگی سے آنے والی صرف دو لڑکیاں تھیں' جنہوں نے وقت بانٹ لیا تھا۔ ایک دوپہر کو کھانا پکا جاتی اور دوسری رات کو۔ ناشتہ غزالہ ہی کی ذمے داری تھا۔ اسکے علاوہ عورتیں اور لڑکیاں آتیں...... مگر اکا دکا۔ وہ پہلے جیسی بات نہیں تھی۔ پہلے تو گھر ہر وقت بھرا رہتا تھا۔

زلیخا کے دل میں شکایت پیدا ہوئی کہ اس بار سب نے اسے چھوڑ دیا۔ مگر ایک لڑکی سے بات کی تو اس کی شکایت دور ہو گئی۔ لوگوں کی کمی معقول وجہ تھی کہ چراغ سے چراغ جل رہا تھا۔ جہاد کی خوشبو پھیل رہی تھی۔ بستی سے جہاد کے لئے جانے والوں کی تعداد دس سے اوپر ہو گئی تھی۔ ابھی سب تربیت کے مرحلے میں تھے۔ تو لوگ ان کے والدین کی دل جوئی کے لئے بٹ گئے تھے۔

اس احساس سے زلیخا کو اور طاقت ملی۔ اب وہ اکیلی نہیں تھی۔ دوسری مائیں بھی اس کے ساتھ تھیں۔ اور اسے فخر کا احساس بھی ہوا۔ وہ اس بستی کی پہلی ماں تھی' جس کا بیٹا

جہاد پر گیا تھا۔

جو دو لڑکیاں باقاعدگی سے آتی تھیں۔ وہ بھائی کی نعمت سے محروم تھیں اور انھوں نے عبداللہ کو بھائی مان لیا تھا۔ اس رشتے سے زلیخا ان کے لئے ماں تھی۔ اس کی ضرورتوں کا' اس کی تنہائی کا خیال رکھنا اُن کی ذمّے داری تھی۔

ایک دن ان میں سے ایک نے کہا۔ ''اماں...... آپ گھر سے نکلا بھی کریں''۔

''کیا مطلب؟ کہاں جاؤں میں''؟ زلیخا نے حیرانی سے کہا۔

''ان لڑکوں کے گھر چلا کریں تھوڑی دیر کے لئے' جو جہاد کی تربیت کے لئے گئے ہوئے ہیں''۔ صفیہ نے کہا۔ ''ان کی ماؤں کا بہت برا حال ہے۔ آپ کو دیکھیں گی تو ان کے دل کو سہارا ہوگا''۔

یہ بات زلیخا کے دل کو لگی۔ اس نے نوشاد سے اجازت بھی لے لی۔

اس کام میں بھی اسے بڑی طمانیت ملی۔ وہ مائیں جب اسے دیکھتیں تو سوچتیں کہ ان کے بیٹے تو تربیت پر گئے ہیں۔ جبکہ یہ عورت جو انھیں دلاسہ دینے آئی ہے' اس کا بیٹا تو محاذ پر جنگ لڑ رہا ہے۔ اور وہ شرمندہ ہو جاتیں۔ وہ اس کے سامنے ایسے بچھ جاتیں' جیسے اس کی عظمت کو سلام کر رہی ہوں۔

اور فائدہ دوطرفہ تھا۔ زلیخا سوچتی کہ وہ عام سی جاہل عورت' جسے کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا' جس کا دنیا میں ہونا نہ ہونا چند افراد کو چھوڑ کر سب کے لئے ایک برابر تھا' آج اسے کتنی عزت مل رہی ہے۔ صرف عبداللہ کی وجہ سے۔ بلکہ نہیں' سبب عبداللہ ہے۔ دَین اللہ کی ہے۔

باہر نکلنے سے دکھ کم ہوگیا۔ پریشانی کم ہوگئی۔ ایک فائدہ اور ہوا۔ نماز کے ساتھ ذکر کا سلسلہ بھی قائم ہونے لگا۔ کبھی کوئی عورت کوئی وظیفہ بتا دیتی...... یہ پڑھ لیا کرو بہن۔ اور قرآن بھی وہ باقاعدگی سے پڑھنے لگی۔

اس کا فائدہ یہ اطمینان تھا کہ اس کا بیٹا اللہ کی امان میں ہے۔ اس کا خوف کم



ہوگیا۔

نوشاد کی دکان پر البتہ وہی ماحول تھا۔ بلکہ نوشاد کا احترام اور بڑھ گیا تھا۔ لوگوں کے نزدیک وہ قابلِ فخر باپ تھا۔ جس نے سات بیٹیوں کے بعد ملنے والے اکلوتے بیٹے کو اللہ کی راہ میں لڑنے کے لئے بھیج دیا تھا۔ جو آتا' پہلے عبداللہ کو پوچھتا' نوشاد کا حوصلہ بندھاتا' پھر مطلب کی بات کرتا۔ تنظیم جہاد والا لڑکا ہفتے میں ایک بار آرہا تھا۔

''چاچا...... کوئی مسئلہ ہو تو بلا تکلف کہہ دینا۔ عبداللہ کے ماں باپ ہم سب کے ماں باپ ہیں''۔

نوشاد ہمیشہ اسے نہ کچھ دیتا تھا۔ مسئلہ کوئی تھا نہیں۔

تین ماہ ہوگئے تو ایک دن نوشاد نے اس لڑکے سے کہا۔ ''بیٹے...... اس بار کوئی خط نہیں آیا عبداللہ کا''۔

''چاچا...... محاذِ جنگ پر خط لکھنے کی مہلت کم ہی ملتی ہے۔ بڑی مشکل سے تھکن اتارنے اور آرام کرنے کا وقت ملتا ہے۔ اور پھر وہاں تو کاغذ قلم کا بھی مسئلہ ہے۔ اور چاچا' کوئی خط لکھ بھی لے تو اس کا پہنچنا بھی مسئلہ۔ وہاں کوئی ڈاک خانہ' کوئی لیٹر باکس تو ہے نہیں کہ خط ڈال دیا۔ کوئی اِدھر آنے والا ملے تو اسے خط دیں''۔

نوشاد کا دل گھبرانے لگا۔ ''تب تو یہ بہت مشکل ہے''۔

''ہاں چاچا' بہلانا بے کار سی بات ہے۔ خط کم ہی آتے ہیں''۔

اب نوشاد جو بات کرنا چاہتا تھا' وہ منہ سے نکالنا بھی آسان نہیں تھا۔ ''بیٹا...... ایک بات تو بتاؤ۔ مجھے...... ہمیں یہ کیسے پتا چلے گا کہ میرا عبداللہ خیریت سے ہے''۔

اصل میں وہ یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس کے بیٹے کو کچھ ہوگیا تو اسے کیسے پتا چلے گا۔

''چاچا...... یہ تو ماں باپ کے دل کو پتا ہوتا ہے۔ تم مطمئن ہو تو سمجھ لو کہ عبداللہ خیریت سے ہے''۔

''اور دل گھبرائے تو''؟

"تو اسے شیطانی وسوسہ سمجھو۔ لاحول پڑھا کرو۔ دل مطمئن ہو جائے گا"۔

"تو سمجھ لو کہ......" لڑکے نے بات نامکمل چھوڑ دی" اور دل پھر بھی مطمئن نہ ہو تو"؟ "......اللہ کا شکر ادا کرو۔ ویسے چاچا' ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ ایسی خبر ہر حال میں پہنچا دی جائے"۔

نوشاد بس یہی سننا چاہتا تھا۔

نوشاد کو زلیخا کے ٹھہراؤ پر حیرت ہوتی تھی۔ اور وہ بدل گئی تھی۔ بہت اچھی ہو گئی تھی۔ نماز وہ ایسے پڑھتی کہ ہوش ہی نہ رہتا۔ رات کو کبھی گھبراتی تو اٹھ بیٹھتی' وضو کرتی اور نفل پڑھنے کھڑی ہو جاتی۔ بلکہ ایک دن تو پتا چلا کہ وہ باقاعدگی سے تہجد پڑھتی ہے۔

نوشاد کو حیرت تھی کہ زلیخا کو عبداللہ کے خط کا خیال کیوں نہیں آیا۔ اسے اس بات پر بھی حیرت ہوتی تھی کہ وہ اس سے دنیا جہان کی باتیں کرتی ہے۔ لیکن عبداللہ کا نام بھی زبان پر نہیں لاتی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ زلیخا ڈرتی ہے۔

مگر ایک دن زلیخا نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ "عبداللہ کا کوئی خط نہیں آیا"؟

"نہیں"۔

"کہیں تم مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے ہو"؟ زلیخا نے اسے بہت غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

نوشاد سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے اور کیا کہنے سے بچ رہی ہے۔ "چھپانے کو کیا ہے"۔ اس نے زلیخا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "تنظیم والے لڑکے سے پوچھا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ محاذ پر اتنی فرصت کم ہی ملتی ہے"۔

مگر بلی تھیلے سے باہر آ گئی تھی۔ ڈر واضح ہو گیا تھا۔ عبداللہ کے خط کی زلیخا کے لئے بہت اہمیت تھی۔ اب وہ اہمیت کھل کر سامنے آ گئی تھی تو اس کے اعصاب پر خط سوار ہو گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے زلیخا کی نیند اڑنے' اچٹنے لگی۔ وہ گھبرا کر اٹھ جاتی۔ چپکے چپکے رونے لگتی۔ نوشاد پوچھتا تو وہ کہتی...... خط کیوں نہیں آیا میرے بچے کا۔



نوشاد کو حیرت ہوتی تھی۔ زلیخا کی نمازیں طویل ہوتی جا رہی تھیں اور دعائیں مختصر۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اسے' اس کے دل کو سکون نہیں ملتا تھا۔ شاید اسی لئے اسے خوف سے نجات نہیں ملتی تھی۔

ایک دن اس نے زلیخا سے یہ بات پوچھ ہی لی۔

"کیا مانگوں اللہ سے۔ سب کچھ تو دے رکھا ہے اس نے"۔ زلیخا نے آہ بھر کے کہا۔

"پاگل ہو تم تو۔ دنیا کے جو بادشاہ ہیں' جن کے پاس دنیا کی ہر نعمت موجود ہے' وہ بھی اللہ سے مانگتے رہتے ہیں"۔ نوشاد نے جھنجلا کر کہا۔ "ذرا سوچو تو۔ کسی کے پاس بھی سب کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ صرف اللہ ہے' جس کے پاس سب کچھ ہے۔ جن کے پاس سب کچھ ہے' وہ دل کا سکون' دین دنیا کی عافیت اور آخرت کی خیر مانگتے ہیں اللہ سے"۔

زلیخا چند لمحے سوچتی رہی۔ وہ بہت اداس نظر آ رہی تھی۔ "سچ تو یہ ہے کہ میرے پاس بہت کچھ نہیں ہے۔ مگر میں اللہ سے نہیں مانگتی۔ اس لئے کہ ہر چیز سے بڑھ کر جو مجھے چاہیے' وہ میں مانگ نہیں سکتی۔ پھر کیا کروں کچھ مانگ کر"۔

نوشاد گھبرا گیا۔ "خیر کی شکل میں ایسا کچھ نہیں جو آدمی اللہ سے نہ مانگ سکے۔ تم بتاؤ تو تم کیا چاہتی ہو"۔

"تم جانتے ہو"۔ زلیخا کے لہجے میں شکایت تھی۔ "میں بس یہ چاہتی ہوں کہ میرا بیٹا عبداللہ ابھی' اسی وقت صحیح سلامت واپس آ جائے"۔

"تو یہ دعا تم کرتی کیوں نہیں؟"

"عبداللہ کہتا تھا کہ شہادت سے بڑھ کر عزت کی کوئی چیز نہیں۔ تو مجھے اپنے بیٹے کے لئے بہترین چیز ہی مانگنی چاہیے۔ اب میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ میں اس کے لئے شہادت کی دعا کروں۔ اس لئے میں کوئی دعا ہی نہیں کرتی"۔

نوشاد سوچ میں پڑ گیا کہ ان پڑھ بیوی کو کیسے سمجھائے۔ بہت سوچ کر اس نے جواب ترتیب دیا۔ ''دیکھ' شہادت کی دعا تو کرتے بھی نہیں۔ غازی کا رتبہ بھی بڑا عزت والا ہے۔ شہادت سے بس ذرا ہی کم۔ تو تم اللہ سے دعا کر سکتی ہو کہ وہ عبداللہ کی حفاظت فرمائے۔ اسے کامیابی اور فتح عطا فرمائے۔ اسے شجاعت اور کافروں پر غلبہ عطا فرمائے۔ اسے فتح کے بعد خیر سے واپس لائے۔''

''یہ دعا کر سکتی ہوں میں۔'' زلیخا کے لہجے میں حیرت اور بے یقینی تھی۔ ''عبداللہ کہتا تھا' جو شہادت سے ڈرے' وہ اللہ کو خفا کرتا ہے۔ کیونکہ یہ کفرانِ نعمت ہے۔ میں تو اس ڈر سے دعا کرتی ہی نہیں۔ اب اس کی شہادت کی دعا کو تو دل نہیں مانتا میرا۔''

''دیکھو زلیخا' جہاد آدمی پر فرض ہے۔ جی جان سے لڑنا' زندگی کو اللہ کی امانت سمجھنا اور کافروں کو قتل کرنا جہاد ہے۔ اب یہ اللہ کی مرضی کہ وہ کسی کو شہادت کا مرتبہ عطا فرمائے۔ عبداللہ کو جہاد کرنا ہے اور ہمیں اس کی کامیابی کی دعا کرنی ہے۔ اسی میں عبداللہ کی عافیت ہے۔''

''زلیخا کھل اٹھی۔ ''تم یہی دعا کرتے ہو؟''

''تو اور کیا۔ میں تو یہی دعا کروں گا کہ میرا بیٹا غازی بن کر واپس آئے۔ یہ تو فطری دعا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ اے اللہ۔ میرے عبداللہ کو شہادت سے بچائے رکھنا۔ میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اے میرے رب' میرے بیٹے کے دل کو خوف سے' اس کے پیروں کو فرار سے' پسپائی سے محفوظ رکھنا۔ اسے کافروں کے لئے اپنا قہر بنا دینا۔ مسلمانوں کو فتح عطا فرمانا اور میرے مجاہد بیٹے کو میرے اور زلیخا کے لئے واپس لانا۔ تاکہ وہ ہمیں خوشیاں دے سکے۔ ہماری نسل کو آگے بڑھا سکے۔''

زلیخا خوش ہو گئی۔ ''خوامخواہ اتنے دن ضائع کر دیے میں نے۔'' اس نے کہا۔

اور واقعی' زلیخا کے دل و دماغ پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ اس کا تصور ہی غلط تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ بیٹے کی زندگی کے لئے دعا کرنا غلط ہوگا۔ اسے شہادت کی دعا کرنی



چاہیے۔ لیکن اس کے لئے اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ اور وہ نادم بھی ہوتی تھی۔ اس بات نے اس کا مورال تباہ کر دیا تھا۔ اب نوشاد نے بتایا کہ اس وقت تو اس کے بیٹے کو ہمیشہ سے زیادہ دعاؤں کی ضرورت ہے۔

اب وہ خوش رہنے لگی۔ اس کی دعائیں بھی طویل ہو گئیں۔ وہ عبداللہ کے لئے دعا کرتے کرتے تمام مجاہدین کے لئے دعائیں کرنے لگی۔ اور ایک دن اس کے دل نے اسے بتایا کہ اس ناتواں عورت کے لئے یہ دعا کرنا بھی جہاد ہے۔ وہ بھی جہاد میں شامل ہو گئی ہے۔

سب کچھ تھا۔ لیکن خط کی محرومی اب بھی زلیخا کو ڈراتی اور ستاتی تھی۔ ایک دن نوشاد کو خیال آیا کہ زلیخا کے ان پڑھ ہونے سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اس نے عبداللہ کی طرف سے خود ہی خط لکھا اور ہنسی خوشی چہکتا ہوا' خط لے کر گھر آ گیا۔ ''سنا زلیخا' عبداللہ کا خط آیا ہے۔''

اس نے عبداللہ کا خط سنایا۔ وہ خیریت سے ہے۔ اللہ کی راہ میں بہادری سے لڑ رہا ہے۔ کافروں کے دل پر مجاہدین کی دہشت بیٹھ گئی ہے۔ وہ میدان جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے ہیں۔ انشاء اللہ فتح بہت قریب ہے۔ پھر وہ واپس آئے گا۔

یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ وہ خط زلیخا کے لئے تعویذ بن گیا۔ جب دل گھبراتا' وہ کسی سے بھی وہ خط سن لیتی۔ اس کے تصور میں لاڈلا عبداللہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ اسے لگتا' عبداللہ خود اس سے باتیں کر رہا ہے۔ خط سنانے والے کی آواز غائب ہو جاتی۔

دن گزرتے رہے۔ ایک دن زلیخا کو احساس ہوا کہ عبداللہ کو گئے ہوئے ایک سال ہو چلا ہے۔

❁.........❁.........❁

جیسے جیسے عبداللہ کا جنگ کا تجربہ بڑھ رہا تھا' اس کی دلیری اور شجاعت میں بھی

اضافہ ہو رہا تھا۔ مجاہدین کے درمیان اس کی عزت اور ساکھ بھی بڑھ رہی تھی۔ لیکن وہ خود بہت ناخوش تھا۔

اسے جہاد پر آئے ہوئے ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ اس دوران اس نے بڑے معرکوں میں حصہ لیا تھا۔ ہر خطرے میں وہ سب سے آگے ہوتا تھا...... دل میں شوقِ شہادت لئے۔ لیکن ہر بار موت اسے چھو کر' کوئی نیا زخم دے کر ساتھ لئے بغیر نکل جاتی تھی۔ ہر بار وہ ایسے بچتا کہ کبھی کو اس کی زندگی معجزہ لگنے لگتی۔

اسے ایسے زخم بھی لگے کہ ایک ماہ اسپتال میں رہنا پڑا۔ وہ عرصہ اس کے لئے بہت سخت ہوتا تھا۔ لیکن اس عرصے میں وہ اپنا احتساب بھی کرتا تھا۔ ابھی ایک ماہ پہلے وہ ایسے ہی عرصے سے گزرا تھا۔ ایسے میں بے کاری کا احساس اسے نڈھال کر دیتا تھا۔

اسے اکثر وہ خواب یاد آتا' جس میں ایک شہید کے باغ میں وہ اس کا مہمان ہوا تھا۔ اسے اس کی تمام جزئیات یاد تھیں۔ وہ سوچتا' کیا ایسا باغ مجھے کبھی نہیں ملے گا۔ کیا مجھے قیامت کے دن اللہ پاک کا دیدار نصیب نہیں ہوگا۔ اسے خواب والے شہید کے الوداعی الفاظ یاد آتے...... کون جانے' آپ کو بھی مرتبۂ شہادت ملے...... اور اللہ اس سے بہتر صلہ آپ کو عطا فرمائیں۔ پھر آپ میری دعوت کیجیے گا۔

عبداللہ مایوسی سے سوچتا' مجھے شہادت کیوں نہیں ملتی۔ کیا میری کوشش میں کمی ہے۔ میرے دل میں' میرے عمل میں کوئی خرابی ہے۔ میری شدت' میرا اخلاص سچا نہیں ہے۔ اللہ سے تو کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہوتا۔

اس پر سوچتے ہوئے وہ اپنی سوچوں میں بہت دور نکل جاتا۔ اسے یاد آتا' اس نے اور اماں نے بڑی ناشکری کی تھی۔ شہادت کی خوش خبری سن کر اماں نے مجذوب کو کیسا برا بھلا کہا تھا۔ اور وہ...... وہ تو ڈرنے لگا تھا۔ بزدل ہو گیا تھا۔ کتنے برس اس ناشکرے پن میں گزرے۔ کون جانے' اللہ نے خفا ہو کر اس کا مرتبہ منسوخ کر دیا ہو۔

پھر کیمپ اسپتال کے بستر پر لیٹے لیٹے اسے ایک خیال آیا۔ اسے اچانک اماں یاد



آئیں۔ ایسا لگا' جیسے اماں تڑپ کر اس کے لئے دعا کر رہی ہیں۔ تبھی اسے خیال آیا کہ اماں اس کے لئے دعا کرتی ہوں گی۔ اور کیا دعا کرتی ہوں گی' یہ تو سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ اس کی زندگی' سلامتی' اس کی واپسی کے لئے دعا کرتی ہوں گی۔ اور ماں کی دعا میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔

اسے یاد آیا' بابا (برہان صاحب) کہتے تھے۔ کبھی دعاؤں میں ٹکراؤ بھی ہو جاتا ہے۔ ایسے میں دعائیں ایک دوسرے کو رد کر دیتی ہیں۔ کیا پتا' یہاں بھی یہی بات ہو۔ وہ شہادت کی دعا کرتا ہے' اور اماں اس کی زندگی کی۔ تبھی تو کیسا ہی زخم لگ جائے۔ لیکن وہ بچ جاتا ہے۔

پچھلی بار اسے ایک اور خیال بھی آیا۔ اسے تربیتی کیمپ کے کمانڈر کی بات یاد آئی۔ یہی بات مختلف انداز میں کئی ساتھی مجاہد بھی اسے سمجھا چکے تھے۔ اب بستر پر زخمی حالت میں لیٹے اسے خیال آیا کہ وہ غلطی کر رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ مومن کو شہادت کی آرزو کرنی چاہیے۔ لیکن یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ بہت بڑا مرتبہ' یہ عظمت اللہ جسے چاہے' عطا کر دے۔ آدمی کو اس کے لئے سعی بہرحال کرنی چاہیے۔ اور شوقِ شہادت کی راہ میں کوشش یہ نہیں کہ آدمی موت کی خواہش کرنے لگے۔ ایسے کام کرے کہ دشمن کے ہاتھوں مارا جائے۔ موت تو موت ہوتی ہے۔ شوقِ شہادت کے لئے مقبول عمل یہی ہو سکتا ہے کہ مجاہد اپنا مقصد ذہن میں رکھے اور تب لڑے۔ اور وہ مقصد یہ ہو کہ کفر کو زیادہ سے زیادہ نقصان (مٹا دینے کی حد تک) پہنچایا جائے اور اسلام اور مسلمانوں کی کامیابی کو ذہن میں رکھ کر لڑا جائے۔ ایسے کہ اپنی زندگی کو بھی غیر ضروری طور پر خطرے میں نہ ڈالا جائے۔ تربیتی کیمپ کے کمانڈر نے کہا تھا کہ ایک مومن مجاہد سو کافروں کے بدلے بھی سستا' نقصان کا سودا ہے۔ گویا آدمی کوشش کرتا رہے۔ پورے خلوص سے...... شہید ہونے کی نیت اور ارادے سے نہیں' اسلام کو غلبہ دلانے اور کافروں کی شکست کے لئے۔ آگے اللہ کی مرضی کہ کب اس کی کوشش مقبول ہو جائے۔ اور مومن شہید نہ ہو تو بھی غازی

بھی بڑا مرتبہ ہے۔

اب عبداللہ نے اپنے عمل کو چیک کیا۔ خود کو ٹٹولا۔ اصل میں اس کے ذہن میں بچپن کی وہ بشارت بہت گہرائی میں بیٹھ گئی تھی' جو مجذوب نے دی تھی۔ اور وہ سمجھتا تھا کہ شہادت اس کا مقدر ہے۔ یہ سوچ بھی غلط تھی۔ چاہے آپ کو معلوم ہو' پھر بھی آپ کا کام تو مانگتے رہنا ہے۔ دوسرے وہ یہ سوچ کر لڑتا تھا کہ جلد سے جلد مر جائے۔ یہ اسلام کے لئے لڑنا تو نہیں ہوا۔ یہ تو اپنی غرض ہوئی۔ یہ اللہ کی راہ میں لڑنا بھی نہیں۔

اس نے سوچ لیا کہ اب اپنے عمل کی اصلاح کرے گا' تطہیر کرے گا۔ اور یہ ذہن میں رکھے گا کہ اسے ہر حال میں اللہ کی رضا پر راضی رہنا ہے۔

اب زخم مندمل ہونے کے بعد وہ محاذ پر گیا تو اس کا انداز بدلا ہوا تھا۔ اب وہ اپنی حفاظت کو ترجیح دیتا تھا۔ ہاں' مقصد بہت اہم ہوتا' مہم بہت دور رس نتائج کی حامل ہوتی' جو اس طویل جنگ کے نتائج پر اثر انداز ہونے والی ہوتی تو وہ اپنی زندگی کی اہمیت سے دستبردار ہو جاتا۔ یہ بہت بڑی تبدیلی تھی۔ اب اسے شہادت کی آرزو تو تھی۔ لیکن اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ اسے ملتی ہے یا نہیں۔ اسے تو اپنے طور پر صرف جہاد کرنا تھا۔ مسلسل لڑنا تھا۔ فیصلہ کن فتح یا موت تک۔ آگے مقدر لکھنے والا رب جانے۔

لیکن یہ خیال اسے بار بار ستاتا تھا کہ اس نے اور اماں نے بہت ناشکرا پن کیا ہے۔ وہ خود تو توبہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن اماں پر اس کا اختیار نہیں تھا۔

✿..........✿..........✿

عبداللہ کو نہیں معلوم تھا کہ اس کی زندگی کے لئے دعا کرنے والی ایک ہستی اور بھی ہے!

نجمہ نے منگنی کی انگوٹھی اور دوسری تمام چیزیں واپس کر دی تھیں۔ اور زلیخا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے کہا۔ ''آپا...... دیکھیں آپ کا عبداللہ لاکھوں میں ایک ہے۔ آپ کہیں بھی اِس کا رشتہ لے کر جائیں۔ کوئی بدنصیب ہی ہو گا جو انکار کرے



گا۔ لیکن ساتھ میں یہ بھی بتا دیں کہ وہ جہاد پر جا رہا ہے اور اسے شہادت کی آرزو ہے۔ اس کے بعد آپا' کوئی اپنی بیٹی نہیں دے گا اسے۔''

زلیخا جانتی تھی کہ نجمہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔

نجمہ نے رشتہ تو توڑ دیا۔ لیکن وہ عبداللہ کی محبت کو دل سے نہ نکال سکی۔ اور اسے یہ خیال بھی رہ رہ کر ستاتا کہ عبداللہ اور غزالہ بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ عبداللہ نے تو برملا اس کے سامنے اعتراف کیا تھا۔ اور غزالہ سے اس نے خود اگلوایا تھا۔

یہ سوچ کر' وہ اور جھنجلا جاتی۔ تو میں کیا کروں۔ کیا کر سکتی ہوں؟ بیٹی کو بیوگی کی طرف دھکیل دوں!

اب یہ عبداللہ کی محبت ہی تو تھی کہ منگنی ٹوٹ گئی۔ لیکن دونوں گھروں کے تعلقات برقرار رہے۔ بلکہ ان میں اور گہرائی آ گئی۔ نجمہ نے صبح کے وقت کو اپنی اور غزالہ کی ذمے داری بنا لیا۔ وہ زلیخا سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی اور غزالہ ناشتہ بناتی۔ پھر وہ دونوں ان دونوں کو ناشتہ کراتے۔ کبھی ان کا اصرار بہت بڑھتا تو انھیں بھی ناشتہ پر ان کا ساتھ دینا پڑتا۔

وہ تو دوپہر اور رات کے کھانے کی ذمہ داری بھی اٹھا لیتی۔ مگر پھر عبداللہ کے پرستاروں کا تانتا بندھنے لگا۔ ہر وقت گھر بھرا رہتا۔ ان میں جوان لڑکیاں بھی ہوتیں اور ادھیڑ عمر اور بوڑھی بھی۔ زلیخا کو تو کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا تھا۔

ان دنوں نجمہ' آپا کے گھر آنے والی لڑکیوں کو بہت غور سے دیکھتی تھی۔ وہ ان کے انداز دیکھتی۔ عبداللہ کے تذکرے پر ان کے ردِ عمل دیکھتی۔ وہ دعوے سے کہہ سکتی تھی کہ ان میں ایسی بھی ہیں' جو عبداللہ کی محبت میں اس طرح گرفتار ہیں کہ اس کی خاطر کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ وہ ایسی لڑکیوں سے غزالہ کا موازنہ کرتی۔ ان میں سے بیشتر غزالہ سے بھی خوب صورت تھیں۔

اسے احساس ہونے لگا کہ اس نے غلط کہا تھا۔ بہت لوگ ایسے تھے کہ جو عبداللہ کو

داماد بنا کر فخر کرتے۔ بہت لڑکیاں ایسی تھیں۔ جو اس کی خاطر خود بھی میدان جنگ تک جانے کو تیار ہو جاتیں۔ اسے شرمندگی ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی کمتری کا احساس ستانے لگا۔

پھر عبداللہ آیا بھی اور جہاد پر چلا بھی گیا!

یہی وہ وقت تھا کہ وہ نماز اور دعا کی طرف راغب ہوئی۔ وہ باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگی۔ اور اس کی دعاؤں کا مرکز غزالہ تھی...... لیکن براہِ راست نہیں، عبداللہ کے حوالے سے۔ وہ غزالہ کے مستقبل کے لئے دعا کرتی۔ لیکن اصل دعا عبداللہ کی زندگی، اس کی کامیابی اور اس کی بہتری کی ہوتی۔ اس کے دل نے یہ تسلیم کرلیا تھا کہ غزالہ کا مستقبل عبداللہ سے ہی بندھا ہے۔ کیوں؟ کیسے؟ یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ بس اس کے دل کو یقین تھا۔ اس کا دل کہتا تھا۔

وہ باقاعدگی سے ہر نماز کے بعد دعا کرتی۔ اے اللہ۔ عبداللہ کی زندگی کی حفاظت فرما۔ اسے غازی بنا کر واپس لا۔

اب تو اس معمول کو بھی دو سال ہو چکے تھے!

❁..........❁..........❁

نوشاد کی دکان پر اخبار باقاعدگی سے آتا تھا۔ عبداللہ کو پوچھنے والے بھی روز آتے تھے۔ ان کی وجہ سے نوشاد نے دکان کے سامنے دو بنچیں ڈال لی تھیں۔ اور وہ کبھی خالی نہیں رہتی تھیں۔ وہاں بیٹھنے والے بلند آواز میں جنگ کی خبریں اور جنگ کے بارے میں صحافیوں کے تجزیے۔ پھر ان پر تبصرے ہوتے۔ نوشاد دکانداری کرتے ہوئے سب کچھ سنتا۔ بیچ بیچ میں لقمے دیتا۔ کبھی جوش بڑھ جاتا تو دکان لڑکوں کو سونپ کر خود بھی باہر بنچ پر آ بیٹھتا۔

جنگ کا انجام نوشتۂ دیوار تھا۔ سب کو صاف نظر آ رہا تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی طاقت مفلوک الحال، بھوکے، کمزور اور بے سروسامان مجاہدوں کے سامنے سرنگوں ہو رہی



تھی۔ روس نے افغانستان کو تر نوالہ سمجھا تھا۔ لیکن اب وہ اس کے لئے حلق کی ہڈی بن گیا تھا، جسے نہ وہ نگل پا رہا تھا، نہ اگل پا رہا تھا۔ ایک بات واضح تھی۔ روس افغانستان سے اپنی بچی کھچی عزت بچا کر نکلنے کی فکر میں تھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ کوئی باعزت سمجھوتہ ہو جائے۔

جہادِ افغانستان ایک بہت بڑی حقیقت تھا۔ جنرل ضیاء کا کہنا تھا کہ افغانستان میں پاکستان کے دفاع کی جنگ لڑی جا رہی ہے۔ اس کے دور رس نتائج تو نکلنا ہی تھے...... مثبت بھی اور منفی بھی۔ منفی نتائج یہ تھے کہ دو چیزیں پاکستان میں بہت تیزی سے پھیلی تھیں اور عام ہو گئی تھیں...... منشیات اور اسلحہ!

ایک طرف وہ لوگ تھے جو اللہ کی راہ میں لڑ رہے تھے۔ تو دوسری طرف وہ لوگ تھے، جو تجارت کر رہے تھے۔ مجاہدین کے لئے آنے والا اسلحہ عام لوگوں کو فروخت کیا جا رہا تھا۔ دوسری طرف پورے افغانستان کے میدانِ جنگ میں تبدیل ہونے کی وجہ سے ہیروئن کا پورا کاروبار پاکستان منتقل ہو گیا تھا۔

بستی میں بھی بدمعاشوں کا ایک چھوٹا سا گروہ ابھرا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے پولیس کے محکمے اور پھر شہری انتظامیہ میں اپنا اثر رسوخ بنا لیا۔

وہ منشیات بھی بیچتے اور اسلحہ بھی۔ اور وہ بھتہ بھی لیتے تھے۔

سب کو پتا تھا کہ نوشاد کی دکان بہت چلتی ہے۔ وہ لوگ اس کے پاس بھی آئے اور اس سے ہزار روپے فی ہفتہ کا مطالبہ کیا۔ نوشاد کے پاس ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

پھر ایک روز بھتہ وصول کرنے والا نوشاد کے پاس آیا تو اس وقت تنظیمِ جہاد کا لڑکا بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے خاموشی سے نوشاد کو ایک ہزار روپے دیتے دیکھا تو سب کچھ سمجھ گیا۔ بھتہ لینے والا اور دکان سے بھتہ وصول کر رہا تھا۔ لڑکے نے کہا۔ ''چاچا...... مجھے ایک کام یاد آ گیا ہے۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

وہ لڑکا عثمان بھتہ لینے والے کا پیچھا کرتا اصل لوگوں تک پہنچ گیا۔ وہ لوگ عثمان سے واقف تھے۔ ''تم کیسے آئے ہو عثمان بھائی'' ؟ ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''چندہ لینا ہے کیا'' ؟ دوسرے نے ہنس کر کہا۔

نیک کام کے لئے حرام کا پیسہ نہیں لیتے ہم۔'' عثمان نے دبنگ کر کہا۔

''ہمیں یہ بات اچھی لگتی ہے۔ ہم تو محفوظ ہو گئے نا'' دوسرے نے ڈھٹائی سے کہا۔

''کام کی بات کرو عثمان بھائی۔'' ان کے سرغنے نے سنگین لہجے میں کہا۔

کام کی بات یہ ہے کہ مجاہد کبھی بھتہ نہیں دیتے۔'' عثمان کا لہجہ بہت سخت تھا۔'' تو کل جنرل اسٹور سے جو ایک ہزار روپے لائے ہو وہ واپس کر دو۔ اور آئندہ تمہارا کوئی آدمی اس دُکان کا رخ نہ کرے۔''

تو وہ نوشاد مجاہد ہے'' ؟

''بنو مت۔ تم جانتے ہو کہ عبداللہ جہاد پر گیا ہوا ہے۔''

''تمہیں اس سے کیا'' ؟

''لیکن ہمیں ہے۔ جہاد پر جانے والوں کے جان مال اور عزت کی حفاظت کرنا ہمارے ذمے داری ہے۔''

عثمان بھائی تم بھول رہے ہو کہ کہاں ہو اور کس سے بات کر رہے ہو۔'' سرغنہ اکڑنے لگا۔

مجھے یاد ہے۔ میں جانتا ہوں۔ ابھی یہاں تم مجھے مارنا بھی چاہو تو میں تم میں سے کم از کم چار کو مار کر مروں گا۔ اور اس کے بعد کیا ہوگا' یہ تم خوب جانتے ہو۔ ہمارے لئے زندگی کی کوئی اہمیت نہیں۔ جبکہ تم یہ سب کچھ زندگی کے لئے جمع کر رہے ہو۔ سوچو تو تمہارے بعد یہ سب کس کو ملے گا۔ ہم سے الجھنا ہے تو وصیت لکھ دو۔''

سرغنے کا انداز ایک دم بدل گیا۔'' میں تو مذاق کر رہا تھا عثمان بھائی۔ یہ لو ہزار



روپے۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ مجاہد کی دکان ہے۔''

''حالانکہ یہ بات پوری بستی جانتی ہے۔'' عثمان نے کہا اور ہزار روپے لے کر نکل آیا۔

سرغنے کے ساتھی نے کہا'' یہ کیا استاد۔ ہاتھ آیا ہوا پیسہ چھوڑ دیا۔''

''یاد رکھنا ہماری حکومت ان لوگوں پر ہے' جو اللہ کے سوا سب سے ڈرتے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں سے بچنا ہے' جو اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔''

عثمان نے وہ ہزار روپے لے جا کر نوشاد کو دیئے۔'' یہ رکھ لو چاچا۔ اب وہ تم سے بھتہ لینے کبھی نہیں آئیں گے۔''

''وہ تمہارے دشمنی بن جائیں گے بیٹا۔''

''بُروں کی دشمنی عزت کی بات ہے چاچا۔ ہم اس سے نہیں ڈرتے۔ بس اچھوں سے دشمنی نہ ہو۔''

''پھر بھی' صرف ہزار روپے کے لئے......''

بات ہزار روپے کی نہیں چاچا۔ میں تو ایسے ایک روپے کے لئے بھی لڑ جاؤں۔ یاد رکھو چاچا' یہ بھی جہاد ہے۔ ہر برائی سے لڑنا جہاد ہے۔ یہ نہیں کہ برائی مسلط ہو کر آپ کو رعایا بنا لے۔''

نوشاد سوچتا رہ گیا۔ کیا میں کسی جہاد کے قابل بھی نہیں؟

رُوسیوں کی کاروائیاں سمٹ رہی تھیں۔ خبر گرم تھی کہ وہ واپسی کی تیاری کر رہے تھا۔ سمجھوتے کے لئے امن بات چیت بھی ہو رہی تھی۔ مجاہدین کا جوش اور ولولہ اور بڑھ گیا تھا۔ انھیں ایک ایسی فتح کی خوشبو آ رہی تھی' جس کے امکان کا انھوں نے خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔

ایسے میں عبداللہ کو ایک اور عبداللہ مل گیا۔ وہ چار سال سے افغانستان میں لڑ رہا تھا۔ اب اس گروپ میں بھیجا گیا تھا۔

یہ دوسرا عبداللہ فرانس کا نومسلم تھا۔ اس کی عمر چوالیس سال تھی چار سال پہلے اس نے اسلام قبول کیا تھا اور اسکے صرف تین ماہ بعد وہ افغانستان چلا آیا تھا۔ وہ بھی بہت جوشیلا آدمی تھا۔ جنگ کے دوران ہوش وحواس میں نہیں رہتا تھا۔ وہ بہت کم سخن تھا۔ کم بولتا۔ اپنی بات کم سے کم وقت میں پوری کرنے کی کوشش کرتا بعض اوقات دو تین باتیں ایسے ملا کر گڈمڈ کرتا کہ سمجھنا مشکل ہو جاتا۔ وہ ہر کام بہت تیزی سے کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہر بات کی جلدی رہتی تھی اسے۔ اور وہ کم آمیز بھی بہت تھا۔ دوستی کرنے کا وہ قائل ہی نہیں تھا۔

لیکن عبداللہ سے اسے پہلی نظر میں عشق ہو گیا!

اب وہ ہر وقت عبداللہ کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ ایک دن عبداللہ نے اس سے پوچھا۔ ''یہ تم مجھ پر ملتفت کیسے ہو گئے''؟

''عبداللہ کا بھائی عبداللہ۔ تم میری جوانی۔ اچھا لگتا۔''

عبداللہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے جھنجلا کر کہا۔ ''یہ تم کوڈورڈ میں کیوں بات کرتے ہو۔ کچھ سمجھ میں نہ آئے تو بولنے کا کیا فائدہ''؟

''مجبوری''۔ عبداللہ سینیر نے کندھے اچکا دیئے۔ ''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ تم غور کر کے سمجھ لینا۔ ویسے میں ولنا نہیں چاہتا''۔

''کیوں بھئی میں نے تو سنا ہے کہ فرانسیسی بہت بولتے ہیں''۔

''اسی لئے تو میں نے ایک سال کی عمر میں بولنا شروع کیا تھا۔ پھر پورے انتالیس سال میں نان اسٹاپ بولتا رہا''۔

''تو اس میں کیا برائی ہے''؟

اچھا نہیں بولنے میں برائی ہے۔ بولو تو بس اللہ کی تعریف کرو۔ حق بولو۔ میں نے انتالیس سال اپنی جان پر بہت ظلم کیا''۔

''اور یہ تم کیا کہتے ہو کہ تمہارے پاس وقت نہیں ہے۔ کیا تمہیں یقین ہے شہادت



کا''۔

عبداللہ سینیر اچانک رونے لگا، بچوں کی طرح زارو قطار۔ ''میرا ایسا نصیب کہاں۔ میرے ایسے اعمال کہاں۔ اور وقت میرے پاس کہاں ہے۔ جب میں نے کلمہ پڑھا تو میرے پیروں سے زمین نکل گئی۔ میں نے سوچا، میں نے چالیس سال ضائع کر دیئے'' پورے چالیس سال۔ اب کون جانے، میرے پاس کتنا وقت بچا ہو۔ چالیس سال میں نے نماز نہیں پڑھی۔ قرآن نہیں پڑھا۔ دین کا علم حاصل نہیں کیا۔ دین کو سمجھا نہیں۔ عمل بھی نہیں کیا۔ اب سمجھوں تو عمر ہی ختم ہو جائے گی۔ عمل کا وقت کہاں ملے ا۔ میں رونے لگا۔ روتا رہا۔ مجھے تو سب کچھ جلدی میں کرنا ہے۔ اور مجھے معلوم ہے کہ ں سب کچھ کر ہی نہیں سکتا۔''

لیکن کلمہ پڑھتے ہی تمہارے چالیس سال تو دھل گئے۔ تم بچے کی طرح معصوم گئے۔ یعنی ابھی تم صرف چار سال کے ہو اور عمل کافی کر لیا ہے تم نے۔''

''مولانا نے بھی یہی کہا تھا۔ مگر میں کہتا ہوں، یہ تو اللہ کی رحمت ہے۔ مجھے تو اپنے ال یاد ہیں نا۔ مجھ پر تو بہت قرض ہے۔ چالیس سال کی نمازیں، روزے، دیگر ال۔ اور بداعمالیوں کے گناہوں کا بوجھ الگ۔ تین دن میں میری کمر جھک گئی تھی۔ ا جسم ہر وقت کانپتا تھا۔ پیشی والے دن اللہ کے سامنے کیا لے کر جاؤں گا۔

''مولانا بڑے مہربان تھے۔ وہ مجھے تسلی دیتے تھے۔ مگر میری تسلی نہیں ہوتی تھی۔ دن وہ بولے..... تم چاہئے کیا ہو؟ کیسے سکون ملے گا تمہیں؟ میں نے کہا..... مجھے چھ کرنا ہے، میں نہیں کر سکتا۔ مجھے کوئی شارٹ کٹ بتاؤ۔ کم وقت میں زیادہ عمل۔ تب ل نے کہا، جہاد کرو۔ انھوں نے مجھے جہاد کے بارے میں بتایا۔ بس مجھے سکون یا۔ میں سیدھا یہاں چلا آیا۔ مگر مجھے جلدی رہتی ہے۔ وقت نہیں ہے میرے ''

عبداللہ کی آنکھیں جلنے لگیں۔ یہ شخص اسلام قبول کر چکا ہے۔ مگر اپنے ان گناہوں

پر کیسا مضطرب ہے' جنہیں اللہ نے بخشنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور ہم ہیں کہ مسلم ہو کر بھی گناہ کرتے رہے۔ اور ان گناہوں کا خیال بھی نہیں آتا ہمیں۔

عبداللہ سینیر بس ایک کام سکون سے کرتا تھا۔ نماز پڑھتے ہوئے اس کا انہماک دیدنی ہوتا تھا۔ اس کے جسم میں جنبش بھی نہیں ہوتی تھی۔ اور نماز وہ دیر میں پڑھتا تھا۔ سکون سے' ٹھہر ٹھہر کر' آہستہ آہستہ۔ نماز کے ارکان ادا کرتے وقت اس کی ہر جنبش بہت زیادہ سلوموشن میں محسوس ہوتی تھی۔ وہ رکوع میں جاتا تو لگتا کہ جسم کے اتنے سے جھکاؤ میں اس کی عمر گزر گئی ہے۔ عبداللہ اسے نماز پڑھتے ہوئے بہت غور سے دیکھتا۔ کچھ عجیب بات تھی اس کی نماز میں۔ کہتے ہیں کہ نماز پڑھو تو تصور میں اللہ کو دیکھا کرو اور یہ نہ ہو سکے تو یہ تصور کرو کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ نماز پڑھتے ہوئے عبداللہ سینیر کو دیکھتے ہوئے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کس کیفیت میں ہے۔ مگر دیکھنے والے کو یہ احساس ہونے لگتا تھا کہ عبداللہ اس وقت اپنے رب کی حضوری میں ہے۔ وہ کھڑا ہوتا تب بھی سجدہ کرتا ہوا لگتا۔ اس کے رکوع میں بھی سجدے کا رنگ ہوتا۔ عبداللہ کو لگتا تھا کہ چالیس برس کی تلافی تو شاید اس کی ایک نماز نے ہی کر دی ہوگی۔

اور کئی بار ایسا ہوا کہ اس کے نماز پڑھنے کے دوران حملہ ہو گیا۔ گولیوں کی بارش ہوئی۔ گولہ باری شدید ہوئی۔ دائیں بائیں سے گولیاں برستی رہیں۔ قریب ہی گولے پھٹتے رہے۔ اور عبداللہ اسی طرح نماز پڑھتا رہا۔ اس کے جسم سے عجلت کی کوئی نشانی ظاہر نہیں ہوئی۔ بلکہ سچ یہ تھا کہ اسے پتا ہی نہ چلا کہ اس کے اردگرد کچھ ہو رہا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کا جسم نظر تو آ رہا ہے۔ مگر موجود نہیں ہے۔ وہ سلام پھیرتا اور سکون سے مختصر سی دعا کرتا۔ پھر وہ اٹھتا اور اسی لمحے اس کا جسم مضطرب ہو جاتا۔ بوٹی بوٹی پھڑکنے لگتی۔ وہ جنگ میں یوں شریک ہوتا' جیسے پچھلے ایک گھنٹے سے یہی کر رہا ہو۔

ایک دن عبداللہ نے اس سے پوچھا'' تم دعا کیا کرتے ہو؟''

''راز کی بات ہے۔'' وہ مسکرایا۔



''مجھے نہیں بتاؤ گے؟''

''تم تو میں ہو...... میری جوانی۔ میں اللہ سے استغفار کرتا ہوں اپنی پچھلی زندگی پر...... گمراہی پر اور میں کہتا ہوں' اللہ آپ مجھے خود بتائیے کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا۔ اور آپ مجھ سے بات نہیں کرتے کہ یہی آپ کی سنت ہے۔ تو مجھے نشانی دیجیے۔ اور وہ نشانی شہادت ہے۔ مجھے شہادت ملی تو میں سمجھ لوں گا کہ میری توبہ قبول ہو گئی۔''

''اور یہ میں تمہاری جوانی کیسے ہوں؟''

''تم بھی عبداللہ' میں بھی عبداللہ۔ تم پیدائشی عبداللہ اور میں یاں پال جو چالیس سال کی عمر میں عبداللہ ہوا۔ تمہیں دیکھتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ میں نے کتنا وقت ضائع کیا۔ تمہیں دیکھ کر مجھ میں تیزی اور پھرتی آ جاتی ہے۔ یاد آتا ہے کہ وقت کم ہے میرے پاس۔ میں عمر میں آگے ہوں۔ عمل میں بہت پیچھے ہوں۔ مجھے بہت تیز چلنا ہے۔ ورنہ خسارے میں رہوں گا۔''

اور نماز میں ستون کی طرح بے حس و حرکت کھڑا ہونے والا عبداللہ سینیر حالتِ جنگ میں اتنا زیادہ متحرک ہوتا تھا کہ اس کی گن تمام اطراف میں گولیاں برساتی تھی...... اس رفتار سے کہ دشمن گھبرا جاتا تھا اسے لگتا تھا' وہاں سینکڑوں مجاہد موجود ہیں۔

وہ عبداللہ جوڑی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ان کا ساتھ طویل نہیں تھا۔ لیکن وہ ایک جان دو قالب تھے۔ ہر جگہ وہ ساتھ ہوتے۔ وہ کندھے سے کندھا ملا کر فائرنگ کرتے تو ان کے ساتھی فخر سے کہتے۔ ان روسی کافروں نے کلاشنکوف بنائی۔ لیکن اب پریشان ہیں کہ یہ دو نالی کلاشنکوف کہاں سے آ گئی۔

کئی مہمات میں وہ ساتھ رہے۔ انہوں نے دشمن کے چھکے چھڑا دیے۔ کشتوں کے پشتے لگا دیے۔

پھر آخری معرکے کا دن آ گیا!

خبر گرم تھی کہ روسیوں کے لیئے رسد کی ایک بہت بڑی کھیپ آنے والی ہے۔ اس

سلسلے میں معلومات حاصل کرنی تھیں کہ کارواں کس راستے سے آئے گا...... اور کب آئے گا۔ اس کے بعد کے مرحلے آسان ہوتے گئے۔

سو جاسوسی کی اس مہم کے لیے عبداللہ سینیر کا انتخاب کیا گیا۔ کیونکہ وہ روسی زبان جانتا تھا۔ اب یہ ممکن نہیں تھا کہ ایک عبداللہ جائے اور دوسرا پیچھے رہے۔ یہ ان دونوں کی ضد تھی۔

''لیکن یہ خیال رہے کہ تمہیں صرف معلومات لے کر آنا ہے۔'' کمانڈر نے ان دونوں سے کہا۔'' جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے اسلحہ زیادہ ضروری ہے۔ تم لوگوں کو روسیوں کی پوسٹ پر صرف سن گن لینے کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔''

''او کے کمانڈر۔''

وہ دونوں گئے اور چند گھنٹوں میں انہیں مطلوبہ معلومات بھی حاصل ہو گئیں۔

واپسی میں عبداللہ سینیر نے عبداللہ سے کہا۔'' یاد رکھنا کارواں کل رات ایک بجے رُوٹ نائن سے گزرے گا۔''

''مجھے کیوں بتا رہے ہو؟'' عبداللہ نے کہا۔'' خود ہی بتا دینا۔''

''اس لیے بتا رہا ہوں کہ میں نہ پہنچ سکوں تو تم یہ خبر دے دو۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو؟''

''تمہیں کوئی خوشبو تو نہیں آ رہی؟''

عبداللہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔'' بے آب و گیاہ' سنگلاخ پہاڑوں میں خوشبو کا کیا کام۔''

عبداللہ سینیر مسکرایا۔'' یہی تو بات ہے۔ دنیا کے کسی پھول میں یہ خوشبو نہیں ہو سکتی۔ یہ تو جنت کی خوشبو ہے اور مجھے آ رہی ہے۔''

عبداللہ نے اسے یوں دیکھا' جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔'' مجھے کیوں نہیں آ رہی یہ خوشبو؟''



''اللہ کی مرضی'' عبداللہ سینیر نے درویشانہ شان کہا۔ پھر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟''

''کوئی مورچہ تلاش کر رہا ہوں۔ شہید ہوتے ہوئے بھی میں دو چار روسیوں کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔''

''مگر مجھے تو......''

''جلدی کرو۔ مجھے صاف آہٹیں سنائی دے رہی ہیں۔ وہ ہمیں چاروں طرف سے گھیر رہے ہیں۔''

وہ تیز تیز چلنے لگے۔ اُسی وقت فائرنگ شروع ہو گئی۔ عبداللہ سینیر نے ایک بہت بڑے گول پتھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' عبداللہ' ہمیں وہاں پہنچنا ہے بس پھر لطف آ جائے گا۔'' اس کے لہجے میں مسرت آمیز سنسنی تھی۔

اس گول پتھر کے عین اوپر ایک چٹانی چھجہ تھا۔ وہ دونوں گولیوں کی برسات میں اس کی طرف دوڑے۔ یہ معجزہ ہی تھا کہ اب تک ان میں سے کسی کو بھی گولی نہیں لگی تھی۔ وہ عافیت کے ساتھ وہاں پہنچ ہی گئے۔

عبداللہ سینیر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ چاروں طرف سے گھیر لیے گئے تھے۔ اور عبداللہ کا اندازہ تھا کہ گھیرنے والوں کی تعداد ساٹھ ستر سے کم نہیں تھی۔

عبداللہ سینیر حسب عادت مشین بن گیا تھا۔ اس کا گن والا ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے قوس کی شکل میں حرکت کرتے ہوئے تین سائیڈوں کو کور کر رہا تھا۔ عبداللہ اس نے دو قدم پیچھے سینے کے بل لیٹا سامنے سے آنے والے روسیوں پر فائرنگ کر رہا تھا۔ عقب کی سمت سے وہ دونوں محفوظ تھے۔

لیکن روسیوں کی تعداد ان کے اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔ اور فائرنگ شروع کرنے سے پہلے وہ پوزیشن سنبھال چکے تھے۔ عبداللہ کو کئی بار اپنے ہم نام کے حلق سے عجیب آوازوں کا احساس ہوا تھا۔ لیکن وہاں ایک لمحے کی مہلت بھی نہیں تھی۔

خودا سے موہوم سا احساس تھا کہ اس کے کندھے میں' بازو پر اور ایک ٹانگ میں دہکتے ہوئے انگارے اتر گئے ہیں۔ مگر وہ فائرنگ کیے جا رہا تھا۔ البتہ اسے اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے جسم سے خون بہت تیزی سے نکل رہا ہے اور ہر لمحہ اسے نقاہت دیتا جا رہا ہے۔

وہ بہت خوش تھا۔ آج شاید اس کے خواب کو تعبیر ملنے والی تھی؟

اسے احساس ہوا کہ عبداللہ سینیر کی گن کچھ سست پڑ گئی ہے۔ وہ داہنی جانب فائر نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے خود سامنے کے علاوہ داہنی سمت بھی فائرنگ شروع کر دی اچانک کہیں سے کوئی روسی زبان میں چلایا۔ پھر کسی نے اسے جواب دیا پھر تیسری آواز سنائی دی۔

عبداللہ سینئر نے ہذیانی انداز میں قہقہہ لگایا۔ ''بے دین...... بزدل کہیں کے۔''

''کیا کہہ رہے ہیں؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

''پہلے نے چیخ کر کہا...... وہ دو نہیں ہیں۔ بہت سارے ہیں اور دوسرا بولا ہم سمجھ رہے تھے کہ ہم انہیں گھیر رہے ہیں۔ لیکن اصل میں انہوں نے ہمیں گھیر لیا ہے۔ اور تیسرے نے حکم دیا...... بھاگو یہاں سے......''

ابھی عبداللہ سینیر کی بات پوری ہوئی تھی کہ بھاگتے ہوئے قدموں کی دُور ہوتی آوازیں سنائی دیں۔ فائرنگ اب بھی ہو رہی تھی۔ یہ اندازہ لگانے میں کچھ دیر لگی کہ دشمن کی فائرنگ رک گئی ہے اور وہ فرار ہو رہا ہے۔

''عبداللہ...... دوست...... وہ بھاگ رہے ہیں۔ نکل کر مارو انہیں۔ ایک بھی نہ بچنے پائے۔ میں...... میں ہل نہیں سکتا۔'' عبداللہ سینیر نے دم توڑتے لہجے میں کہا۔ عبداللہ نے ہلنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بھی نہ ہل سکا۔ ''میں بھی زخمی ہوں بھائی۔'' وہ بولا۔

دوسری طرف خاموشی رہی۔



عبداللہ ہمت کر کے گھسٹتا ہوا آگے بڑھا اس نے بھاگتے ہوئے روسیوں پر فائرنگ کی۔ وہ اندھا دھند بھاگ رہے تھے۔ عبداللہ گھسٹتا ہوا واپس آیا اور اس نے عبداللہ سینیر کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ کُھلے ہوئے تھے...... ایسے جیسے اس نے آخری لفظ اللہ ادا کیا ہو اور اس کے بعد اس کی جان نکل گئی ہو۔ اس کے ادھ کھلے ہونٹوں پر اور آنکھوں میں مسکراہٹ تھی اور چہرے پر روشنی۔ وہ جا چکا تھا۔

عبداللہ پر غشی طاری ہونے لگی۔ اسے احساس تھا کہ جریان خون اسے شہادت کی طرف لے جا رہا ہے۔ وہ خوشی سے مسکرایا۔ مگر اسی لمحے اسے ایک اہم بات یاد آ گئی۔ عبداللہ شہید ہو چکا تھا اور اس کے پاس اپنے ساتھیوں کی ایک اہم امانت تھی...... کارواں سے متعلق معلومات یہ ضروری تھا کہ وہ ان معلومات کو ساتھیوں تک پہنچا دے۔ اس وقت تک اسے جینا تھا۔

وہ اللہ سے دعا کرتا رہے' التجا کرتا رہا...... میرے رب مجھے مہلت عطا فرمائیے...... میرے ساتھیوں کے پہنچنے تک...... میرے اللہ۔

نجانے کب اس پر غشی طاری ہو گئی۔

اسے وہ آوازیں بہت دور سے آ رہی تھیں۔ شاید ساتھی آ رہے ہیں۔ پھر کسی نے اسے ہلایا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ ساتھی تو اس کے پاس موجود تھے۔ اس نے امانت کا بوجھ اتار دیا کل رات ایک بجے...... روٹ نائن...... اس نے اٹک اٹک کر بتایا۔

''ہمیں معلوم ہے'' اس پر جھکے ساتھی نے کہا۔ ''ہم آئے تو تم مسلسل یہی بڑبڑا رہے تھے۔''

اسی وقت ایک اور ساتھی آیا۔ ''ہم نے بہتر لاشیں گنی ہیں۔ ممکن ہے' اور بھی ہوں۔''

''بہتر!'' ساتھی کے لہجے میں رشک تھا۔

بے ہوشی میں ڈوبتا عبداللہ مسکرایا۔ ''انہوں نے سمجھا' ہم دو نہیں' بہت سارے

ہیں۔ باقی کافر ڈر کر بھاگ گئے۔''

''تم دو تھے بھی کہاں۔'' اس کے ساتھی نے کہا۔ ''تمہارے ساتھ اللہ بھی تو تھا۔''
لیکن اس وقت تک عبداللہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

❁......❁......❁

رات کے آٹھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ نوشاد ایک گاہک کے لیے چاول تول رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے عثمان کھڑا تھا۔

نوشاد نے چاول گاہک کی طرف بڑھائے۔ اور پیسے لے کر گلے میں ڈالے۔ اسے عثمان کی آمد پر حیرت تھی۔ ابھی کل ہی تو وہ مل کر گیا تھا۔

''بیٹے...... تم کیسے؟'' اس نے عثمان سے پوچھا۔

''چاچا...... آپ فوراً گھر چلے جائیے۔ چاچی کو آپ کی ضرورت ہوگی۔''

نوشاد نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ لڑکوں کو دکان سنبھالنے کو کہا اور خود گھر چلا گیا۔

زلیخا نے نوشاد کو بس ایک نظر بھر کر دیکھا۔ ''ایک منٹ...... میں ابھی آئی۔ تم یہاں بیٹھو۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے میں چلی گئی۔

نوشاد صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ سنسنا رہا تھا۔ عبداللہ بھی تو اسی چارپائی پر بیٹھتا تھا...... بچپن سے ہی۔ تمام ہوم ورک اس نے اس چارپائی پر بیٹھ کر ہی کئے تھے۔ ارے...... یہ زلیخا کہاں چلی گئی۔ کیا کر رہی ہے۔ اتنی دیر لگا دی۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ زلیخا کو کمرے میں گئے ابھی چند سیکنڈ ہی ہوئے ہیں۔

وہ اٹھا۔ اس نے کمرے میں جا کر دیکھا۔ زلیخا نماز پڑھ رہی تھی۔ وہ واپس چلا آیا۔ عشاء کی اذان تو ابھی نہیں ہوئی ہے۔ یا ہو گئی ہے۔ کچھ پتا نہیں، کیا ہو رہا ہے۔ وہ اٹھ کر صحن میں ٹہلنے لگا۔

زلیخا آئی تو اس نے کہا۔ ''یہ کون سی نماز پڑھ رہی تھیں تم؟''

''شکر کے نفل تھے جی۔'' زلیخا پتھر کی لگ رہی تھی...... آواز بھی پتھر لہجہ میں پتھر۔



''شکر کے نفل!''

''ہاں جی۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ وہ ہمارے عبداللہ کو بھیجیں گا یا نہیں۔''

نوشاد حیران تھا کہ کیا جواب دے۔ عثمان نے اس سے کچھ بھی تو نہیں کہا تھا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ نوشاد نے جا کر دیکھا۔ وہ عثمان تھا۔ نوشاد اسے اندر لے آیا۔ ''اب عثمان سے ہی پوچھ لو۔'' اس نے زلیخا سے کہا۔

زلیخا اور عثمان ایک دوسرے کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ عثمان نے زلیخا کی خشک آنکھوں ک دیکھتے ہوئے نوشاد سے پوچھا۔ ''چاچا آپ نے بتایا نہیں چاچی کو؟''

نوشاد کے جواب دینے سے پہلے ہی زلیخا نے کہا۔ ''مجھے پتا ہے بیٹے۔ میں شکر کے نفل پڑھ چکی ہوں۔''

عثمان کے لیے وہ شاک تھا۔ اس کی آنکھیں بہت تیزی سے بھیگیں۔ ''دیکھو...... میرے گھر میں میرے بیٹے کی شہادت پر رونا مت۔'' زلیخا نے سخت لہجے میں کہا۔ ''مجھے یہ بتاؤ کہ وہ میرے عبداللہ کو رخصت کرنے کے لیے گھر بھیجیں گے یا نہیں۔''

عثمان کے لیے بولنا ناممکن تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''تو وہ خود ہی رخصت کر چکے اسے۔'' زلیخا کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔ ''چلو جو اللہ کی مرضی۔ بس اللہ راضی رہے۔''

اب کے نوشاد کے آنسو نکل پڑے۔ وہ رو دیا...... بچوں کی طرح۔

زلیخا اس پر الٹ پڑی۔ ''کیا کرتے ہو جی۔ یہ تو نحوست ہے...... ایسے رونا...... اور ایسے موقع پر۔ ایسا نہ کرو۔ یا پھر گھر سے چلے جاؤ۔ میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔''

نوشاد کا تشویش سے برا حال تھا۔ زلیخا کا سمجھ جانا، شکر کے نفل پڑھنا اور اب یہ...... ''تم...... تم ٹھیک تو ہو زلیخا؟''

''میں ٹھیک ہوں۔ ایسی ٹھیک تو میں پہلے کبھی نہیں تھی۔ تم سمجھ رہے ہو، میں پاگل

ہوگئی ہوں۔نہیں ایسا نہیں ہے۔ہاں پہلے میں پاگل تھی۔'' زلیخا نے کہا۔پھر اسے یوں سمجھانے لگی' جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہو۔''دیکھو جی' شکر کا مقام تو ہے۔تم بھی نفل پڑھو جا کر میں تو جاہل ہوں۔تم تو پڑھے لکھے ہو۔ذرا سوچو تو۔اللہ کی دی ہوئی چیز تھی......امانت تھی اللہ کی۔اس کی مرضی جب چاہے' جیسے چاہے' واپس لے لے۔یہ تو اس کا کرم ہے کہ اس نے عزت دی' مرتبہ دیا۔سوچو تو......وہ ہمیں بیٹا دیتا ہی نہیں تو کیا ہوتا۔زندگی تو گزر ہی جاتی۔مگر بیٹے سے جو جو خوشیاں ملیں۔ان کا تو ہمیں پتا تک نہیں چلتا کہ ایسی خوشیاں بھی ہوتی ہیں۔پھر اسے اتنا اچھا بنایا اللہ نے۔کبھی ستایا نہیں اس نے۔کبھی نافرمانی نہیں کی۔کبھی رلایا نہیں۔ہمیشہ خدمت ہی کی۔عزت ہی دی۔خوشی ہی دی۔اور یہی ایک اس کی خوشی تھی جو اللہ نے اسے عطا کردی۔تو ہم اس کی خوشی میں غم کریں گے۔روئیں گے۔وہ کیا کہے گا۔سب کچھ سن رہا ہوگا وہ۔شہید مرتے تھوڑا ہی ہیں۔اسے شکایت کا موقع نہ دینا جی۔''

اور نوشاد ایسا حیران ہوا کہ آنسو اس کی آنکھوں میں ٹھہر گئے۔واہ میرے رب......کیسا بنایا ہے تو نے مسلمان عورت کو۔کتنا بڑا دل دیا ہے اسے۔یہ وہی عورت ہے نا جو شہادت کی خوشخبری سن کر بپھر گئی تھی۔اس نے مجذوب سے کہا تھا......تیرے منہ میں خاک۔اور آج......واہ مقلب القلوب واہ!

اس رات پوری بستی اس گلی میں جمع تھی۔اور گھر میں زلیخا عورتوں سے کہہ رہی تھی۔''یہاں رونے کے لیے آئی ہو تو نکل جاؤ یہاں سے۔میرے گھر میں بدشگونی نہ کرنا۔آج میرے بیٹے کی خوشی ہے۔امتحان میں کامیابی ملی ہے اسے۔آؤ بہن بیٹھو......''

❁......❁......❁

نجمہ غزالہ کی طرف سے فکرمند تھی۔بیٹی کا انداز اسے غیر فطری لگ رہا تھا۔عبداللہ کی خبر آنے کے بعد سے اسے چپ لگ گئی تھی۔وہ رو لیتی تو اچھا ہوتا۔چلو نہ روئی تو نہ



سہی۔لیکن اس کے ہونٹوں پر ہر وقت دبی دبی سی مسکراہٹ نجمہ کو خوف زدہ کردیتی۔یہی نہیں' وہ سب کچھ معمول کے مطابق' خوش دلی سے کر رہی تھی۔اس کے کسی انداز سے نہیں لگتا تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔

خود نجمہ کا حال یہ تھا کہ جیسے دل میں دو کانٹے ٹوٹ گئے تھے۔وہ بڑی اذیت میں تھی۔اور وہ دو دھاری' دہری تکلیف تھی۔عبداللہ اسے بیٹے جیسا پیارا تھا۔وہ بہت محبت کرتی تھی اس سے۔دل کا رشتہ تو اس سے تھا ہی۔پھر دنیا کا رشتہ بھی جڑ گیا تھا۔داماد بھی بیٹا ہی ہوتا ہے۔سو منگنی کے بعد وہ بہت خوش تھی۔اسے جیسے دونوں جہاں کی خوشیاں مل گئی تھیں۔

پھر سب کچھ بگڑ گیا۔اس نے خود بگاڑ لیا۔اس نے ضد بنالی کہ وہ عبداللہ کو جہاد پر نہیں جانے دے گی۔کوئی نہیں سمجھ سکا کہ یہ کا مان ہے۔دل سے تو وہ اس کا بیٹا تھا۔وہ تو سمجھتی تھی۔لیکن کوئی اور نہ سمجھتا' نہ مانتا۔عبداللہ کو اس سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں تھی۔نہ اس نے سمجھی۔اس نے آکر اسے نہیں بتایا کہ خالہ میں جہاد پر جا رہا ہوں۔اس بات نے اسے زخمی کردیا۔اور زخمی تو وہ پہلے ہی تھی......شوہر کی جدائی سے۔وہ تڑپ گئی۔اس نے بھلا دیا کہ وہ اسے بیٹا سمجھتی ہے۔سمجھنے سے کوئی بیٹا نہیں ہو جاتا۔اس نے خود سے کہا۔اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔مگر میرا ایک مسلمہ رشتہ ہے عبداللہ سے۔وہ میرا ہونے والا داماد ہے۔اس زاویے سے میرا حق ہے اس پر۔

سو اس حوالے سے اس نے حق جمایا۔عبداللہ کو روکنے کی کوشش کی۔مگر وہ رکنے والا کب تھا۔وہ بھی اپنی ضد میں آگے بڑھتی گئی۔یہاں تک کہ اس نے منگنی توڑ دی۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے اپنا کتنا بڑا نقصان کیا۔دل تو اس کا وہی تھا۔لیکن وہ ظاہری استحقاق بھی کھو بیٹھی تھی۔جس رات عبداللہ کی خبر آئی' وہ غزالہ کو لے کر آپا کے ہاں گئی۔آپا کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔کیسا صبر دے دیا ہے انہیں اللہ نے۔اسے رشک آنے لگا۔خود اسے تو صبر نہیں ملا تھا۔وہ خود کو رونے سے نہیں روک سکی۔اس پر اس کا

اختیار ہی نہیں تھا۔

آپا نے بڑی بے رخی سے اسے جھڑک دیا۔ ''نجمہ...... یہ نحوست پھیلانے کی ضرورت نہیں۔''

وہ دم بخود رہ گئی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر چلی آئی۔ برا مان کر نہیں۔ مجبوری میں۔ آپا نے جو کہا' وہ ان کا حق تھا۔ مگر وہ رونے پر مجبور تھی۔ پھر بھی اتنے لوگوں کی موجودگی میں توہین کا احساس بہت شدید تھا۔

وہ گھر آ کر روتی رہی۔ دل کا بوجھ ذرا کم ہوا تو اسے غور کرنے کی مہلت ملی۔ اُس نے سب کچھ خود ہی گنوا دیا تھا...... منگنی توڑ کر۔ منگنی نہ توڑی ہوتی تو ابھی آپا کے جھڑکنے پر وہ کہہ سکتی تھی...... ٹھیک ہے آپا۔ تم نے بیٹے کو صبر کر لیا۔ مگر مجھے داماد پر صبر نہیں آتا۔ مجھے رونے دو۔ اور سب لوگ اُس کا ساتھ دیتے۔ مگر اب وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ کہتی۔ آپا' تمہیں بیٹے پر صبر آ گیا۔ لیکن میں تو اپنے بیٹے کو رووں گی۔ وہ یہ کہتی تو سچ کہتی۔ لیکن کون اس کی تائید کرتا۔ کون اسے سچ مانتا۔

اور یہ سب کچھ اس نے کیوں کیا؟ بیٹی کے لئے؟ یا اپنی انا کے لئے؟ بیٹی کے لئے کیا تو لاحاصل تھا۔ جو ہونا تھا' وہ تو ہوا نصیب کے لکھے کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ اگر اس نے غزالہ کی شادی کر دی ہوتی عبداللہ سے تو اب وہ بیوہ ہوتی۔ اور منگنی نہ توڑی ہوتی' تو بھی غزالہ کی پوزیشن یہی ہوتی' جو اَب ہے۔ لیکن حق کا فرق ضرور پڑ جاتا۔ لوگوں کی ہمدردیاں اس کے اور غزالہ کے ساتھ ہوتیں۔

اور اس نے اپنی انا کے لئے منگنی توڑی تو وہ بڑے خسارے میں تھی۔ اب اس کی انا ہی تو زخمی ہو رہی تھی۔ اس کی کیا حیثیت تھی اس منظر میں۔ زیادہ سے زیادہ وہی جو ہر پڑوسی کی ہے۔ بلکہ اس سے بھی کم۔ کیونکہ اس نے نظر پھیری تھی ان لوگوں سے۔ بے مہری کی تھی۔

اور تو اور شاید بیٹی بھی اس سے خفا تھی۔ اگلی صبح اس نے کہا۔ ''امی...... خالہ کے



ہاں چلنا ہے۔''

''نہیں...... مجھے پھر رونا آئے گا۔'' اس نے کہا۔

تو غزالہ اکیلی ہی چلی گئی۔ اور اب آٹھ دن ہو گئے تھے۔ وہ ہر صبح اس سے کہتی ...... امی میں خالہ کے ہاں جا رہی ہوں...... اور چلی جاتی...... وہ پہلے کی طرح وہاں جا کر ناشتہ بناتی۔ نوشاد بھائی اور آپا کو ناشتہ کراتی۔ کچھ دیر آپا سے باتیں کرتی اور پھر گھر آ جاتی۔ اس نے ایک بار بھی اس سے چلنے کو نہیں پوچھا۔

اس روز اس نے غزالہ سے پوچھا۔ ''آپا...... مجھے کبھی نہیں پوچھتیں؟''

''وہ کیوں پوچھیں امی۔ رشتہ آپ نے ہی توڑا تھا۔ انہوں نے نہیں۔''

''تو پھر تم کیوں جاتی ہو وہاں؟''

''میں نے تو رشتہ نہیں توڑا تھا امی۔'' غزالہ نے نظریں جھکا کر کہا۔

''مگر ٹوٹ تو گیا تھا۔''

''دل مانے تو رشتہ جڑتا ہے۔ دل مانے تو ٹوٹتا ہے۔ میں تو وہیں کی وہیں' ویسی کی ویسی ہوں امی۔''

''تو اب آگے کیا ارادہ ہے؟''

''میرے ارادے سے کیا ہوتا ہے امی۔ آپ نے منگنی کی تو مجھ سے نہیں پوچھا۔ توڑی تو مجھ سے نہیں پوچھا۔ آئندہ بھی جو آپ کریں گی' مجھے قبول ہوگا۔''

''میں نے تمہارے ہی بھلے کے لئے یہ سب کچھ کیا تھا۔'' نجمہ نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

''تو ہو گیا نا میرا بھلا۔ آپ کے اختیار میں ہے نا۔ مجھے ملکہ بنا دیں کسی ملک کی۔''

نجمہ اور زخمی ہو گئی۔ زخم ہی زخم لگ رہے تھے ان دنوں۔ ''دیکھو بیٹی' آگے کی فکر کرو۔'' اس نے بڑے تحمل سے کہا۔ ''تم اس گھر سے جڑی رہو گی تو رشتہ کہاں سے آئے گا تمہارے لئے۔''

''منگنی رہی ہوتی تو ایسا ہوتا امی۔ اب تو میں پڑوس کے' انسانیت کے ناتے اس گھر سے جڑی ہوں۔ ایسی کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔'' غزالہ نے اسے لاجواب کر دیا۔

''رشتہ آنا ہوگا تو آئے گا۔''

غزالہ کو ماں کے فیصلے کی وجہ سے اس سے چڑ ہوگئی تھی۔ لیکن اس وقت اسے ماں پر ترس آنے لگا۔ وہ بے چاری خود کو کتنا اکیلا محسوس کر رہی ہوگی۔ ایسے میں وہ بھی اسے چھوڑ دے۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ویسے امی' خالہ روز تمہارا پوچھتی ہیں۔''

''سچ......!''

''ہاں امی۔ وہ پوچھتی ہیں' نجمہ کیوں نہیں آئی۔ میں کہتی ہوں...... انہیں رونا آتا ہے خالہ۔ پھر وہ آہ بھر کے کہتی ہیں...... مجبوری ہے۔ میں خود چلی جاتی اُس کے پاس۔ لیکن اس کے گھر میں اُسے رونے سے نہیں روک سکتی۔ اور رُونا مجھ سے کسی کا برداشت نہیں ہوتا۔''

''اب میں نہیں روؤں گی کبھی۔'' نجمہ نے بڑے عزم سے کہا۔

اگلے روز نجمہ ہمت کر کے زلیخا کے گھر چلی گئی۔ غزالہ کے ساتھ نہیں...... اس کے جانے کے کافی دیر بعد۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی اس نے جو منظر دیکھا' اس نے اسے ٹھٹھکا دیا۔

زلیخا بہت محبت سے غزالہ کو لپٹائے بیٹھی تھی۔ 'خالہ آپ مجھ سے اتنی محبت کرتی ہیں!''

''اتنی کہ سوچ بھی نہیں سکتی تو۔''

''یہ بتائیں' میں آپ کے لئے کیا ہوں؟''

''بیٹی...... مگر سچ یہ ہے کہ میں سگی بیٹیوں سے زیادہ پیار کرتی ہوں تجھے۔''

غزالہ نے سر اٹھا کر اسے غور سے دیکھا۔ ''کیوں خالہ؟''

''کیونکہ تو میرے بیٹے کی پسند بھی ہے۔'' زلیخا نے کہا۔ پھر جیسے دور کہیں دیکھتے



لگی۔ اچانک بولی۔ ''کتنا فرق ہے۔ بات ایک ہی ہے۔ بیٹے کی ماں جب کسی کو بہو بناتی ہے تو اس سے بیٹی کی طرح پیار کرنے لگتی ہے۔ اور بیٹی کی ماں داماد کو بیٹا جانتی ہے۔ مگر بیٹے کی ماں بیٹی کی ماں بن کر نرم ہو جاتی ہے اور بیٹی کی ماں بیٹے کی ماں بن کر سخت ہو جاتی ہے۔ نجمہ نے میرے عبداللہ کو بیٹے کی طرح چاہا تو اسے زخمی کر دیا۔ اسے جاتے جاتے ایک خوشی بھی نہیں دی۔ اور میں تجھے بیٹی سمجھتی ہوں تو انشاءاللہ خود تیرا رشتہ ڈھونڈوں گی۔ خود دھوم دھام سے شادی کروں گی تیری۔ دیکھنا تو......''

غزالہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ایسی باتیں نہ کریں خالہ۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ منگنی کسی سے ہو اور شادی کسی سے۔''

''اب وہ تو نہیں رہا بیٹی۔ زندگی تو چلنی ہے نا۔''

''نہیں خالہ۔ آپ خود ہی تو کہتی ہیں کہ شہید نہیں مرتا۔ اور یہ سچ ہے خالہ۔ مجھے رونا نہیں آتا۔ وہ مر گئے ہوتے تو میں روتی نا۔''

اسی لمحے زلیخا کی نظر نجمہ پر پڑ گئی جو دروازے میں بت بنی کھڑی تھی۔ ''ارے نجمہ...... آؤ...... آؤ نا۔''

نجمہ یوں بڑھی' جیسے کسی ڈور سے بندھی ہوئی ہو۔ وہ یوں چلتی زلیخا کے سامنے پہنچی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ زلیخا کے چہرے پر درشتی چھا گئی۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ''نجمہ...... رونا مت......''

''یہ آپا وہ رونا نہیں ہے۔ یہ ندامت اور پچھتاوے کا رونا ہے۔ مجھے معاف کر دیں آپا۔ میں نے بہت زیادتی کی اپنے بیٹے کے ساتھ۔''

زلیخا نے آہستگی سے غزالہ کو ایک طرف ہٹایا اور نجمہ کو سینے سے لگا لیا۔ اب وہ دونوں رو رہی تھیں۔ شہید بیٹے پر نہیں' اس پر کہ انہوں نے اسے ایک بہت بڑی خوشی سے محروم کر دیا تھا۔

وہ نہ سو رہا تھا' نہ جاگ رہا تھا۔ اور اسے وقت کا احساس بھی نہیں تھا۔ آنکھ کھولتا تو اپنے چاروں طرف اسے سفید رنگ نظر آتا اور دھندلائے ہوئے چہرے' جو محض چہرے تھے' جن کی کوئی شناخت کوئی پہچان نہیں تھی۔ اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ کتنا وقت گزر چکا ہے۔ بس اسے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ مستقل سفر میں ہے۔

پھر ایک دن اس نے آنکھیں کھولیں تو سب کچھ صاف اور واضح تھا۔ وہ اسپتال کے صاف ستھرے کمرے میں بیڈ پر لیٹا تھا۔ بیڈ کے برابر پڑی کرسی پر اس کا کمانڈر بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرایا۔ ''شکر ہے' تمہیں ہوش تو آیا۔''

''اس کارواں پر چھاپہ مارا آپ نے؟'' عبداللہ نے چھوٹتے ہی اس سے پوچھا۔

''کون سا کارواں؟'' کمانڈر کے چہرے پر الجھن ابھری۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ سمجھ گیا۔ ''وہ...... ہاں' اس کی فکر نہ کرو۔ وہ تو ہم نے اگلے ہی دن کام دکھا دیا تھا اب تو یہ بہت پرانی بات ہے۔''

''بہت پرانی بات؟'' اب عبداللہ کے لہجے میں الجھن تھی۔

''ہاں۔ تمہیں اس حالت میں تین مہینے ہو گئے۔ تمہارے جسم سے اٹھارہ گولیاں نکالی گئی ہیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ تمہارا بچ جانا معجزہ ہے۔''

عبداللہ اداس ہو گیا۔ ''ہاں۔ وہاں عبداللہ کو خوشبو آئی تھی۔ مگر وہ خوشبو میرے نصیب میں نہیں تھی۔''

کیسی خوشبو؟''

عبداللہ ابھی تک اسی لمحے میں تھا۔ عبداللہ سینیر کے ساتھ۔ اس کے شعور اور حافظے کے دامن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ابھی تو اس کے ذہن نے اس حقیقت کو بھی نہیں سمجھا تھا کہ وہ تین ماہ سے اسپتال میں ہے۔

اس نے وہ پوری بات تفصیل کمانڈر کو بتائی۔



''فرانس کا عبداللہ بہت خوش نصیب تھا''۔ کمانڈر نے رشک بھرے لہجے میں ہا۔ ''وہ ہر لمحے اپنی زندگی کے چالیس گمراہ برسوں کا غم کرتا رہا اور ہر لمحے اللہ کی راہ بں لڑتا رہا دلِ و جان سے۔ وہ جو ہر کام جلدی کرنا چاہتا تھا۔ کہتا تھا' اس کے پاس وقت ہت کم ہے۔ اور وہ چار سال میں وہ کچھ کر گیا جو عام لوگ سو سال میں بھی نہیں کر پاتے۔ اسے سچائی دیر میں ملی۔ لیکن بھرپور ملی۔ اور اس نے اپنا وجود' زندگی کا ہر لمحہ س سچائی کو سونپ دیا۔ وہ اس کا ہو گیا۔ اس نے زندگی کو جہاد بنا لیا۔ اور اللہ نے اس کی وت کو شہادت۔ فرانس میں چالیس سال تک وہاں کی زندگی گزارتے ہوئے اس نے وچا بھی نہیں ہوگا کہ زندگی ایسے بدل جائے گی۔ سچ ہے اللہ جسے چاہے' نواز دے۔ یہ س کی دین ہے۔''

''اب میں محاذ پر جا سکتا ہوں''؟

''نہیں۔ تم اب محاذ پر نہیں جا سکتے''۔ کمانڈر نے کہا۔ پھر اسے یوں سمٹتے جھرجھری لیتے دیکھا' جیسے اس نے اسے کوڑا مارا ہو' تو جلدی سے بولا۔ ''اللہ نے ہمیں فتح طا فرمائی ہے۔ روسی تقریباً واپس جا چکے ہیں''۔

عبداللہ کے چہرے پر حیرت تھی۔

''میرے پاس تمہارے لئے خبریں ہی خبریں ہیں۔ تین ماہ کی۔ کچھ اچھی' کچھ ی''۔ کمانڈر نے کہا'' ڈاکٹروں نے مجھ سے بہت بحث کی۔ وہ کہتے تھے' یہ معاملہ ہم چھوڑ دو۔ یہ بہت بڑا شاک ہوتا ہے۔ دماغ بالکل جواب دے جاتا ہے۔ میں نے کہا' میرا مجاہد ہے۔ مجاہد کو کبھی شاک نہیں لگتا۔ اسے میں بتاؤں گا۔ اب میری اور مجاہدوں ی عزت تمہارے ہاتھ ہے عبداللہ۔ بولو۔ تم تیار ہو''؟

عبداللہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں''۔

''کیا مطلب''؟

''میں جانتا ہوں۔ جان چکا ہوں۔ میرا ہاتھ۔'' عبداللہ سے بات پوری نہیں کی

گئی۔اس کی آواز رندھ گئی۔دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''یہی نہیں۔تمہاری ٹانگ اگرچہ سلامت ہے۔لیکن تم ہمیشہ لنگڑا کر چلو گے''۔

عبداللہ درد بھری آواز میں رونے لگا۔

''مجاہد ہو کر روتے ہو معذوری پر''؟ کمانڈر کے لہجے میں ملامت تھی۔

''نہیں سر۔جو جان کا نذرانہ لے کر جہاد پر نکلا ہو'وہ ایسی معمولی چیزوں کے لئے نہیں روسکتا۔میں تو اس پر رو رہا ہوں کہ میرے نذرانے میں خامی تھی جو اللہ نے اسے قبول نہیں کیا۔اور میں اس پر رو رہا ہوں کہ میں اب جہاد نہیں کرسکوں گا۔اور میں اس پر رو رہا ہوں کہ شہادت میرا مقدر نہیں ہے''۔

کمانڈر اچانک کھڑا ہوا اور اس نے زور سے ایڑیاں بجا کر اسے سلیوٹ کیا۔

''مجاہد عبداللہ۔میرا اور تمام مجاہدوں کا سلام قبول کرو''۔

''تو ہم جیت گئے۔جہاد ختم ہو گیا''؟

''جہاد کبھی ختم نہیں ہوتا عبداللہ۔ہم نے روس کو افغانستان سے نکال دیا۔لیکن ہمارا کام مکمل نہیں ہوا۔ہمیں یہاں اسلامی ریاست قائم کرنی ہے۔اب روسیوں کے جانے کے بعد اقتدار کے بھوکے طالع آزما میدان میں اتریں گے۔سب اسلام کا نام لیں گے۔ان میں سے سچوں کو پہچان کران کی مدد کرنا ہے۔ابھی تو دیکھو' کیا کیا ہوتا ہے۔بڑی بڑی تبدیلیاں آرہی ہیں''۔کمانڈر نے کہا۔

''اب میں گھر جانا چاہتا ہوں''۔

''ابھی یہ ممکن نہیں۔تمہیں ایک ماہ اور اسپتال میں رہنا ہوگا''۔

''میرا دم گھٹ جائے گا۔مجھے فوراً جانا ہے''۔

''مجبوری ہے عبداللہ۔تمہیں یہیں اپنی معذوری سے سمجھوتہ کرنا سیکھنا ہے۔اور تمہیں جلدی کیا ہے۔ماں باپ یاد آرہے ہیں''۔

عبداللہ نے نفی میں سر ہلایا۔''جہاد میں کوئی یاد نہیں آتا۔مگر مجھے اماں سے شکایت



کرنی ہے''۔

''کیسی شکایت''؟

عبداللہ نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔یہ وہ کمانڈر کو کیسے بتا سکتا تھا۔اسے اماں سے شکایت تھی کہ ان کا ناشکرا پن اور ان کی دعائیں۔شاید یہی وہ رکاوٹیں تھیں' جنہوں نے اسے شہادت سے محروم کردیا۔

نوشاد نے سر اٹھا کر سامنے کھڑے جوان کو دیکھا۔اس کے چہرے پر داڑھی بہت سج رہی تھی۔چہرے کے نقوش بہت جانے پہچانے تھے۔اس جوان کا بایاں ہاتھ بازو تک ندارد تھا۔خالی آستین جھول رہی تھی۔شاید ہاتھ کی رکاوٹ نہ ہوتی تو وہ اسے پہلی نظر میں پہچان جاتا۔

دوسری نظر میں اسے پہچانتے ہی نوشاد لپک کر کاؤنٹر سے باہر آیا۔اس نے اسے لپٹا لیا۔عبداللہ...... میرے بیٹے...... اللہ کا شکر ہے''

وہ دیر تک لپٹے رہے۔لپٹے لپٹے ہی عبداللہ نے کہا۔''کس بات پر شکر ادا کررہے ہیں ابا؟ میرے بچ کر واپس آنے پر؟''اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

''نہیں۔اس پر کہ اللہ کی راہ میں ہاتھ کٹوا کر آئے ہو''۔نوشاد نے سادگی سے کہا۔

''میں شہادت سے محروم رہ گیا ابا''۔عبداللہ رو پڑا۔''صرف اماں کی وجہ سے۔بہت ناشکرا پن کرتی تھیں اماں۔اور شاید میرے زندہ واپس آنے کی دعا بھی کرتی ہوں گی۔جبھی تو......''

نوشاد نے ایک جھٹکے سے اسے خود سے الگ کردیا۔''کیسی باتیں کررہے ہو''۔اس نے غصے سے کہا۔''اُس ماں کے لئے' جو اس ڈر سے دعا ہی نہیں کرتی تھی۔اس ماں کے لئے جسے تمہاری شہادت کی خبر ملی تو اس نے نہ کسی کو رونے دیا اور نہ خود روئی۔کہتی تھی' اللہ نے میرے بیٹے کو اس کی منہ مانگی خوشی دی ہے رونے کا مقام نہیں'

خوشی کی بات ہے‘‘۔

’’میری شہادت کی خبر!‘‘

نوشاد نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ دونوں گھر کی طرف چلے۔ راستے میں نوشاد نے یہ بھی دیکھ لیا کہ بیٹا لنگڑا کر چل رہا ہے۔

زلیخا کی خوشی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ساڑھے تین سال کی جدائی کے بعد اس بیٹے کا ملنا، جسے وہ تین ماہ پہلے صبر کر چکی تھی، کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

وہ تو اس کے لئے غیب سے ملنے والی خوشی تھی۔ وہ اس کے لئے مرا ہوا بیٹا تھا جسے اللہ نے دوبارہ زندگی دے دی تھی۔

اس بار تو تنظیم جہاد والے بھی دوڑے آئے۔ عثمان نے سب سے معذرت کی۔ پھر وضاحت کی کہ اتنی بڑی غلط فہمی کیسے ہوئی ہوگی۔ خود عبداللہ نے بھی تائید کی کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔

افغانستان سے خبریں تو آتی رہتی تھیں۔ جو مجاہد رخصت ملنے پر واپس آئے، وہی ان خبروں کا ذریعہ ہوتے تھے۔ جن دنوں وہ واقعہ ہوا، اس کے بعد آنے والے ایک مجاہد نے وہ واقعہ تنظیم جہاد کے دفتر میں کسی کو سنایا۔ اس نے بتایا کہ سو سے زیادہ روسیوں نے ایک مقام پر دو مجاہدین کو گھیر لیا تھا ان مجاہدین نے اس بلا کی فائرنگ کی کہ 72 روسی گرا دیئے۔ باقی روسی یہ سوچ کر فرار ہو گئے کہ مجاہدین کی تعداد زیادہ ہے۔ اور وہ چاروں طرف سے انہیں گھیر رہے ہیں۔ ان دنوں یہ واقعہ افغانستان میں ہر مجاہد کی زبان پر تھا۔ 72 عدد کے حوالے سے اسے اللہ کی طرف سے فتح کی بشارت قرار دیا جا رہا تھا۔

’’ان دنوں مجاہدین کا ایک ہی نام تھا...... عبداللہ‘‘۔ آنے والے مجاہد نے بتایا۔ ’’ان میں ایک تو اس بستی کا رہنے والا تھا‘‘۔ اس نے عبداللہ کی بستی کا نام لیا۔ ’’شہید عبداللہ کا نام مجاہدین میں فتح کی علامت بن چکا ہے‘‘۔

یوں یہ خبر عثمان تک پہنچی اور اس نے اسے عبداللہ کے والدین تک پہنچانا اپنی ذمے



ری سمجھا۔

’’میں معذرت چاہتا ہوں۔‘‘ عثمان نے یہ وضاحت کرنے کے بعد زلیخا سے کہا۔ ’’میری وجہ سے آپ کو بہت دکھ پہنچا ہے‘‘۔

’’ارے نہیں بیٹے۔ تمہاری وجہ سے عبداللہ کی واپسی کی خوشی اور بڑی ہو گئی ہے۔‘‘ لیخا نے کہا۔ ’’یہ خوشی تو اور کسی طرح مل ہی نہیں سکتی تھی‘‘۔

ایک بات سچ تھی۔ اگر عبداللہ کی شہادت کی خبر نہ آتی تو آج کی یہ خوشی اتنی بڑی نہ تی۔ اس کے والدین اس کی معذوری پر بہت دکھی ہوتے۔

لیکن اس خبر کے بعد تو اس کی واپسی ہی بہت بڑی نعمت تھی۔ اس خوشی میں وہ ذوری کا دکھ بھی بھول گئے۔ اللہ جو کچھ کرتا ہے، اس میں مومنوں کی بہتری ہوتی ہے۔ الگ بات کہ وہ سمجھ نہ پائیں۔

نجمہ اور غزالہ کے لئے بھی وہ بہت بڑی خوشی تھی۔ نجمہ نے اس تمام عرصے میں یہ ت بہت اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ عبداللہ اس کے لئے اول و آخر بیٹا ہے۔ داماد بنے نہ نے، اس سے اُس کی اس حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اور یہ عبداللہ کی محبت ہی تھی کہ عبداللہ کو دیکھ کر وہ تڑپ گئی۔ غم و غصے سے شل ئی۔ سچی بات یہ کہ عبداللہ اس کی کوکھ کا بیٹا ہوتا، تب بھی اس کا یہی ردعمل ہوتا۔

عبداللہ خاص طور سے اسے سلام کرنے آیا تھا۔ نجمہ نے جو اس کا لنگ اور کٹا ا ہاتھ دیکھا تو جیسے پاگل ہو گئی۔ اس نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔

’’واپسی مبارک ہو بیٹے۔ یہ جہاد کا شوق پورا ہو گیا‘‘۔

عبداللہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے اس زہریلے لہجے کی امید نہیں تھی۔ والہانہ بتوں اور عقیدتوں کے اس سیلاب میں زہر میں بجھا یہ لہجہ اسے بہت منفرد لگا۔ ’’نہیں الہ۔ جہاد کا شوق کبھی پورا نہیں ہوتا۔ شہادت تک باقی رہتا ہے یہ۔ میں تو اسا گیا تھا۔ پیاسا ہی لوٹ آیا ہوں‘‘۔

"شہادت میں کمی ہی کیا رہ گئی۔ آدھی شہادت تو ہوگئی بیٹے"۔ نجمہ کے ترکش میں تیروں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ عبداللہ کو اس حال میں دیکھ کر اسے جو صدمہ ہوا تھا' اس کا بدلہ وہ عبداللہ کے سوا کس سے لیتی۔ یہ ماں کی حیثیت سے اس بیٹے پر اس کا حق تھا۔

"شہادت آدھی پونی نہیں ہوتی خالہ۔ یا تو شہادت ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ آپ میرے زخم پر نمک چھڑک رہی ہیں"۔

"یہ بتا' کوئی تمغہ کوئی میڈل بھی ملا تجھے"۔ نجمہ اور آگے بڑھی۔ پھر خود ہی بولی۔ "میں بھی کیسی آنکھوں والی اندھی ہوں۔ میڈل نظر نہیں آرہے کیا۔ یہ ٹوٹی ہوئی ٹانگ میڈل نہیں ہے! یہ کٹا ہوا ہاتھ تمغہ نہیں ہے"۔ اس کی آواز آنسوؤں کے بوجھ سے تھرّا گئی۔

"سچ کہتی ہو خالہ۔ جہاد میں ہلالِ جرات' نشانِ حیدر نہیں ملتے۔ ان کی تمنا بھی نہیں ہوتی مجاہد کو۔ اور میرے پاس بے شمار تمغے اور میڈل ہیں خالہ"۔ اس نے گریبان کے بٹن کھول کر سینہ سامنے کر دیا۔ "پورا جسم تمغوں سے بھرا ہوا ہے خالہ۔ اور یہ تمغے نہ کوئی چھین سکتا ہے نہ چوری کر سکتا ہے"۔

دونوں اپنے آپ میں گم بول رہے تھے۔ نجمہ اپنا دکھ ہلکا کر رہی تھی۔ مگر اس کا ہر لفظ عبداللہ کو کوڑے کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ زہریلے لہجے میں چھپی ممتا کو نہیں سمجھ سکا۔ اس کے نزدیک وہ ماں نہیں' اس کی منگیتر کی ماں بول رہی تھی۔ جیسے وہ اسے معذوری کا طعنہ دے رہی ہو۔ جتا رہی ہو کہ اب وہ اس کی بیٹی کے قابل نہیں رہا۔ حالانکہ نجمہ کے ذہن میں دور دور تک ایسی بات نہیں تھی۔

نجمہ نے زخموں سے سجا سینہ دیکھا تو اسے اپنی باہوں میں بھر لیا۔ کڑیل بیٹے نا تواں ماؤں کی آغوش میں بہت چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ پھر نجمہ اسے لپٹا کر ایسے روئی کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ عبداللہ کی اس ہم آغوشی میں سرد مہری ہے۔



عبداللہ نے یہ تو سمجھ لیا کہ بیٹی کی یہ ماں اس سے محبت کرتی ہے۔ لیکن اس کے رونے سے اس نے یہ مطلب نکالا کہ وہ اب اسے داماد کی حیثیت سے قبول نہیں کرنا چاہتی۔ اور اس سے محبت کی وجہ سے انکار بھی نہیں کر سکتی۔

اس نے سوچ لیا کہ اسے یہ بوجھ نہیں اٹھانے دے گا۔ خود ہی اٹھالے گا۔ اب وہ ہی تو فیصلہ کر سکتا ہے۔

❁ ........... ❁ ........... ❁

عبداللہ نے اسپتال میں اپنی دانست میں جو فاضل ایک ماہ گزارا تھا۔ اس نے وہ عرصہ نہ گزارا ہوتا تو اس وقت اس کی اماں اور ابا بہت دکھی ہوتے۔

وہ عام لوگوں کی طرح چلتا پھرتا تھا۔ چال کی لنگڑاہٹ کا تو وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اپنے اکلوتے ہاتھ سے وہ بخوبی دونوں ہاتھوں کا کام لے سکتا تھا۔ وہ ایسا کوئی موقع نہ آنے دیتا کہ ماں باپ کو اس پر ترس آئے۔

آرام کے نام پر جو اس نے ایک مہینہ گزارا' اس میں اس کی صحت بھی بہت بہتر ہوگئی۔ رخسار بھر گئے اور ان پر سرخی جھلکنے لگی۔ چہرے پر رونق آگئی۔ پھر ایک دن وہ دکان پر پہنچ گیا۔

آؤ بیٹے بیٹھو" نوشاد نے بینچ کی طرف اشارہ کیا۔

"میں یہاں بیٹھنے اور گپ شپ کرنے نہیں آیا ابا۔ اب میں اپنی دکان سنبھالوں گا۔ آپ سمجھیں اب ریٹائر ہو گئے"۔

"سر آنکھوں پر بیٹے۔ لیکن بہتر ہے کہ اور کچھ دن آرام کر لو" نوشاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تو ویسے بھی تھک گیا ہوں۔ ریٹائرمنٹ کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں"۔

"اب آرام میں تکلیف ہوگی ابا۔ بے کاری سے اکتا گیا ہوں میں۔ بس آج سے ساری ذمے داری میری"۔

"ٹھیک ہے۔" نوشاد نے کہا۔ "لیکن دکان مجھ سے نہیں چھوڑی جائے گی۔ جب جی چاہے گا آؤں گا اور جب چاہوں گا جاؤں گا۔ لیکن دکان کے اندر نہیں آؤں گا۔ باہر بینچ پر بیٹھ کر اخبار پڑھوں گا' خبروں پر تبصرہ کروں گا اور باتیں کروں گا۔"

"یہ ٹھیک ہے ابا۔"

نوشاد کو دراصل یہ فکر تھی کہ بیٹا دکان سنبھال پائے گا یا نہیں۔ وہ اس پر نظر رکھنا چاہتا تھا۔ قریب رہنا چاہتا تھا۔ تا کہ بوقتِ ضرورت اس کی رہنمائی کر سکے۔ لیکن اس نے بیٹے کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہونے دیا۔

تھوڑے ہی دنوں میں وہ اس طرف سے مطمئن ہو گیا۔ اب وہ آزاد تھا۔ برہان صاحب کے ہاں اس کی نشست طویل ہو گئی تھی۔

اللہ کسی کو محرومی دیتا ہے تو اس سے سمجھوتے کو اس کے لئے آسان کر دیتا ہے۔ یہ اس کی رحمت ہے۔ عبداللہ نے خود کو بڑی کامیابی اور آسانی سے اس نئی زندگی اور اس کے معمولات میں ڈھال لیا۔ اس کی ظاہری معذوری تو سب کو نظر آتی تھی۔ یہ مجبوری تھی۔ لیکن اس کی وجہ سے وہ مسائل سے دوچار نظر نہیں آتا تھا۔ اس سے ماں باپ کو اطمینان ہوتا...... انھیں بیٹے کی محرومی کا دکھ نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک نارمل زندگی گزار رہا تھا۔

عبداللہ کو آئے ہوئے تین مہینے ہو گئے۔ نجمہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ اب آپا اس سے شادی کی بات کریں گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تب اسے خیال آیا کہ منگنی تو اس نے توڑی تھی...... اور جس دوٹوک انداز میں توڑی تھی' اس کے بعد آپا یہ بات کیسے چھیڑ سکتی ہیں۔ اب تو پہل اسے ہی کرنا تھی۔

اس نے ایک دن بات چھیڑی...... ایسے میں کہ عبداللہ بھی وہاں موجود تھا۔ وہ باتھ روم میں تھا۔ نجمہ نے اتنی بلند آواز میں بات کی کہ عبداللہ سن لے۔

"آپا...... اب تو میرا عبداللہ لوٹ آیا ہے۔ کچھ شادی کی سوچیں نا۔"

زلیخا ہکا بکا رہ گئی۔ اس نے تو یہ آس ہی چھوڑ دی تھی۔ "مگر نجمہ..... تم نے



تو......"۔

نجمہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "پرانی باتوں کو بھول جائیں آپا۔ آپ جانتی ہیں کہ عبداللہ مجھے کتنا عزیز ہے"۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن......"۔

"آپا...... آپ کو' کسی کو کیا معلوم کہ اپنی اس غلطی کے بعد میں نے عبداللہ کے لئے کتنی دعا کی ہے۔ کب سے کوئی اور دعا کی ہی نہیں سوائے اس کے کہ اللہ عبداللہ کو زندہ سلامت واپس لائے۔ میں تو ضد کرتی تھی اللہ سے کہ مجھے عبداللہ زندہ سلامت چاہیے۔ اور دیکھ لیں' اللہ نے میری سن لی"۔

عبداللہ تلملا کر باتھ روم سے نکل آیا۔ "آپ کی آدھی دعا قبول ہوئی ہے"۔ اس نے کہا۔ میں زندہ واپس آ گیا۔ لیکن صحیح وسلامت نہیں"۔

نجمہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "میرے لئے یہی بہت ہے"۔

عبداللہ نے اس سے نظر پھیری اور ماں سے بولا۔ "اماں...... مجھے کسی سے شادی نہیں کرنی...... کسی سے بھی نہیں۔ مین معذور آدمی سہی' کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ میں کسی کی زندگی کیوں خراب کروں"۔

"ایسی کیا بات ہے بیٹا......"

"بس اماں' مجھ سے شادی کی بات کوئی نہ کرے"۔ عبداللہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور پاؤں پٹختا ہوا گھر سے نکل گیا۔

زلیخا نے معذرت خواہانہ نظروں سے نجمہ کو دیکھا۔ "بہت کڑوا ہو رہا ہے۔ لیکن اسے سمجھا لوں گی"۔

لیکن نجمہ کو عبداللہ کے انداز میں کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا تھا۔ اسے لگا تھا کہ وہ اس سے چڑا ہوا ہے۔ بظاہر اس کی وجہ بھی تھی۔ وہ جو اس نے منگنی توڑی تھی اور اسے جہاد پر جانے سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے لگتا تھا کہ اس کے علاوہ بھی اور

اس سے گہری بھی کوئی بات ہے' کیا ہے؟ یہ وہ سمجھ نہیں سکی۔ بس اسے ایسا لگتا تھا کہ اُس نے عبداللہ کو ہمیشہ کے لئے کھو دیا ہے۔

اُدھر غزالہ بھی پریشان تھی۔ اسے عبداللہ بہت بدلا بدلا لگا۔ کچھ وہ چڑچڑا اور تلخ ہو گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ اس کی معذوری تھی۔ اور یہ فطری تھی۔

اسے امید تھی کہ یہ چیز گزرتے وقت کے ساتھ کم ہوتے ہوتے دور ہو جائے گی۔

لیکن اس کی امید پوری نہیں ہوئی۔ عبداللہ نے خود کو مشین کی طرح مصروف کر لیا۔ پہلی بار کے بعد وہ کبھی اس کے گھر بھی نہیں آیا تھا۔

اس بات کا احساس نجمہ کو بھی تھا۔ ایک دن وہ دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ عبداللہ دکان جانے کے لیے وہاں سے گزرا تو اس نے اسے پکار لیا۔ عبداللہ نے اسے سلام کیا۔

نجمہ نے جواب دینے کے بعد کہا۔ ''بیٹے...... اندر آؤ نا۔''

''خالہ...... دکان کھولنی ہے مجھے۔'' عبداللہ کا لہجہ بے حد نرم' لیکن اپنائیت سے یکسر محروم تھا۔

''دو منٹ میرے لیے بھی سہی۔''

عبداللہ ہچکچایا۔ لیکن اندر آ گیا۔ نجمہ نے اسے چائے کی پیالی دی اور بولی۔ ''مجھ سے ناراض ہو؟''

''نہیں خالہ۔ میں ناراض کیوں ہوں گا۔''

''تو ہمیں پوچھنا ہی چھوڑ دیا۔ پہلے تو ہر روز آتے تھے۔ پوچھتے تھے' خالہ کچھ منگوانا تو نہیں ہے۔ اور میں کسی چیز کو کہتی تو پہلے وہ لا کر دیتے' پھر اپنے کام سے جاتے۔''

''اب میں اس قابل ہی نہیں ہوں خالہ...... اس لیے پوچھتا بھی نہیں ہوں۔'' عبداللہ نے سادگی سے کہا۔ ''اب تو میں معذور ہوں۔ اپنا کام کر لوں' یہی بہت ہے۔ اب ایسا کہاں کہ آپ کو کچھ منگوانا ہو اور میں دوڑ کر لا دوں۔''

''مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔'' نجمہ نے محبت سے کہا۔ ''اپنے سارے کام خود ہی کرتے



ہو اللہ کے کرم سے۔''

''پھر بھی خالہ' ایک ہاتھ سے محرومی بھی ایک حقیقت ہے اور لنگڑاہٹ بھی۔'' عبداللہ نے پیالی خالی کر کے اسے دی۔ ''اچھا خالہ' میں چلتا ہوں۔''

گھر میں ایک دن زلیخا نے اس سے شادی کی بات چھیڑی۔ ''بیٹا...... اب گھر بسا لے۔ مجھے بہو لا دے۔ میں بہت اکیلی ہوں۔''

''اماں...... یہ نہیں ہو سکتا۔''

''غزالہ نہیں تو نہ سہی۔ کہیں اور لڑکی دیکھوں؟''

''نام سے کیا فرق پڑتا ہے اماں۔ لڑکیاں تو سب لڑکیاں ہی ہیں۔ میں کسی پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔''

''شادی کیا ظلم ہوتی ہے۔'' زلیخا نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

''کسی معذور اور اپاہج سے شادی تو ظلم ہی ہے۔''

''نہ تُو معذور ہے نہ اپاہج۔ البتہ تیرے دماغ میں خرابی ضرور ہے۔ زبردستی تیری شادی نہیں ہو گی۔ تجھے تو پتا بھی نہیں کہ تیرے لیے جس طرف اشارہ کر دوں' انکار نہیں ہو گا۔ تیری تو آرزو کرتے ہیں لوگ۔''

''یہ بہر حال لڑکی پر ظلم ہو گا اماں۔ اور میں ظلم نہیں کروں گا۔''

''دیکھ بیٹے' بچوں کی سی باتیں نہ کر......''

''اب مجھ سے شادی کی بات کی اماں تو میں جہاد پر چلا جاؤں گا۔''

یہ سن کر تو زلیخا سہم ہی گئی۔

خود عبداللہ کے ذہن میں سب کچھ واضح تھا۔ جب نجمہ نے اس سے طنزیہ لہجے میں تمغوں والی بات کی تھی تو اس نے اس کی محبت محسوس کر لی تھی۔ لیکن اس کے انداز میں جو جھنجلاہٹ تھی۔ اس سے اس نے یہی مطلب نکالا کہ وہ ایک بیٹی کی ماں بن کر سوچ رہی ہے۔ اور کوئی ماں اپنی بیٹی کے لیے معذور خاوند نہیں گوارا کر سکتی۔

دوسرے اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ نجمہ نے خود بتا دیا تھا کہ وہ اس کی واپسی کے لیے دعا کرتی تھی۔ تو شاید وہ دعا ہی تھی، جس نے اسے شہادت سے محروم کر دیا۔ اس کے نتیجے میں وہ اور چڑ گیا تھا۔

اور اب اس کی سمجھ میں یہ بھی آ گیا تھا کہ مجذوب بابا نے نجمہ خالہ کو ناقدری کیوں کہا تھا۔ واقعی ناقدری تو وہ تھیں۔ انہوں نے صرف ایک مجاہد کی ناقدری نہیں کی تھی۔ انہوں نے شہادت جیسی نعمتِ عظمیٰ کی بھی ناقدری کی تھی۔

یہ سب اپنی جگہ۔ لیکن وہ غزالہ کے سوا کسی سے شادی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا!

❁.........❁.........❁

اس الجھن میں تین سال گزر گئے۔ غزالہ کے لیے کئی رشتے آئے۔ لیکن نجمہ نے انکار کر دیا۔ وہ مان بھی جاتی تو غزالہ آمادہ نہ ہوتی۔

پھر ایک دن غزالہ نے خود ہی عبداللہ سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے عبداللہ کو گھر میں بلا لیا۔ ''ایک بات بتائیں۔ آپ چاہتے کیا ہیں؟''

''میں...... میں کچھ بھی نہیں چاہتا۔''

''یعنی خود سے متعلق تمام لوگوں کو ان کی خوشی سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔'' غزالہ کا لہجہ سخت تھا۔

''کوئی اپنی خوشی مجھ سے وابستہ کر لے تو میں اس میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''تو آپ کے والدین کو آپ سے خوشی کی آس نہیں لگانی چاہیے۔''

''یہ میرے والدین کہاں سے آ گئے اس بیچ میں؟'' عبداللہ نے کہا۔

''میں کسی اور کی نہیں، انہی کی خوشی کی بات کر رہی ہوں۔'' غزالہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ''باقی کون آپ سے کچھ مانگ رہا ہے۔ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو غلطی کر رہے ہیں۔ کسی کو آپ سے کچھ امید نہیں۔ نہ کوئی کچھ مانگ رہا ہے آپ سے۔ آپ اپنے والدین کا حق تو ادا کریں۔ اور بہر حال وہ بھی آپ کی مرضی۔ میرا کوئی زور نہیں آپ



پر۔'' غزالہ کے لہجے میں دل دکھانے والی بے رخی در آئی۔

عبداللہ زخمی ہو گیا۔ غزالہ سے اس بے رخی کی اسے امید نہیں تھی۔ ''مطلب کیا ہے ان باتوں کا؟''

''مطلب صرف یہ ہے کہ آپ کے لیے رشتوں کی کمی نہیں۔ آپ کہیں شادی کر لیں۔ یہ آپ کے والدین کی خوشی ہے۔''

''یہ زیادتی ہے۔ میں کسی کے ساتھ بھی نہیں کر سکتا۔'' عبداللہ نے اپنی وہی منطق چلائی۔ ''میں معذور ہوں۔''

''اس کے باوجود کوئی ہنسی خوشی، دل و جان سے آپ کو قبول کر لے تو اس میں آپ کی کیا زیادتی ہوئی۔''

''تم کیوں نہیں کرتیں شادی؟''

غزالہ کی نظریں جھک گئیں۔ ''جب بھی امی کوئی رشتہ قبول کر لیں گی تو میری شادی ہو جائے گی۔ میں نے منع تو نہیں کیا ہے۔''

''لیکن اس دوران کئی رشتے آئے......''

''امی کو پسند نہیں آئے۔ میرا معاملہ صاف ہے۔ آپ اپنی بات کریں۔''

عبداللہ کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ وہ نرم پڑ گیا۔ ''تم مجھ سے ناراض ہو؟''

''نہیں لیکن آپ نے مجھے مایوس کیا ہے۔ دیکھیے میں آپ کو بہت بڑا انسان سمجھتی تھی۔ اور آپ کا کردار، آپ کا عمل تھا بھی ایسا۔ آپ کسی برائی میں کبھی نہیں پڑے۔ پھر آپ کا جذبۂ جہاد، شوقِ شہادت۔ لیکن آپ واپس آئے تو آپ نے خود کو چھوٹا کر لیا۔ معذوری کا احساس چڑچڑا پن، بد دماغی، یہ سب کیا ہے۔ آپ اللہ کی راہ میں کچھ دے کر آئے ہیں...... اور وہ بھی اپنی خوشی سے، تو احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔''

''میں کسی احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہوں۔'' عبداللہ جھنجلا گیا۔

''آپ ہیں۔ ایسا شخص ہی دوسروں کو ایذا' سزا دے سکتا ہے۔''

''میں کسے سزا دے رہا ہوں؟''

''اپنے ماں باپ کو' میری امی کو' مجھے۔''

''یہ غلط ہے۔''

''تو پھر شادی کیوں نہیں کرتے آپ؟''

عبداللہ نے پہلی بار نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''وجہ تم جانتی ہو۔ وجہ تم ہو۔''

''تو میں موجود ہوں نا۔ مر تو نہیں گئی ہوں۔''

''خالہ نے بہت زیادتی کی ہے میرے ساتھ۔'' عبداللہ نے کہا اور پھٹ پڑا۔ سب کچھ کہہ ڈالا۔ مجذوب کی بات سے لے کر نجمہ خالہ کی دعاؤں تک۔ ان کے تمغوں والے طعنے تک۔ ''اب بتاؤ' میں کیا کروں؟''

''آپ نے اپنے ذہن کو بہت چھوٹا کر لیا ہے۔'' غزالہ کے لہجے میں ملامت تھی۔

''امی نے جو کچھ کیا' فطری تھا۔ خلافِ فطرت نہیں' میری جگہ آپ کی کوئی بہن ہوتی اور امی کی جگہ تائی تو تائی بھی یہی کرتیں۔ چاہیں تو جا کر پوچھ لیں ان سے۔''

عبداللہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے موقع نہیں ملا۔ نجمہ جو کمرے میں بیٹھی یہ سب کچھ سن رہی تھی' باہر آ گئی۔ ''نہیں بیٹی۔ عبداللہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ جہاں میری غلطی ہے' میں تسلیم کروں گی۔ وہ عبداللہ کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ''بیٹے...... تمہاری یہ بات ٹھیک ہے۔ مجذوب نے بھی درست کہا تھا۔ میں واقعی ناقدری ہوں' بہت بڑی ناقدری۔ لیکن اب مجھے احساس ہو گیا ہے اور میں اب اس کا ازالہ کرنا چاہتی ہوں۔ باقی بیٹے' تمہاری بدگمانی ہے۔ میں تم سے بغیر غرض کے بھی ویسی ہی محبت کرتی ہوں۔ جیسی کوئی ماں اپنے بیٹے سے کر سکتی ہے۔ میں نے منگنی توڑی' صرف اس لیے کہ تمہیں خطرے میں کودنے سے روکنا چاہتی تھی۔ اور اس دن تم آئے اور میں نے تم سے جلی کٹی بات کی...... تمغے کے حوالے سے...... تو اس کی تہ میں میری جھنجلاہٹ اور بے بسی



تھی...... اور اس کا سبب میری محبت تھی۔ میں طنز نہیں کر رہی تھی۔ وہ اضطراری گفتگو تھی۔ میں نے تمہیں کمتر نہیں جانا۔ بلکہ عظیم تر تسلیم کیا۔ ورنہ میں خود شادی کی بات کیوں چھیڑتی۔ منگنی تو میں توڑ چکی تھی۔ دوبارہ بات شروع کیوں کرتی۔ اور اب میں کہہ رہی ہوں کہ چاہے غزالہ اسی چھوکھٹ پر بیٹھے بیٹھے شادی کی عمر سے نکل جائے' تمہارے سوا کسی سے اس کی شادی نہیں ہوگی۔ یہ بات میں یہ جانتے ہوئے بھی کہہ رہی ہوں کہ تم اب اس سے کبھی شادی نہیں کرو گے۔ مگر میرا فیصلہ اٹل ہے۔ اور شاید یہی اس کا فیصلہ بھی ہو۔ چاہو تو میں قسم کھا کر یہ سب کہہ دوں۔ قرآن ہاتھ میں لے کر کہہ دوں۔''

عبداللہ کے دل کی کدورت دھل گئی۔ دل آئینے کی طرح صاف ہو گیا۔ وہ مسکرایا۔ ''خالہ...... شادی تو میں بھی غزالہ کے سوا کسی سے نہیں کر سکتا۔'' اس نے کہا۔ غزالہ یہ سنتے ہی کمرے میں چلی گئی۔

''اور شادی میں کروں گا بھی ضرور۔ لیکن یہ بتائیں' آپ مجھے اس کے صلے میں کیا دیں گی؟''

نجمہ کھل اٹھی۔ ''میرے پاس ہے ہی کیا۔ لیکن جو کچھ بھی ہے' سب تمہارا ہے۔ مگر میں تمہیں ایک خاص تحفہ دوں گی۔''

''وہ کیا؟'' عبداللہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

''میں اللہ سے دعا کروں گی کہ وہ تمہاری زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری فرمائے۔''

''جانتی ہیں کہ میری سب سے بڑی آرزو کیا ہے؟''

''جانتی ہوں' شہادت ہے۔''

''پھر بھی!''

''ہاں۔ پھر بھی۔ میں عمر بھر ہر نماز کے بعد یہ دعا کروں گی...... بہت خلوص سے۔''

"بس خالہ، مجھے منظور ہے۔"

❁ ........ ❁ ........ ❁

زندگی متوازن ہوگئی تھی۔ خوشیوں سے سج گئی تھی۔ ماں کا وجود خوش بختی کی دلیل ہے۔ وہ کیسے خوش نصیب ہوں گے، جنہیں دو مائیں ملی ہوں۔ اور وہ غزالہ اور عبداللہ تھے۔

باہمی رضامندی سے گھر کا ایک سسٹم بن گیا تھا۔ دن بھر غزالہ زلیخا کے پاس رہتی۔ بلکہ نجمہ کا بھی زیادہ وقت وہیں گزرتا۔ رات کو عبداللہ اور غزالہ نجمہ کے گھر میں سوتے وجہ یہ تھی کہ نجمہ کا اصرار تھا کہ وہ شب بسری اپنے ہی گھر میں کرے گی۔ اور وہ وہاں تنہا ہو، یہ نوشاد اور زلیخا کو گوارا نہیں تھا۔

شادی کو ایک سال ہوگیا۔ اب تو گھر میں ایک فرد کا اضافہ ہونے والا تھا۔ نجمہ اپنے اصول سے دستبردار ہوگئی۔ دونوں مائیں ہونے والی ماں کی دیکھ بھال میں مصروف ہوگئیں۔ یہ کرو، یہ نہ کرو، آہستہ چلو۔ کی صدائیں عام ہوگئیں۔

دکان پوری طرح عبداللہ نے سنبھال لی تھی۔ نوشاد بس گھنٹے دو گھنٹے کے لیے دکان پر آتا تھا۔

اس روز دوپہر کو عبداللہ نے دکان کے سامنے سے ایک لڑکی کو گزرتے دیکھا۔ وہ کالج یونیفارم میں تھی۔ تیز تیز چلتی ہوئی اس گھبرائی ہوئی لڑکی کے ساتھ ساتھ آہستہ چلتی ہوئی ایک موٹر سائیکل بھی تھی۔ موٹر سائیکل پر سوار جوان آدمی کبھی لڑکی کا دوپٹہ کھینچتا اور کبھی اس کے رخسار کو چھوتا۔

عبداللہ اٹھ کر دکان سے باہر آیا۔ مگر اس وقت تک وہ دونوں نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

رات آٹھ بجے نوشاد آیا۔ اس نے کہا۔ "ہم غزالہ کو لے کر اسپتال جا رہے ہیں۔"



عبداللہ پریشان ہوگیا۔ "خیریت تو ہے ابا؟"

نوشاد ہنسنے لگا۔ "تم تو بچے ہی رہے بیٹے۔ انشاء اللہ خوش خبری کے ساتھ واپس آئیں گے۔"

عبداللہ کا چہرہ تمتما گیا۔ "اچھا ابا، انشاء اللہ بہتر ہی ہوگا۔"

"ہمیں واپسی میں شاید دیر ہوجائے۔ تم کھانا کھا لینا۔"

وہ لوگ اسپتال چلے گئے۔ عبداللہ نے معمول کے مطابق نو بجے دکان بند کی اور گھر چلا گیا۔ اس نے کھانا کھایا۔ گیارہ بجے کے قریب اماں اور ابا واپس آگئے۔

"انہوں نے غزالہ کو ایڈمٹ کرلیا ہے۔" زلیخا نے کہا۔ "نجمہ اس کے ساتھ ہے۔ صبح میں ان کے لیے ناشتہ لے کر جاؤں گی اور نجمہ کو واپس بھیج دوں گی۔"

اس رات عبداللہ کو ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ وہ بس اللہ سے دعا کرتا رہا۔

صبح وہ ناشتہ کر کے نکلا اور دکان کھولی۔ گھر پر زلیخا اور نوشاد اسپتال جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ وہ دکان کی صفائی کر رہا تھا کہ نسوانی چیخوں نے اسے چونکا دیا۔

"بچاؤ...... بچاؤ۔ ارے کوئی ہے......"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دکان کے سامنے ایک کار کھڑی تھی۔ چار لڑکے جو مسلح تھے، کالج یونیفارم پہنے اس لڑکی کو کار میں دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لڑکی اپنی طاقت سے بڑھ کر مزاحمت کر رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ مدد کے لیے پکار بھی رہی تھی۔

لیکن اس کی سننے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ کوئی اکا دکا آدمی ہوگا بھی تو لڑکوں کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر دبک گیا ہوگا۔

"خاموشی سے کار میں بیٹھ جاؤ۔" ایک لڑکے نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

عبداللہ پھیلی ہوئی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی منظر تبدیل ہوگیا۔ وہ لڑکی تو اپیا تھی...... اس کی بہن، جس کے حوالے سے اسے بہادری ملی تھی۔ تو کیا اب وہ اپیا کے ساتھ یہ ہونے دے گا۔

اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ کاؤنٹر کی طرف لپکا۔ دراز کھول کر اس نے اپنا ریوالور نکالا اور لڑکوں کو للکارا۔ ''اے...... چھوڑ دو اس لڑکی کو۔''

ایک لڑکے نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ ''کیوں تیری بہن لگتی ہے کیا؟''

''لگتی نہیں۔ یہ میری بہن ہے۔''

''چپکا بیٹھا رہ ننھے۔ ورنہ دوسرے ہاتھ سے بھی محروم ہو جائے گا۔'' لڑکے نے کہا۔ باقی تینوں لڑکے لڑکی سے الجھے ہوئے تھے' جو بری طرح ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔

عبداللہ نے ریوالور والا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ''اسے چھوڑ دو۔ ورنہ......'' اس نے ریوالور لہرایا۔

''جاوید...... اصغر...... ننھا ریوالور دکھا رہا ہے۔'' اس لڑکے نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ پھر اس کا ریوالور والا ہاتھ حرکت میں آیا۔ اس نے فائر کیا۔ عبداللہ تیزی سے جھکا۔ گولی سے بچتے ہی اس نے فائر کیا۔ گولی لڑکے کے سینے میں لگی۔

لڑکے کی آواز سنتے ہی دوسرے دو لڑکوں نے لڑکی کو چھوڑ دیا تھا۔ ایک اب بھی لڑکی کو جکڑے ہوئے تھا۔ انہوں نے اپنے ساتھی کو گرتے دیکھا تو بوکھلا کر فائرنگ شروع کر دی۔ عبداللہ اب باہر آ رہا تھا۔ اس نے مزید دو فائر کیے اور دونوں لڑکے ڈھیر ہو گئے۔

لیکن جھپٹتے ہوئے عبداللہ کو ٹھوکر لگی اور اس کے ہاتھ سے ریوالور نکل گیا۔ وہ دکان سے باہر آ چکا تھا۔ تین لڑکے ناکارہ ہو چکے تھے۔ چوتھا ایک ہاتھ سے لڑکی کو جکڑے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ میں ریوالور لیے تھا' جس کا رخ اب عبداللہ کی طرف تھا۔

عبداللہ نے جان لیا کہ اب وہ بچ نہیں سکے گا۔ معذوری اس کی راہ کی رکاوٹ بن گئی تھی۔ وہ ہاتھ پاؤں کا ٹھیک ہوتا تو جھپٹ سکتا تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اپیا کو اس درندے کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔

لڑکے نے اسے للکارا۔ ''او ننھے...... وہیں رک جا۔''



مگر عبداللہ لنگڑاہٹ کے باوجود جھپٹ رہا تھا۔ اس کی رفتار حیرت انگیز تھی۔ لڑکے نے گولی چلائی۔ گولی عبداللہ کے پیٹ میں لگی۔ مگر وہ لڑکے تک پہنچ گیا۔ اس نے لڑکے کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ مگر اس کا ہاتھ لڑکے کی بغل تک پہنچا۔ وہ ہاتھ' جس سے وہ لڑکی کو دبوچے ہوئے تھا۔

عبداللہ کی گرفت ایسی خوفناک تھی کہ لڑکا خوف زدہ ہو گیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا بازو اور کندھا کسی آہنی شکنجے میں کس دیا گیا ہے۔ اس نے گھبرا کر لڑکی کو چھوڑ دیا۔

''ننھے...... چھوڑ دے...... ورنہ میں تجھے ختم کر دوں گا۔''

''یہ ہاتھ تو اب میں چھوڑوں گا نہیں۔'' عبداللہ نے کہا۔ پھر لڑکی سے بولا۔ ''تم بھاگ جاؤ میری بہن۔''

میں تمہیں اس حال میں کیسے چھوڑ سکتی ہوں عبداللہ بھائی۔''

''بھاگ جاؤ'' عبداللہ چلایا۔

لڑکے نے سیدھے ہاتھ سے ریوالور کو عبداللہ کی گردن سے لگایا اور فائر کر دیا۔

لڑکی گلی کی طرف بھاگی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ عبداللہ کی گردن سے خون کا فوارہ بلند ہو رہا تھا۔ لڑکی کا رخ عبداللہ کے گھر کی طرف تھا۔

لڑکے کو امید تھی کہ اب عبداللہ کی گرفت ختم ہو جائے گی۔ لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ گرفت اور سخت ہو گئی ہے۔ اسکی گردن تک اینٹھ رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر ٹریگر دبایا اور دباتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ریوالور خالی ہو گیا۔

عبداللہ کو کوئی تکلیف نہیں تھی۔ لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے اندر روشنی' زندگی کم ہوتی جا رہی ہے۔ اتنی مہلت تھی کہ وہ اپنے رب سے شکایت کر سکتا تھا۔ اے اللہ...... میں آپ کے راستے میں لڑا...... شہادت کی تمنا لے کر۔ لیکن مجھے شہادت نہیں ملی...... اور اب یہاں...... اس طرح...... میں نے ایسی موت کی آرزو تو نہیں کی تھی...... اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں۔

اسی لمحے وہ خواب والا جوان اس کے سامنے آ گیا' جس نے اپنے باغ میں اس کی ضیافت کی تھی' ''آپ؟''

''ہاں۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ اور سنو' جب تم کسی برائی کو طاقت سے روکتے ہو' کسی ظالم کے مقابلے میں کسی مظلوم کی اپنے جان و مال سے مدد کرتے ہو تو تم اللہ کی راہ میں ہو۔ اور اللہ کی راہ میں مرنا شہادت ہے۔ تمہیں مبارک ہو۔''

''اے اللہ..... آپ کا شکر ہے۔'' عبداللہ بڑبڑایا۔ پھر اس نے کلمۂ شہادت پڑھا۔ مرنے سے پہلے اس کے دل میں آخری خیال یہ تھا کہ اسے اس ظالم کا ہاتھ نہیں چھوڑنا ہے۔

❁ ........ ❁ ........ ❁

نوشاد اور زلیخا اس لڑکی کے ساتھ وہاں پہنچے تو وہاں کچھ لوگ جمع ہو چکے تھے۔ انہوں نے عبداللہ کو دیکھا۔ اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن ظالم کا بازو اب بھی اس کی گرفت میں تھا۔

پھر لوگوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ ادھر پولیس آ گئی۔ آنے والے پولس افسر نے اپنے ساتھی سے چپکے سے کہا۔ ''ارے غضب ہو گیا۔ یہ تو اپنے ایس پی صاحب کا بیٹا ہے۔''

انہوں نے بہت کوشش کی۔ لیکن وہ اللہ کے مجرم کو گرفت سے آزاد نہ کرا سکے۔

ادھر لوگ بری طرح مشتعل تھے۔ ایس پی کے بیٹے کو بچانا مشکل ہو رہا تھا۔ ذرا دیر میں ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ مرنے والا اس بستی کا ہیرو ہے۔ انہیں تھانے سے رابطہ کر کے اور نفری طلب کرنی پڑی۔

مسئلہ یہ تھا کہ انہیں کیسے لے کر جایا جائے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ پولیس والے کوششیں کر کے ہار گئے۔ لیکن وہ مجرم کو شہید کی گرفت سے آزاد نہ کرا سکے۔ ''اب تو ایک ہی صورت ہے۔ ہاتھ کاٹنا پڑے گا۔''

''کس کا ہاتھ کاٹو گے؟'' زلیخا نے تڑپ کر کہا۔



''مرنے والے کا اماں' اور کس کا۔'' پولیس افسر نے کہا۔ ''وہ تو ہر چیز سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ زندہ آدمی کا تو ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔''

اسی پر لڑکی بھپر کر سامنے آئی۔ ''ہاتھ چور کا کاٹا جاتا ہے۔ اور چور زندہ ہے۔ اس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں تمہیں اپنی عزت بچانے والے کا ہاتھ نہیں کاٹنے دوں گی۔''

''تمہارے پاس اس الزام کا کوئی ثبوت' کوئی گواہ ہے'' پولیس والے نے اکڑ کر کہا۔

لڑکی نے ادھر ادھر دیکھا تو وہاں کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ ''ہاں..... میں گواہ ہوں۔ میں نے دیکھا تھا۔''

ایک بزرگ شخص آگے آیا۔ ''یہ اسلامی ملک ہے۔ چور کا ہاتھ کٹے گا۔ شہید کی بے حرمتی برداشت نہیں کی جائے گی۔''

اگلے ہی لمحے نعرے لگنے لگے۔

پولس والے گھبرا گئے۔ ایس پی کے بیٹے کی خاطر وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ لیکن پوری بستی پر فائرنگ نہیں کر سکتے تھے۔ ''یہ فیصلہ کرنا ڈاکٹروں کا کام ہے۔ ہمیں تو ان کو اسپتال لے کر جانا ہے۔''

اس وقت تک مجرم بے ہوش چکا تھا۔ لوگوں کی مار نے اسے پہلے ہی نیم جاں کر دیا تھا۔

بڑی مشکل سے ان دونوں کو ایمبولنس میں ڈالا گیا۔ زلیخا ضد کر کے بیٹے کے ساتھ بیٹھی۔

ادھر سب لوگوں نے بھی اسپتال کا رخ کیا۔ سب سمجھ رہے تھے کہ یہ لوگ عبداللہ کا ہاتھ کاٹیں گے۔ اور سب کا یہی فیصلہ تھا کہ جان دے دیں گے۔ مگر شہید کا ہاتھ کاٹنے کی توہین نہیں ہونے دیں گے۔

اسپتال بھی فون پہنچ چکا تھا۔ایس پی لوگوں کے اشتعال کے پیشِ نظر خود وہاں نہیں گیا۔لیکن پولیس کی بھاری جمعیت اسپتال کا محاصرہ کر چکی تھی۔

ادھر ڈاکٹر نے بھی وہی موقف اختیار کیا کہ دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں، جس کے تحت مردہ آدمی کو نظر انداز کر کے زندہ آدمی کا ہاتھ کاٹا جائے۔''اور یوں بھی مرنے والے کا پوسٹ مارٹم تو ہونا ہی ہے۔'' اس نے اضافہ کیا۔

اس پر مشتعل لوگ نعرے لگانے لگے۔یہ یقینی نظر آرہا تھا کہ اسپتال میں خوں ریزی ہوگی۔اور اب بات اوپر بھی پہنچ گئی تھی۔

''میں اپنے بیٹے کا ہاتھ نہیں کاٹنے دوں گی۔'' زلیخا نے چیخ کر کہا۔

''ان سب لوگوں کو یہاں سے باہر نکال دو۔یہ میرے فرض کی راہ میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔'' ڈاکٹر نے پولیس افسر سے کہا۔

یہی مقام تھا، جہاں سے تشدد کا آغاز ہونا تھا۔مگر اُسی لمحے ایک گرج دار آواز سنائی دی۔''ٹھہرو۔رک جاؤ۔''

برف جیسے سفید بالوں اور سفید داڑھی والا ایک مجذوب لوگوں کو ہٹاتا آگے بڑھ رہا تھا۔زلیخا کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا۔''مجھے پہچانتی ہے بیٹی؟'' اس نے زلیخا سے پوچھا۔

زلیخا نے نظر بھر کر اسے دیکھا اور سر جھکا لیا۔''تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں بابا۔''

''پچھلی بار تو نے میری بات نہیں مانی تھی۔کیا آج بھی نہیں مانے گی؟''

''حکم کرو بابا۔''

''تو یہاں سے چلی جا۔اسپتال جا اپنی بہو کے پاس۔''

''بابا، یہ میرے شہید بیٹے کا ہاتھ کاٹ رہے ہیں۔''

''انہیں ان کی مرضی کرنے دے۔یہ دنیا کے قانون والے ہیں۔مگر اوپر والا اپنا قانون نافذ کر دے تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔تو بے فکر ہو کر جا۔''



''ٹھیک ہے بابا۔میں جا رہی ہوں۔''

زلیخا جا رہی تھی کہ مجذوب نے اسے پیچھے سے آواز دی۔''ذرا سن'' زلیخا نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بولا۔''مبارک ہو بیٹی۔''

''خیر مبارک بابا۔'' زلیخا کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔لیکن اس کی آنکھیں خشک تھیں۔

کچھ لوگ زلیخا کے ساتھ نکل گئے۔لیکن بہت لوگ ابھی باقی تھے۔مجذوب نے ان سے کہا۔''تم بھی جاؤ۔جن کا کام ہے، ان پر چھوڑ دو۔''

اس کے لہجے میں کوئی بات تھی کہ کسی نے احتجاج تک نہ کیا۔سب سر جھکائے باہر نکل گئے۔

''چل ڈاکٹر، اب اپنا فرض پورا کر۔'' مجذوب نے حقارت بھرے لہجے میں ڈاکٹر سے کہا۔

اگلے پندرہ منٹ میں اسپتال کے پورے عملے کے پسینے چھوٹ گئے۔عبداللہ کے جسم پر کوئی نشتر خراش بھی نہیں ڈال سکا۔بلکہ الٹا نشتر کند ہو گئے۔وہ سب ایک دوسرے کو خوف سے دیکھ رہے تھے، جیسے پوچھ رہے ہوں...... یہ سب کیا ہے۔

''تم لوگ خوش نصیب ہو۔تم نے دیکھ لیا کہ شہادت کیا ہوتی ہے اور شہید کسے کہتے ہیں۔مجذوب نے ڈاکٹر سے کہا۔''اب بہتر ہے کہ درست فیصلہ کر لو ورنہ تمہارا چہیتا زندگی کھو بیٹھے گا۔''

یہ سن کر ڈاکٹر نے چونک کر ایس پی کے مجرم بیٹے کو دیکھا اور وہ دہل گیا۔اس کا پورا ہاتھ نیلا ہو رہا تھا اور گردن پر بھی نیلاہٹ تھی۔اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔اسی وقت سرجن بھی آگیا، جسے خاص طور پر طلب کیا گیا تھا۔

سرجن نے ایک نظر دیکھتے ہی فیصلہ سنا دیا۔''کیس بہت خراب ہو چکا ہے۔فوری طور پر کندھے پر سے ہاتھ نہ کاٹا گیا تو یہ بچ نہیں سکے گا۔شاید اس کی گردن اب ساری

زندگی سیدھی نہ ہو سکے۔"

سو شہید کے جسم پر نشتر آزمانے والوں نے زندگی مجرم کا ہاتھ کاٹ دیا۔ پھر وہ اسے انتہائی نگہداشت کے شعبے میں لے گئے۔

پھر دیکھنے والی آنکھوں نے وہ معجزہ بھی دیکھا۔ مجرم کا کٹا ہوا ہاتھ بازو سے اب بھی شہید کے اکلوتے ہاتھ کی گرفت میں تھا۔ اچانک دیکھتے ہی دیکھتے شہید کا جسم جو لگتا تھا کہ پتھر کا ہو چکا ہے' جیسے زندہ ہونے لگا...... گوشت پوست کا۔ اس کی انگلیاں دھیرے دھیرے کھلیں اور دوسروں کی عزت پامال کرنے والا ناپاک ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد ہو کر فرش پر گر پڑا۔

مجذوب نے کئی بار اللہ اکبر کے نعرے لگائے۔ پھر بولا "یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے یہاں اللہ کا قانون چلتا ہے۔ اپنے قانون کو بھول جاؤ۔ ورنہ اللہ کے قہر کی زد میں آ جاؤ گے۔ اور سنو' شہید کے جسم پر نشتر نہ چلانا۔ ورنہ زندگی میں ہی تمہارا پوسٹ مارٹم ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور وارڈ سے نکل گیا۔

❁............❁............❁

نجمہ اور غزالہ اسپتال میں پریشان تھیں۔ پھر زلیخا اور نوشاد آئے۔ نجمہ ان کی طرف لپکی۔ "پوتا مبارک ہو بھائی جان۔"

لیکن ان کا چہرہ دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ "خیر تو ہے آپا؟"

زلیخا سیدھی غزالہ کی طرف بڑھی' جو اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی زلیخا نے اسے لپٹا لیا۔ "کچھ نہ کہنا اماں' میں جان گئی ہوں۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ "اماں ...... میں نے ہمیشہ ایک ہی دعا مانگی تھی ...... اے میرے اللہ' مجھے شہید کے بیٹے کی ماں بنانا۔ اور میں جانتی تھی کہ میری دعا قبول ہو گئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے اماں۔"

زلیخا پیچھے ہٹی اور اس نے بہت غور سے غزالہ کو دیکھا۔ میں تم جیسی بہو کے قابل نہیں تھی میری بچی۔"



"ایسے نہ کہیں اماں۔ آپ عبداللہ کی ماں ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔" زلیخا نے کہا۔ پھر پوچھا۔ "یہ کب ہوا اماں؟"

زلیخا نے خاموشی سے عبداللہ کی رسٹ واچ اسے تھما دی۔ وہ اس نے ایمبولینس میں عبداللہ کے ہاتھ سے اتاری تھی۔ "یہ گھڑی اس کے دل کے ساتھ ہی بند ہو گئی تھی۔"

غزالہ نے گھڑی کو دیکھا۔ وہ بند تھی۔ سوئیوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر ابھرا۔ اس نے کچھ فاصلے پر کھڑی نرس کو آواز دے کر بلایا۔ "انہیں بتاؤ کہ ان کا پوتا کس وقت پیدا ہوا تھا۔"

"بچے کی ولادت ٹھیک سات بج کر بتیس منٹ پر ہوئی تھی۔"

"اب گھڑی دیکھیں۔"

زلیخا نے بند گھڑی میں وقت دیکھا۔ سات بج کر بتیس منٹ ہوئے تھے۔ "ایک ہی وقت ......"

غزالہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی اماں"

اچانک نوشاد کو کچھ خیال آیا۔ اس نے نرس سے کہا۔ "بچے کو لاؤ میں اس کے کان میں اذان تو دے دوں۔ اتنی دیر ہو گئی۔"

"اذان تو اس کے کان میں دے دی گئی ہے۔" نرس نے کہا۔

اس پر نجمہ اور غزالہ بھی حیران ہوئیں۔ "یہ کب کی بات ہے؟" نجمہ نے پوچھا۔

"جی فوراً ہی ......"

"تمہیں دھوکہ ہوا ہوگا۔ ہمارا تو کوئی آیا ہی نہیں۔" نجمہ بولی۔

"میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں نے بچے کو نہلا لپیٹ کر کوٹ میں لٹایا ہی تھا۔ پلٹ کر دیکھا تو بچہ اس شخص کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا...... آپ کون ہیں اور یہاں کیسے آ گئے۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کی شخصیت ایسی رعب والی تھی کہ میں دم بہ خود ہو گئی۔ پھر اس نے بچے کے کان

سے منہ لگایا اور اذان دی...... دونوں کانوں میں اذان دی۔''

ان چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سب کی نظروں میں ایک ہی سوال تھا۔

زلیخا نے نرس سے کہا۔ ''اس شخص کا حلیہ بتا سکتی ہو؟''

''وہ جوان تھے۔ خوب صورت داڑھی تھی چہرے پر۔ اور ان کا ایک ہاتھ نہیں تھا۔ بلکہ مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے ایک ہاتھ سے بچے کو کوٹ میں سے کیسے اٹھایا ہوگا۔ پھر وہ چلے تو میں نے دیکھا' وہ لنگڑا کر چل رہے تھے۔'' نرس کے لہجے میں احترام تھا۔

اس بار ان میں سے کوئی بھی اپنے آنسو نہ روک سکا۔

طبیعت ذرا سنبھلی تو نوشاد نے نرس سے کہا۔ ''اس نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ مگر مجھے اب اپنا فرض پورا کرنا ہے۔ بچے کو لاؤ۔ میں اس کے کان میں اذان دوں گا۔''

※ ※ ※

اس روز زلیخا نے غزالہ سے کہا۔ ''بیٹے...... آج کوفتے پکاؤ۔ میرے عبداللہ کو بہت پسند تھے۔ آج وہ مجھے بہت یاد آ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے اماں۔ آج مسجد میں کھانا بھجوا دوں گی۔'' غزالہ نے کہا اور کوفتوں کی تیاری میں لگ گئی۔

اسی شام سات سالہ عبدالرحمٰن صحن میں چارپائی پر بیٹھا ہوا ہوم ورک کر رہا تھا۔ اچانک باہر سے ایک گرج دار آواز سنائی دی۔ بڑا دبدبہ تھا اس آواز میں۔ ''کھانا کھلا دے مجھے۔ کھانا کھائے بغیر نہیں جاؤں گا میں۔''

دادی تڑپ کر اپنے کمرے سے نکلیں اور دروازے کی طرف لپکیں۔ آواز پھر ابھری۔ ''ارے کھانا کھلا دے۔ کھانا کھائے بغیر نہیں جاؤں گا میں۔''

دادی نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ ''آؤ بابا جی آؤ۔'' انہوں نے کہا۔

وہ بہت بوڑھا شخص' سفید بال' سفید داڑھی اور سرخ آنکھیں...... وہ آ کر چارپائی کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔



دادی نے تڑپ کر کہا۔ ''کیوں ہمیں گناہ گار کرتے ہو۔ اوپر بیٹھو نا۔''

''میں یہیں ٹھیک ہوں۔ اب یہیں تو جانا ہے۔'' بوڑھے مجذوب نے کہا۔

عبدالرحمٰن احتراماً اٹھ کھڑا ہوگیا۔ مجذوب نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔ ''اوپر ہی بچے۔ سب کی اپنی اپنی جگہ' اپنا اپنا مقام ہے۔''

عبدالرحمٰن بیٹھ گیا۔ اسے اس بوڑھے پر پیار آ رہا تھا...... جیسا دادا پر آتا تھا۔ لیکن کی طرح اس سے لپٹنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

دادی نے کہا۔ ''بابا...... جو کھانے کو دل چاہے' بتا دو۔ ابھی آدھے گھنٹے میں ل گی۔''

''ہاں...... آج تو منہ مانگا لوں گا۔'' مجذوب نے کہا۔ ''کوفتے کھلا دے۔''

نجانے کیوں دادی رونے لگیں۔ اسی وقت امی کھانے کی ٹرے لے کر باہر یں۔ ''لو بابا...... کوفتے ہی پکائے ہیں آج۔''

''اللہ سننے اور دیکھنے والا ہے بیٹی۔''

مجذوب نے پہلا نوالہ عبدالرحمٰن کی طرف بڑھایا۔ ''لے بچے...... یہ کھا لے۔''

عبدالرحمٰن نے نوالہ منہ میں لے لیا اور دھیرے دھیرے چبانے لگا۔

مجذوب نے بھی ایک لقمہ لیا۔ پھر دو گلاس پانی پی گیا۔ ''قسمت کا دھنی ہے تیرا بچہ ''

''اللہ کی دین ہے بابا جی'' امی بولیں۔

''مقدر والا ہے۔ بڑا مرتبہ ملا ہے اسے اور ملے گا۔ شہید کا بیٹا ہے اور شہید کا باپ ا۔'' مجذوب نے کہا۔

''اللہ کا شکر ہے بابا۔ جو اللہ کو منظور۔''

''اب میں چلتا ہوں بیٹی۔'' مجذوب اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھی طرح کھانا تو کھا لو بابا۔''

''نہیں بیٹی۔بس ایک لقمہ ہی چاہیے تھا۔''

''پھر آؤ گے بابا۔''

''نہیں۔اب تو بس لمبے سفر پر جانا ہے۔اللہ تم سب کو اپنی رحمت کے سائے میں رکھے۔السلام علیکم۔''

اُس رات عبدالرحمٰن سونے کے لیے اپنی جگہ دادی اور امی کے بیچ میں لیٹا تو اس نے دادی سے لپٹ کر کہا۔''یہ شہید کیا ہوتا ہے دادی۔''

دادی نے پیار سے اس کی پیشانی چوم لی۔''بیٹے......آج میں تجھے ایک شہید کی کہانی سناتی ہوں......''